ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ

سید عبد الباری ایم۔ اے (عثمانیہ)

نفیس اکیڈمی

قیمت تین روپیہ بارہ آنہ کلدار   حیدر آباد دکن   چار روپیہ چار آنہ سکۂ عثمانیہ

طبع اوّل ——— ایک ہزار

اگست ۱۹۴۶ء

۱ ۰ | ۸ ۱

ح | ۱۸۳

مطبوعہ

زراعتی مشین پریس حیدرآباد دکن
و
انتظامی مشین پریس حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

اہم ترین سیاسی مسئلہ

اقلیت و اکثریت کا تصور تمام تر یورپ کے موجودہ دور کی نامکمل اور لعنتی جمہوریت کا پیدا کردہ ہے۔ اور وہی اس کے معانی اور احوال و شئون کے ترجمان ہیں۔ مرحوم اقبالؒ نے اس حقیقت کو کہ اس طرح واضح کیا ہے:۔

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بہرحال! یورپ نے شخصی حکومتوں کے مفاسد سے تنگ آکر جو راہ فرار نکالی وہ جمہوریت کی ناقص، نامکمل اور نامحمود شکل ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ملک کے مختلف طبقات، اور مختلف طبقات کی پھر ذیلی تقسیمیں، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں، مشرق شکست خوردہ اور نقال تھا ہی، اس نے بھی ان استادوں کی نقل کی۔ اور پوری پوری نقل کی، پھر ہندوستان، انگریزوں کا کفش بردار اور مقبوضہ غلام، یہاں اس طریقۂ جمہوریت کے سوا اور کیا مقبول ہو سکتا تھا۔

لیجئے ایک قضیہ پیدا ہو گیا جھگڑا، فساد امعاشی و تعلیمی عدم توازن کا شکوہ اور نہ جانے کیا کیا سوالات پیدا ہوئے، اور آبادی کے مختلف طبقات آپس میں ٹکرانے لگے۔ بدقسمتی سے ہندو معاشرہ کی بنیاد ہی اپنے سوا ساری دنیا کو ناپاک ملیچھ اور رجاہل نفرت باور کرنے پر قائم ہے۔ پوتر، اور پوجیہ پاد پنڈتوں نے جو

انگریزوں کے مسئلہ جمہوریت میں شاگرد ہیں آزاد ہندوستان کی ایک تصویر بنائی، ظاہر ہے کہ اس میں نفرت کی روشنائی، چھوت چھات کا کاغذ اور نسلی برتری و معاشی دستبرد کے موقلم استعمال ہوئے تھے، اس تصویر میں بد نصیب اچھوتوں اور مظلوم و فلاکت زدہ مسلمانوں کی گنجائش کہاں پیدا ہو سکتی تھی ــــــ اس طرح علمائے سیاست کے لئے ایک جدید موضوع درس و تدریس پیدا ہوا "ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ" ۔ اب اس مسئلہ پر داد تحقیق دی جانے لگی، اور فکر و دماغ کا توانائیاں صرف ہونے لگیں، ۔ ایسی ہی ایک عالمانہ تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے یہ کتاب،

مولوی عبدالباری صاحب ایم ۔اے عثمانیہ نے شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ میں اسے بطور مقالہ (امتحان ایم ۔اے) پیش کیا، اور ماہرین فن نے اس مقالہ کو فاضل مقالہ نگار کے لئے معیار علم و تحقیق قرار دے کر انھیں اس پر ایم ۔اے کی ڈگری دی ہے اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتاب اس طرح کی کوئی سطحی کتاب نہیں جیسی کہ اس موضوع پر آپ کو انگریزی اور اردو میں بہت سے مختلف ناموں کے ساتھ فروخت ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

ہندوستان میں سیاسی اقلیتیں کہلانے والی بہت سی قومیں آباد ہیں سکھ عیسائی، پارسی، یہودی، بدھ، اچھوت اور غلطی سے مسلمان بھی۔ یہ کتاب ان میں سے صرف مسلمانوں کے مسئلہ پر بحث کرتی ہے اور وہ بھی بڑی حد تک "متحدہ قومیت" اور "ہندو اکثریت" کے نقطۂ نظر سے۔ لیکن پوری وضاحت اور سیر حاصل وسعت کے ساتھ۔

اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس اہم ترین مسئلہ پر وسیع ترین اور بہترین کتاب ثابت، اور مطالعہ کے لئے کافی مواد اس میں مل سکے گا۔

خادم علم (چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری مالک نفیس اکاڈمی
حیدرآباد دکن ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء

بابِ اوّل

مسئلہ اقلیت کا تاریخی پس منظر

بادی النظر میں مسئلہ اقلیت ہندوستان کی اُفق سیاست پر دستوری حیثیت سے ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں نمودار ہوا۔ لیکن درحقیقت اس کی تخم ریزی اُس وقت ہی ہو چکی تھی جبکہ شاطران ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی بساط سیاست کا جائزہ حاصل کیا اور جس کے بعد ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقات کا تعلیمی اور معاشی توازن بگڑنے لگا۔

مغل فرمانرواؤں نے اپنی رواداری کے ذریعہ بڑی حد تک بلا لحاظ مذہب و ملت آبادی کے مختلف عناصر میں رفتار ترقی کا توازن برقرار رکھا تھا۔ کسی ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے خلاف شکایت کا موقع نہ تھا۔ اُن کے مسلک رواداری نے ہندوستان میں ایک

خاص ہندو مسلم تمدن پیدا کیا جس کے گہرے نقوش اِس عہد کی شاعری مصوری۔ طرزِ تعمیر و دیگر فنونِ لطیفہ میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ خود اورنگ زیب جس کے متعلق بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کا وزیر مالیات ایک ہندو (راگھوناتھ) تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ مذہبی جنگوں سے نہیں بلکہ سیاسی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ بہرکیف مغل فرمانرواؤں نے ایک متحدہ اور ہم آہنگ تمدن کا انمول اور ناقابل فراموش سرمایہ زندگی اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ لیکن انگریزوں کی عملداری کے قیام کے بعد اُس کے نقوش آہستہ آہستہ مٹنے لگے اور ہندوستانی سماج کی شیرازہ بندی بکھرنے لگی۔

جب انگریزوں کو ہندوستان میں حکومت ہی کرنا ٹھیرا تو حکمرانی کے وہ اصول بھی مدون کرنے تھے جس سے ملوکیت کی عمارت کو اِستحکام پہونچتا۔ اِستحکام سلطنت کے ضمن میں اس قوم کو جن مرحلوں کا سامنا کرنا پڑا اور جس فراست اور تدبر سے اس قوم نے ان کا مقابلہ کیا اور بالآخر اپنے مقاصد اور نصب العین میں کامیاب ہوگئی وہ قومی تدبر کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ یہ سوال فطرتاً ذہن میں آٹھتا ہے کہ جس قوم کے ہاتھ سلطنت سازی میں مصروف تھے کیا اس کی آنکھیں یہ نہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان میں اس کی بنیادیں ہلا دینے والے عناصر بھی موجود ہیں۔ مسلمان۔ مرہٹے۔ سکھ۔ وغیرہ کبھی بھی موقع ملنے پر اُن کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دے سکتے تھے۔ جب ایوان شہنشاہیت ہی کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا گیا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک تجربہ کار آباد کار قوم

کی نظریں ان عواقب پر نہ پڑتیں جو مستقبل میں منڈلاتے ہوئے خطرے کی طرح اچانک نمودار ہوکر ایک زلزلہ کی مانند اس عظیم الشان سلطنت کو آناً فاناً میں منہدم کردینے والے تھے۔ انگریزی شہنشاہیت کے لئے ہندوستان کی متحدہ قومیت سے زیادہ کوئی اور چیز خطرناک نہیں ہوسکتی تھی ۱۸۵۷ء کی شورش کو بھی انھوں نے دیکھا تھا جو سامراج کے لئے خطرے کی پہلی گھنٹی تھی۔ انگریزوں کو یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کا قیام یہ دو متضاد چیزیں ہیں یا تو ہندو مسلم اتحاد برقرار رہ سکتا تھا یا ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط۔ ظاہر ہے کہ انگریز ہندو مسلم متحدہ قومیت کو جو ان کے وجود کے لئے مہلک اثرات کی حامل تھی، کیسے برداشت کرلیتے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کو اس وقت دوام حاصل ہوتا جبکہ ہندو مسلم متحدہ قومیت کی عمارت ڈھادی جاتی۔ صوفیوں اور بھگتوں کا سرمایہ جد وجہد اور اکبر اعظم کے منصوبے خاک میں ملادیئے جاتے۔ اس طرح میدان صاف کرنے کے بعد ہی جدید عمارت کی تعمیر ممکن ہوسکتی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کرنے کے لئے انگریزوں نے ایک انوکھا نسخہ تجویز کیا۔ وہ یہ کہ آبادی کے ان دو بڑے عناصر میں جو تمدنی اور معاشی توازن برقرار تھا اس کو بگاڑا جائے اور جب یہ توازن بگڑے گا تو ایک فرقہ دوسرے کے خلاف شاکی ہی نہیں بلکہ نبرد آزما بھی ہوگا۔ اب ایک اہم مسئلہ جس سے انگریز دوچار تھے وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کا معاشی تعلیمی اور تمدنی توازن کیسے بگاڑا جاسکتا ہے۔ کس طبقہ کا ساتھ دیا جائے اور کس کا نہیں مسلمانوں کے ہاتھ سے ابھی ابھی عنانِ حکومت چھینی گئی تھی

ان کے دماغوں پر حکمرانی کا بھوت برابر چھایا ہوا تھا۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان کی اولوالعزمی کا منظر بھی دیکھا تھا۔ چنانچہ کچھ ابتدا ہی سے مسلمانوں پر شبہ کیا جانے لگا۔ لارڈ کلائیو نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا ہے" میر جعفر، میر قاسم اور نواب آرکاٹ نے (جو میری دانست میں بہترین مسلمان ہیں) اپنے رویہ سے اس امر کا کافی ثبوت دے دیا ہے کہ وہ انگریزوں کے تفوق سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہیں گے اور ہرگز کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے جو ہماری تباہی و بربادی کا سبب ہو۔"[1] اس کے بعد سے انگریزوں نے مسلمانوں کی جانب سے اپنی آنکھیں پھیر لیں اور اس بے اعتنائی نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی کوئی کسر باقی نہ رہی حتیٰ کہ جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہندوستان کی قومی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا تو مسلمان اس کے موافق نہ تھے اور غدر کے خونی نظارے ان کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ۱۸۸۰ء کے بعد سے جب ہندوستان میں نیابتی ادارات کی ترویج عمل میں آنے لگی تو یہ قوم اپنی معاشی و سیاسی پستی کی بنا پر گھبرانے لگی۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے وہ فرقے اور طبقات جو تعلیم میں پیچھے تھے مثلاً پست اقوام۔ غیر برہمن وغیرہ اپنی جہالت اور سیاسی و معاشی پستی کی بنا پر نیابتی ادارات کے نام سے گھبرائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد

---

[1] مراسلہ بنام نظام اعلیٰ۔ ۳۰ ستمبر ۱۷۶۵ء بحوالہ "سیاسی تاریخ ہند جلد دوم از میلکم ص ۱۹۔"

حکومت برطانیہ کو جداگانہ نیابت اور فرقہ داری نیابت کا کھیل رچانے کا زرین موقع ہاتھ آیا۔ حکومت ہند نے ہندوستان کے مختلف فرقہ جات اور طبقات کا توازن ترقی بگاڑ کر ان کو اتنا بے دست و پا کر دیا کہ وہ جداگانہ نیابت اور تحفظات کا مطالبہ کرنے لگے۔ مسئلہ اقلیت شاید سرزمین ہند میں جنم نہ لیتا اگر یہاں کی آبادی کے مختلف اجزاء کی رفتار ترقی مساوی رہتی نہ کوئی پیچھے رہتا نہ کوئی آگے۔ مگر برطانوی راج نے ملک کے مخصوص طبقات مفادات کی سرپرستی کے ذریعہ دوسرے طبقات اور مفادات کو شکایت کا موقع فراہم کیا اور ایک کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا۔ ان ہی صورت حالات نے برطانوی سامراج کی عمر کو ہندوستان میں بڑھا دیا ابتداء میں اپنے استحکام کی خاطر ہماری قومی زندگی کا معاشی اور تعلیمی توازن کا شیرازہ بکھیرا گیا اور جب ایک طبقہ یا فرقہ نتیجتاً طاقتور ہوگیا تو پھر سے کمزور اور پست طبقات و فرقہ جات کو ان کے خلاف کھڑا کرکے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

بہرکیف سامراج نے اپنی بقا موقع کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی توازن میں تو کبھی عدم توازن میں دیکھی۔ قیام سلطنت کے بعد سے تقریباً انیسویں صدی کے آواخر تک عدم توازن کے مسلک پر عمل کیا گیا اور جب یہ سیاسی ڈرامہ ختم ہوگیا اور ایک طبقہ یا فرقہ طاقتور ہوگیا تو اس کی قوت کو بے اثر کرنے کے لئے کمزور فرقوں اور طبقات کو لاکر کھڑا کیا گیا اور ان کو تقویت پہنچائی جانے لگی۔ چنانچہ بیسویں صدی کی ابتداء سے لے کر آج تک حکومت برطانیہ کی پالیسی یہ رہی ہے کہ کمزور اور پست طبقات اور فرقہ جات کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جائے اور ان کو ترقی یافتہ

فرقوں کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ اس طرح کبھی مسلک توازن اور کبھی عدم توازن کے سیاسی ہتھیار کے ذریعہ ہماری قومی زندگی کو صدمہ پہونچایا گیا دراصل قومی زندگی میں انتشار پیدا کرنا مقصود تھا۔ ابتدا میں یہ مقصد مختلف فرقوں میں عدم توازن پیدا کرنے سے حاصل ہوتا تھا اور اب توازن قایم کرنے کی کوشش سے حاصل ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی پستی اور مسئلہ اقلیت کی ابتداء

اگرچہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم وستم کا ہندو و مسلمان دونوں شکار بنے رہے اور ملک میں عام تباہ حالی اور انتشار پھیل گیا لیکن اس کے تختۂ مشق کئی وجوہات کی بنا پر زیادہ تر مسلمان ہی رہے۔ سیاسی اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد مسلم قوم تباہی میں گھر گئی وہ قوم جس نے برسوں ہندوستان پر حکومت کی تھی رذیلوں کو محتاج ہوگئی۔ اقتدار کے تین اہم ذرائع فوج، سیاسی عہدے اور مالگذاری کی وصولی ہاتھ سے نکل گئی۔ رزق کے دروازے بند ہونے سے قوم کی قوم معاشی بحران کا شکار ہوگئی۔ سب سے دردانگیز چیز یہ تھی کہ ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ ہندوؤں نے دانشمندی سے اس ماحول کا ساتھ دیا لیکن مسلمان اس ماحول کو قبول کرنا تو کجا اس کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہوگئے۔ حالانکہ ابتداء میں راجہ رام موہن رائے اور بعد میں چلکر سرسید احمد خاں نے محسوس کرلیا تھا کہ مصلحتِ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس جدید ماحول کا ساتھ دیا جائے۔ مگر مسلمان اس انقلاب کے نشیب و فراز کو گہری نگاہ سے

نہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف تو مسلمان اس نئے ماحول کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے تو دوسری طرف خود انگریز مسلمانوں سے بے اعتنائی برت رہے تھے۔ چنانچہ ہنٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے " اس میں شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لیکر چھوٹے افسروں تک ہر شخص کو یقین ہوگیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں دیئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ برطانوی راج کے تحت اپنے آپ کو تباہ و تاراج ہوتا دیکھ رہا ہے۔ ..... وہ آج روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں ..... اس کا انحطاط بھی تو ہماری سیاسی لاپروائی اور غفلت کا نتیجہ ہے ..... یہ وہ قوم ہے جسے حکومت برطانیہ کے تحت تباہ کر دیا گیا ہے[۱]۔" بڑی غلطی جو مسلمانوں کی جانب سے سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ انھوں نے زمانے کی رفتار کو نہیں پہچانا اور اگر بالآخر پہچانا بھی تو اس کا ساتھ دینے سے یکسر انکار کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان مفلسی اور ابتری کے بھنور میں کیسے گھر گئے۔ جب تک کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم برقرار رہا ان کو بڑے سے بڑے عہدے ملا کرتے تھے۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا سے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہوگئے مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کو حاصل کرنا کفر سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جماعت انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد حکومتوں کی ملازمتوں پر آہستہ آہستہ

---

[۱] ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحات ۱۲۸ تا ۱۲۹۔

قبضہ کرتی جا رہی تھی۔ اور مسلمان اس میدان سے ہٹتے جا رہے تھے۔ کمپنی کے عہد میں اسلامی نظام اوقاف کی ضبطی عمل میں آئی ۱۸۳۸ء۔ ایک طرف تو سرکاری ملازمتوں میں پہلے ہی سے کم تھے۔ اور دوسری طرف علماء کا طبقہ جو مسلم عوام پر کافی گہرا اثر رکھتا تھا۔ اس کا مخالف ہو گیا تھا۔ انگریزی تعلیم کی اس وجہ سے بھی مخالفت ہونے لگی کہ بالعموم اساتذہ ہندو یا عیسائی ہوا کرتے تھے۔ مسلمان غیر مسلم اساتذہ کے ذریعہ اپنی اولاد کی تعلیم پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان ایسے نظام تعلیم کو پسند نہ کرتے تھے۔ جس میں ان کے مذہبی اصولوں کو نظرانداز کر دیا گیا ہو[۳] چنانچہ ۱۸۶۰-۶۲ء میں انگریزی مدارس میں ایک مسلمان کے مقابلے میں دس ہندو تھے[۴] حکومت مدراس نے اپنی ایک سرکاری قرارداد میں بتایا کہ موجودہ طرز تعلیم ہندو طالبعلموں کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدراس میں مسلمان طلباء کم ہیں[۵] چونکہ مسلمانوں نے انگریزی تعلیم سے انحراف کیا اس لئے ملازمتیں اُن کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ مسلمان جدید تعلیم کا اس لئے بھی ساتھ نہ دے سکے کہ یہ انکی روایات کے خلاف تھی۔ مسلمانوں کو یہ بھی شکایت تھی کہ تعلیمی اغراض کے لئے جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے اس کا فائدہ صرف ہندوؤں کو

---

[۳] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۸۰۔

[۴] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۱۸۷

[۵] رپورٹ سیمین کمیشن جلد سوم۔ توضیحی نوٹ از ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صفحہ (۴۷۴)۔

پہنچتا ہے۔ چنانچہ ہنٹر تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے "واقع یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم جس نے ہندوؤں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کیا اور ان کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ احساسات پیدا کئے مسلمانوں کی روایات کے بالکل منافی اور ان کی احتیاجات کے خلاف تھا۔ بلکہ ان کے مذہب کی تذلیل کرتا تھا۔"[۱۷] بہرکیف جب ان دونوں فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلیمی توازن بگڑا تو معاشی زندگی میں ان کا توازن بگڑنا لازمی تھا۔

ہر وہ انتظامی اور قانونی تبدیلی جو حکومت کی جانب سے عمل میں آئی مسلم فرقہ پر مسلسل ضربیں تھیں[۱۸] اسلامی قوانین فوجداری کو ختم کرنا مسلم فرقہ کے وقار پر پہلی ضرب تھی۔ غدر کے اختتام پر مسلمانوں کے ادنیٰ و اعلیٰ طبقے پستی کی انتہا کو پہنچا دیئے گئے۔ بغیر وقار بغیر تعلیم اور بغیر وسائل مال و دولت کے مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے نہتے چھوڑ دیئے گئے[۱۹] اس کشمکش میں مسلمان اور تباہ و برباد ہو گئے۔ برطانوی راج نے مسلمانوں کو ہندوؤں کا محکوم بنادیا۔ اور ہندو مسلم کشمکش میں انگریزوں کی عدم مداخلت سے مسلمان اور تباہ ہو گئے[۲۰] فوجی ملازمتیں بھی مسلمانوں کے لئے بند ہو گئیں۔ کسی اچھے مسلمان

---

[۱۷] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۷۸۔

[۱۸] پاکستان یا تقسیم ہند از ڈاکٹر امبیڈکر صفحہ (۳۰)

[۱۹] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ (۳۱)

[۲۰] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ (۳۲)

گھرانے کا فرد فوج میں داخل نہیں ہو سکتا تھا[10] جتنے ہندوستانی سیول سروس میں شریک ہوتے تھے یا عدالتوں کے جج بنتے تھے۔ ان میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا[11] ہندو رفتہ رفتہ حکومت کے ہر شعبہ پر حاوی ہوتے گئے۔ محکمۂ مالگزاری میں بھی ہندوؤں کا راج تھا۔ کلکتہ میں مسلمان قلی اور چپراسی کی نوکری سے زیادہ امید نہیں کر سکتے تھے[12] مسلمانوں کے افلاس کا اندازہ ان کی اس عرضی سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کہ اُنھوں نے اڑیسہ کے کمشنر کے سامنے پیش کی تھی " ہم اپنی سرکاری ملازمتوں کے چھین جانے سے اس قدر مایوس ہیں کہ دنیا کے دور ترین مقاموں تک کو خوشی کے ساتھ جانے تیار رہیں۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے تک سے ذرائع نہیں کریں گے۔ سائبیریا کے بے آب و گیاہ علاقوں میں گھومنے تک کو تیار رہیں اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ اس میں (۱۰) شلنگ ہفتہ کی ملازمتیں مل جائیں گی[13] صوبہ بنگال میں ۱۸۷۱ء میں ملازمتوں کا جو تناسب مختلف فرقوں میں پایا جاتا تھا وہ حسب ذیل جدول سے واضح ہوتا ہے[14]

---

[10] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ (۱۵۶)

[11] ایضاً ایضاً صفحہ (۱۶۳)

[12] ایضاً ایضاً صفحہ (۱۶۷)

[13] ایضاً ایضاً صفحہ (۱۶۳)

[14] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ (۱۶۶)

صوبہ بنگال کی سرکاری ملازمتیں اپریل ۱۸۷۱ء	یوروپین	ہندو	مسلمان	جملہ
اکونٹنٹ سیول سروس التقرر بادشاہ کی جانب سے ہوتا ہے	۲۶۰	۰	۰	۲۶۰
اضلاع میں عدالت ہائے دیوانی کے افسر	۴۷	۰	۰	۴۷
زائد مددگار کمشنر	۲۶	۷	۰	۳۳
ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ۔	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
محصول آمدنی	۱۱	۴۳	۶	۶۰
محکمہ رجسٹریشن	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۱	۱۷۸	۳۷	۲۱۶
محکمہ پولیس کے تمام گریڈ کے افسر	۱۰۶	۳	۰	۱۰۹
انجینیر محکمہ تعمیرات	۱۵۴	۱۹	۰	۱۲۳
محکمہ تعمیرات کا ماتحتی عملہ	۷۲	۱۲۵	۴	۲۰۱
اکونٹنٹ محکمہ تعمیرات	۲۲	۵۴	۰	۷۶
محکمہ طبابت۔ میڈیکل کالج جیل۔ حفظ صحت وغیرہ	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
ٹیکہ ماتحت چیچک اور اضلاع میڈیکل افسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً جنگلی۔ بحری افسر۔ افیون۔ سروے۔	۴۱۲	۱۰	۰	۴۲۲
	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

چنانچہ ان اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ انگریزی حکومت کے تحت مسلمانوں سے ملازمتیں بالکل چھین لی گئی ہیں۔ ۱۸۹۳ء کی صوبوں کی سیول لسٹ[۱۵] دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ صرف صوبہ بنگال میں گزیٹیڈ عہدہ داروں میں (۱۱۹۹) ہندو تھے اور صرف (۱۲۷) مسلمان اسی طرح صوبۂ بمبئی میں (۹۳۸) ہندو تو صرف (۶۲) مسلمان اس میں بھی (۱۹۴) ہندو تحصیلدار تھے تو صرف (۲) مسلمان تحصیلدار۔ صوبہ مدراس میں گزیٹیڈ عہدوں پر (۵۹۰) ہندو تھے تو (۳۸) مسلمان۔ ہندو منصفوں کی تعداد (۱۱۰) تھی تو صرف ایک مسلمان تھا۔ آسام میں (۱۹۸) ہندو ملازمین تو صرف (۱۲) مسلمان۔ برما میں (۴۲۵) ہندو ملازمین تو (۱۸) مسلمان۔ سندھ میں (۲۰۶) ہندو تو (۱۱۴) مسلمان۔ صوبہ پنجاب میں (۴۱۲) ہندو عہدہ دار تو (۱۶۲) مسلمان صوبہ متحدہ اودھ میں (۶۶۰) ہندو عہدہ دار تو (۴۳۶) مسلمان۔

کل ہندوستان میں عدالت کے عہدوں پر (۸۵۷) ہندو تھے تو (۱۰۹) مسلمان جن عہدوں کے لئے مقابلہ کا امتحان ہوتا ہے یا جن میں قانونی یا انگریزی لیاقت ضروری تھی مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ کم تھی۔ البتہ جن عہدوں کے تقررات راست حکومت کرتی تھی وہاں مسلمانوں کی

---

[۱۵] مجموعہ لکچرز و اسپیچیز حصہ اول نواب محسن الملک سید مہدی علیخاں۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ (یہ اعداد و شمار نواب محسن الملک کی تقریر ۱۸۹۳ء بعنوان مسلمانوں کی قسمت کا تصفیہ سے لئے گئے ہیں۔ ان عہدہ داروں کی تنخواہیں پانچسو روپئے سے اوپر ہیں تفصیلی اعداد کے لئے صفحات ۱۹۶ تا ۱۹۹ ملاحظہ ہو۔

تعداد کچھ زیادہ تھی۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۲ء کو حسب ذیل اعداد و شمار بابت ملازمت وائسرائے کے سامنے پیش کئے گئے[۱۶]۔

فرقے	۱۸۶۷ جائدادیں	۱۹۰۳ جائدادیں	۱۹۱۰ جائدادیں
یورپینیس اور یوریشینس	۲۰۴۸	۳۲۵۴	۴۴۶۶
ہندو	۹۹	۵۰۸	۷۸۲
مسلمان	۳۵	۹۸	۱۴۳

اس کے علاوہ بیسویں صدی کی ابتدا میں ملازمتوں کا مختلف محکموں میں جو فیصلہ تھا حسب ذیل ہے[۱۷]

صوبے	ڈپٹی کلکٹر، ڈپٹی مجسٹریٹ و مددگار کمشنر		سب ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ وغیرہ		سب ڈپٹی جج و منصف		محکمہ تعلیمات	
	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان
بمبئی	۵۳	۹	۱۸۶	۳	۱۰۹	۲	۳۹	۱۷
مدراس	۶۱	۷	۱۵۱	۱۱	۱۳۲	۱	۱۲۷	۱۰
بنگال	۲۶۵	۵۹	۱۶۵	۳۳	۱۹۵	۱۷	۱۱۰	۱۶
مشرقی بنگال	۱۳۶	۴۹	۱۰۷	۳۹	۲۱	۱	۵۶	۱۵
صوبہ متوسط	۶۰	۳۳	۵۲	۱۶	۱۱۷	۶	۱۲۳	۳
صوبہ متحدہ	۱۳۵	۹۸	۱۲۲	۱۰۶	۱۱۱	۳۵	۵۸	۵
پنجاب	۷۴	۶۸	۱۴۲	۹۰	۸۱	۵۲	۵۳	۶

ملازمتوں کے ان اعداد دیکھنے سے مسلمانوں کی پستی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ہندوستانیوں کی زندگی اور مقدر کا تعین کرنے میں کوئی معاشی وسیلہ اتنا اہم نہیں جتنی کہ ملازمتیں[18] دنیا میں کہیں بھی ملازمتیں عوام کی بہبودی کو اتنا متاثر نہیں کرتیں جتنا کہ ہندوستان میں اور چونکہ قوم کی قسمت کا فیصلہ ملازمتوں سے وابستہ ہے۔ ہندو اور مسلمان اس میں حصہ لینے کے لئے سخت جد و جہد کرتے رہے[19] اس ملک میں ملازمت کا مسئلہ اہم اور قومی مسئلہ بن گیا ہے۔ ہندوستان میں امتحانات، حکومت میں شرکت صرف روٹی کا مسئلہ نہیں بلکہ اقتدار کا بھی مسئلہ ہے۔ ایک تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر اپنی تنخواہ سے کہیں زیادہ اثرات کا حامل ہوتا ہے[20]

ملازمت میں تو مسلمانوں کا یہ حال تھا تجارت میں انھوں نے بہت کم دلچسپی لی" اس کوچہ میں نہ اول ان کا گزر ہوا تھا نہ اب کہیں نظر آتے ہیں[21]" بمبئی اور مدراس میں جہاں رعیت واری بندوبست تھا ہندو کاشتکار کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا[22] دوسرے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی کم دلچسپی

ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۶ و ۱۷ صفحہ ۱۹ ۔ [16] اخبار "کامریڈ" ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ (۲۹)

[17] "ہندوستانی خلفشار" از شیرول صفحات ۳۴۶ تا ۳۴۷ ۔

[18] رپورٹ سیمن کمیشن جلد سوم توضیحی نوٹ از ڈاکٹر شفاعت احمد خاں۔

[19] ایضاً صفحہ ۳۷۱

[20] ایضاً صفحہ ۳۷۵ ۔

[21] مجموعہ تقاریر محسن الملک تقریر ۲۷ دسمبر ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۹۹ ۔

[22] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۹۹ ۔

یہی حالت تھی۔ چنانچہ اپنی ایک تقریر میں نواب محسن الملک نے مسلمانوں کی پستی کا نہایت واضح نقشہ کھینچا کہ "...... بہت بڑا حصہ ہماری قوم کا برخلاف دوسری معزز قوموں کے جو ہمارے ہم وطن ہیں۔ مفلس اور ذلیل حالت میں ہے ..... لاکھوں مسلمان ایسے ہیں جن کو نہ کھانے کو روٹی ملتی ہے اور نہ پہننے کو کپڑا نہ کسی مجلس میں جانے کے لائق نہ کسی حاکم سے ملنے کے قابل ..... اگر آپ ہندوستان کے مختلف حصوں کا سفر کریں اور اضلاع اور شہروں اور قصبوں میں پھریں اور مسلمانوں کی حالت کو دوسری قوموں کی حالت سے مقابلہ کریں تو آپ کو ہر جگہ دونوں کی حالت میں فرق عظیم پایا جائے گا۔ بنگال میں جاکر نامور قوم بنگالیوں کو دیکھئے بمبئی میں جاکر فیاض اور بلند ہمت پارسیوں کو ملاحظہ کیجئے۔ دکن میں جاکر اولوالعزم مرہٹوں سے ملئے۔ مدراس میں ذکی الطبع ہندوؤں کی کیفیت دیکھئے اور پھر ہر جگہ اپنے بدنصیب بھائیوں کا ان سے مقابلہ کیجئے تو ہر جگہ فرق نظر آدیگا جو روز روشن اور شب تاریک میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ کیا بنگالی اور کیا پارسی۔ کیا مرہٹے اور کیا مدراسی سب میں ایک جوش مستعدی اور اولوالعزمی پائیں گے اور ہر ایک کو زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلتا اور ترقی کرتا دیکھیں گے۔ کالج ان سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ کچہریوں میں وہی دکھائی دیں گے حکومت کی کرسیوں پر آپ انھیں کو بیٹھا ہوا دیکھیں گے۔ ہائیکورٹ میں یوروپین ججوں کے برابر وہی بیٹھے ملیں گے۔ کونسل میں وائسرائے اور گورنر کے ساتھ ملکی معاملات میں آپ انھیں کو صلاح اور مشورہ دیتے ہوئے پائیں گے۔ بڑے بڑے تجارت کے کارخانوں میں انھیں کی صورتیں دکھائی دینگی

غرضکہ کوئی جگہ عزت کی ایسی نہ ہوگی جہاں وہ نہ ملیں بمقابلہ اُن کے مسلمانوں کو آپ ہر عزت کے مقام سے خارج اور ہر قسم کی ترقی کے ذریعہ سے محروم دیکھیں گے[۲۳]

بہرکیف برطانوی راج کے تحت مسلمان بری طرح تباہ و برباد ہوگئے۔ اکثر مسلمانوں کی سماجی و معاشی پستی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ ان کے سخت مذہبی بندھنوں کا نتیجہ ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مذہب اسلام دیگر اسلامی ممالک کی ترقی کے راستہ میں حائل نہیں ہوا[۲۴] پستی کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمان بیرونی اثرات چاہے اچھے ہوں یا برے قبول کرنے سے گھبراتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اسلام خطرہ میں پڑ جائیگا۔ مسلمانوں کی پستی کی انتہا کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "دارالعوام میں اگر کوئی سیاست دان سنسنی پیدا کرنا چاہتا تو اس کے لئے یہ کافی تھا کہ بنگال کے کسی مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کردے[۲۵]" چنانچہ ایسے حالات کے تحت جب مسلمان اپنے ترقی یافتہ ہندو برادران وطن کی طرف نگاہ بڑھاتے تو ان کو مایوسی ہوتی۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس رشک وحسد کی فضا میں مسلمان اندرونی طور پر ہندوؤں کے مخالف ہوگئے۔ اور انھیں اپنی نامرادی اور محرومی کا احساس روز بروز بڑھتا گیا۔

اِصلاح معاشرت کی تحریکیں اور ہندو مسلم اختلافات

انیسویں صدی میں اصلاح معاشرت کی ۲ اہم تحریکیں اٹھیں، ایک وہابی

---

۲۳ مجموعہ تقاریر نواب محسن الملک تقریر ۲۹ / ڈسمبر ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۹۰۔ ۲۴ "تقسیم ہند" از ایبیڈکر صفحہ ۲۲۵ ۲۵ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۵۴

تحریک اور دوسری آریہ سماج تحریک۔ اگرچہ کہ یہ تحریکیں برطانوی راج کے خلاف اٹھیں لیکن بعض بنیادی غلطیوں کی وجہ سے ہند و مسلم اختلافات کا ذریعہ بن گئیں۔ وہابی تحریک اور آریہ سماج تحریک مغربی تمدن اور اثرات کے خلاف زبردست جہاد تھا۔ ان تحریکوں کے چلانے والوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی سماج کا دیکھ بھال کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ لہذا اہل ہند کی پستی کو مذہب کے ذریعہ دور کرنے کی یہ کوششیں کی گئیں۔

ابتدا میں ہندوستان میں وہابی تحریک فرائضی تحریک کے نام سے اٹھی جس کے بانی شریعت اللہ صاحب تھے۔ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کے ادنیٰ طبقے خصوصاً مزدوروں اور کاشتکاروں میں بیداری پیدا کرنا اور اس کے ساتھ احکام الٰہی سے عوام کو آگاہ کرنا تھا۔ لیکن بعد میں چلکر جب اس تحریک کی باگ دوڑ جناب سید احمد بریلوی کے ہاتھ آئی تو یہ تحریک جارحانہ صورت اختیار کرنے لگی۔ تشدد کی وجہ سے جہاں یہ تحریک انگریزوں سے ٹکرا گئی وہاں ہندوؤں کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کر کے خائف کر دیا۔ پٹنہ کے دارالاشاعت سے سارے ہندوستان میں انقلابی ادب تقسیم کیا جانے لگا۔ مسلمانوں سے جہاد کی غرض سے روپیہ وصول کر کے سرحدی کیمپ کو روانہ کیا جاتا تھا جہاں سے سید صاحب نے انگریزی سرحد پر متعدد حملے کئے۔ بنگال کے بعض صوبوں میں وہابیوں نے باقاعدہ شرعی احکام کو نافذ کر دیا تھا۔ اگرچہ یہ تحریک مذہبی اور معاشرتی جامہ پہن کر ابتداء میں منظرِ عام پر آئی لیکن اس کی تہ میں سیاسی اغراض کارفرما تھے۔ انگریزوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہ اقدام حکومت برطانیہ

کے خلاف ہے۔" مسئلہ جہاد ہی کی بحث اس امر کو صاف واضح کر دیتی ہے کہ ہندوستان میں ہماری حکومت (برطانوی حکومت) کیسی خطرناک بنیادوں پر قائم ہے۔ کیونکہ یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جب کبھی کوئی ایسا فتویٰ حکومت کے خلاف شایع ہوا تو اس کا ردعمل دنیا کی سخت ترین اور نہایت خونریز بغاوتوں کی صورتوں میں ظاہر ہوا۔[۲۲] ہندوستان کو دارالحرب قرار دینا اور جہاد سے متعلق علماء کے فتوے صاف صاف بتا رہے تھے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں ایک پر خطر دور سے گزر رہی تھی۔[۲۳]

اگرچہ کہ وہابی تحریک کے چلانے والوں کے عزائم بلند تھے لیکن اس تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچا۔ اس تحریک کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ انگریز مسلمانوں سے کھٹک گئے دوسرا یہ کہ اس تحریک نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے بدظن کر دیا۔ جب ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تو جہاد کی زد میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی آجاتے تھے۔ وہابی تحریک کا نصب العین شرعی قوانین اور اسلامی حکومت کا احیاء تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندو اس کے مخالف ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ردعمل کے طور پر ہندوؤں میں آریہ سماج کی تحریک نے جنم لیا۔

آریہ سماج تحریک بھی وہابی تحریک کی طرح ماضی کی لپکار تھی۔ اس کے

---

[۲۲] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۴

[۲۳] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۱۳

بانی سوامی دیانندجی ویدکے عہد کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔ جب ایک طرف بانیان وہابی تحریک نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر جہاد کا نعرہ بلند کیا تو اس کے ردّعمل کے طور پر آریہ سماج تحریک نے "آریاورت آریاؤں کے لئے" کا نعرہ بلند کیا چنانچہ اس مقام پر اس کی ٹکر انگریزوں اور مسلمانوں سے ایک ساتھ ہو گئی۔ اِن تحریکوں نے ہندو مسلم ذہنیتوں پر بڑا گہرا اثر کیا اور ان سے ہندو مسلم اختلافات کی خلیج اور وسیع ہونے لگی۔

مسلمان اسلام کا احیاء کرنا چاہتے تھے اور ہندو ویدکے دور کا احیاء کرنا چاہتے تھے ویدک دور اور خلافت کے ابتدائی دور میں بعدالمشرقین پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دو تحریکیں دو مختلف روایات کا احیاء کرنا چاہتی تھیں لہٰذا زندگی میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے لگے۔ اِن تحریکوں کی تعلیمات کے زیر اثر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ قومی رسوم کو چھوڑ دیا جس میں وہ اب تک ہردو شریک تھے۔ آہستہ آہستہ قومی زندگی کے مشترک عناصر مٹنے لگے۔ لباس و غذا۔ عادات و اطوار رسوم و رواج میں دوراہے پیدا ہونے لگے۔ ہندو اور مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ مدارس اور جامعات بنانے لگے۔ اردو زبان سے سنسکرت اور ہندی زبان سے عربی الفاظ خارج کئے جانے لگے۔ ان تحریکوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ سماجی تنظیم مذہبی اور فرقہ واری بنیادوں پر ہونے لگی۔ ہندو اپنے آزادی کے دن واپس لانا چاہتے تھے جبکہ وہ سادہ خود مکتفی زندگی بسر کرتے تھے اور مسلمان خلافت کے دور کا احیاء اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے

مرہٹے سیواجی کے خواب کی تعبیر پوری کرنا چاہتے تھے۔ سکھ یہ کیسے بھول سکتے تھے کہ ان کے آباء و اجداد ۱۸۴۹ء تک پنجاب کے آخری آزاد حکمران تھے۔[۴۸] قومیت اور احیاء کی ان تحریکوں سے ہر فرقہ سیاست میں بھی جداگانہ عزائم رکھنے لگا۔[۴۹]

اردو ہندی اختلافات

انیسویں صدی کے اواخر میں اردو ہندی مسئلے نے بھی ہندو مسلم اختلافات کو بڑھانے میں مدد دی۔ دراصل اردو ہندی مسئلہ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہو گیا تھا جبکہ اسی سال بنارس کے ہندوؤں نے اردو زبان سے اختلاف کرتے ہوئے سرکاری عدالتوں میں ہندی زبان اور دیوناگری حروف رائج کرنے کی کوشش کی۔ ہندی تحریک کا مرکز الہ آباد قرار دیا گیا اور ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ لیکن اردو ہندی اختلافات کے پس پردہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ... جب انگریز حکمران اور مبلغین نے دیکھا کہ مسلمان ان کے مخالف ہیں اس لئے ہندوؤں کو اپنی طرف ملانے اور عیسائی بنانے کے لئے انھوں نے ہندو استادوں سے اردو زبان میں سے فارسی اور عربی کے الفاظ نکلوا کر سنسکرت کے الفاظ لکھوائے۔ اس کا نام انھوں نے ہندی تجویز کیا تاکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ رہیں۔ یہ تفریق ۱۸۱۸ء

---

[۴۸] ہندو مسلم مسائل از بینی پرشاد صفحہ ۲۷۔

[۴۹] ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷۔

یں شروع ہوئی۔ لیکن شروع میں ہندی زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی.... ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو قطعی طور پہ باغی مان لیا اور انھیں دبانے کی زوردار کوششیں شروع کردی۔ بہار اور اڑیسہ کے گورنر کیمپبل نے ہندوؤں سے کہا کہ تم اردو کیوں بولتے ہو۔ یہ تو دہلی کے طوائفوں کی زبان ہے۔ انگریز افسروں نے گرامر اور ڈکشنریاں لکھ کر ہندوؤں کو دکھایا کہ اردو کوئی زبان نہیں اور اصل میں مقامی زبانیں سب کچھ ہیں۔ یہ حکمت عملی ۱۸۶۷ء-۱۸۷۳ء تک جاری رہی۔ مسلمانوں کی تحریکیں بھی چلتی رہیں۔ اس اثنا میں لارڈ میکالے کے رسالے اور دوسرے انگریزوں نے جن میں ہنٹر کا نام قابل ذکر ہے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کے تالیف قلب کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو کچھ سر اٹھا رہے تھے۔ مسلمانوں میں سرسید احمد خاں کی تحریک شروع ہونے کا یہی زمانہ تھا۔ لیکن ان کی تحریک میں ہندو بھی شریک تھے۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے لئے ہندوؤں نے بھی چندہ دیا۔ لیکن جب غازی پور سے یہ آواز بلند کی گئی کہ ہندوؤں کی زبان ہندی ہے اردو نہیں تو سرسید کی ذہنیت بدلنے لگی۔ انگریز افسروں میں سے کچھ نے سرسید کا ساتھ دیا اور کچھ ہندوؤں کی طرف آ گئے۔ اس طرح سے ۱۸۶۷ء سے ہندی کی ترقی شروع ہوئی اور آج یہ حال ہے کہ تھوڑے دنوں میں اردو لکھنے والا اور بولنے والا ہندوؤں میں ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ دہلی جیسے شہر میں بھی بیشتر ہندو لڑکے لڑکیاں اردو کے بجائے ہندی پڑھ رہی ہیں ...... اردو اور ہندی دونوں آج قومی زبان ہونے کا دعویٰ کر رہی ہیں۔ اور زبان کے مسئلہ پر فرقہ داری رنگ چڑھایا جا رہا ہے جس سے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا شیرازہ بکھر نے

کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اردو ہندی اختلافات کے ذریعہ ہندو مسلم اختلافات پیدا کئے گئے۔ پروفیسر گارساں دتاسی نے اپنے خطبے ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء کو کہا کہ "ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ حالت رہی کہ اردو کو ہندی سے علیحدہ تصور کیا جائے[۳۱]"

حکومت اس زمانے میں ہندی کی تائید اس لئے کر رہی تھی کہ اسے ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود تھا اس لئے کہ ان کی آبادی کثرت سے تھی، یہ پالیسی "ملکی مصالح پر مبنی" تھی[۳۲]۔ چنانچہ "اودھ اخبار" اشاعت ۱۲ جولائی ۱۸۶۹ء نے لکھا "اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کو فنا کر دے تاکہ اہل ہند پھر کبھی ۱۸۵۷ء کی شورش کی طرح یک جہتی کے ساتھ کام نہ کر سکیں[۳۳]"۔ جو متحدہ قوت حکومت کے خلاف کام کر چکی تھی اور کر رہی تھی اس کو حکومت نے اردو ہندی اختلافات پیدا کر کے

ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۳ صفحہ ۲۷۔ ۳۰ خطبۂ صدارت ڈاکٹر تاراچند "ترقی پسند مصنفین کانفرنس" منعقدہ حیدرآباد دکن مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء بحوالہ اخبار پیام مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء۔

۳۱ خطبات گارساں دتاسی مترجمہ و شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد صفحہ ۳۶۵۔

۳۲ خطبات گارساں دتاسی مترجمہ و شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد صفحات ۵۰۷ تا ۵۰۸۔

۳۳ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۷۲۳

نہ صرف کمزور کرنا چاہا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں متصادم
کردیا اور اردو ہندی اختلافات کی وجہ سے انیسویں صدی کے اواخر میں
ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔

باب اوّل حصّہ دوم

نیابتی اِداراتِ کی ترویج اور مسئلہ اقلیّت میں پیچیدگی

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد حکومت برطانیہ نے محسوس کیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں انتہائی مرکزیت سے کام نہیں چل سکتا۔ انگریزی تعلیم رنگ لا رہی تھی۔ تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے عمومی اداراتِ سے واقف ہونے لگا تھا۔ غدر کے چند سال کے اندر ہندوستان کی قومی تحریک جڑ پکڑنے لگی اور یورپ کے لبرل خیالات کا اثر نمایاں ہو رہا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے تخیل پر بینرجی کے خیالات کا بڑا اثر ہوا[1]۔ بینرجی کی تحریرات نے خصوصاً بنگالیوں پر بڑا اثر کیا[2]۔ اِس بدلتے ہوئے ماحول کو لارڈ رپن نے

---

[1] "ایک قوم زیرِ تعمیر" از سر سریندر ناتھ بنرجی صفحہ (۱۴)

[2] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ششم صفحہ (۵۳۸)

بہت جلد تاڑ لیا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مراسلہ وزیر ہند لارڈ ہارٹنگٹن کو لکھتا ہے۔[۵۳]
تعلیم کی اشاعت پریس کے بڑھے ہوئے اثرات۔ ریلوے۔ ٹیلیگراف و دیگر سائنس کی ایجادات ذرائع حمل و نقل کی ترقی اور سب سے اہم مغربی علوم نے اہل ہند میں بیداری پیدا کر دی ہے۔ حکومت کو ان بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دینا ہوگا۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے زمانہ کی رفتار سے آگے نکل جانا خطرناک ہے اور پیچھے رہ جانا اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے ایک مناسب راستہ معلوم کرنا ہوگا اور ترقی کے لئے راہیں کھولنی ہوں گی۔ لارڈ ڈفرن نے بھی ان بدلتے ہوئے حالات کو دیکھکر کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے[۵۴]
ہندوستان پر قدیم روما کی طرح نہ حکومت کی جاسکتی ہے اور نہ اب وہ زمانہ ہے مجالس مقننہ میں کافی اصلاح کی گنجایش ہے۔ دیسی باشندوں میں بعض ایسے صاحب فہم اور قابل اصحاب موجود ہیں جن کو ذمہ دارانہ خدمات سپرد کی جاسکتی ہیں۔ اگر یہ لوگ مقننہ میں شریک ہونگے تو آئیندہ اکثر قوانین عوام کے لئے قابل قبول ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ان کے وضع کرنے میں ان کے نمایندوں کا ہاتھ ہوگا اور حکومت ہند کی وہ حالت جو طوفانی سمندر میں چٹان کی سی ہے اور جس کو ہر سو موجوں کا بار برداشت کرنا پڑتا ہے برقرار نہ رہیگی۔

ان حالات کے تحت معلوم ہوگا کہ کچھ تو حکومت کے انتظامات

۵۳؎ سوانح حیات لارڈ ریپن جلد دوم از وولف صفحات ۹۲ تا ۹۴

۵۴؎ ایضاً ڈفرن جلد دوم از سر اے۔ سی لائیل صفحات ۱۵۲ تا ۱۵۴

کی سہولت کی خاطر اور کچھ ہندوستانیوں میں شعور اور قومی تحریک کے دباؤ سے حکومت مجبور ہوگئی کہ دیسی باشندوں کو حکومت میں شریک کرے چنانچہ لارڈ رپن کے عہد میں مقامی حکومت خود اختیاری کی داغ بیل پڑی ان اداروں کے ذریعہ لارڈ رپن دیسی باشندوں کو انصرام حکومت میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ان عمومی ادارات میں کون کون حصہ لیگا۔ حکومت خود اختیاری کے ادارات کی ترویج کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ "خود" کی کون نیابت کرتا ہے اور کس حد تک[۵] چنانچہ جوں ہی قلیل ترین مقدار میں حکومت برطانیہ کی جانب سے اقتدار اور مراعات تفویض کئے جانے لگے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد منتشر ہونے لگا[۶]۔ لہذا فرقہ داری کشیدگی دستوری اصلاحات کا لازمی نتیجہ تھی[۷]۔ ایک تو ہندو زیادہ تعلیم یافتہ ہونے اور دوسرے ان کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے مقامی حکومت خود اختیاری کے ادارات میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکتے تھے۔ اب مسلمان بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ جب رپن کے عہد میں مقامی حکومت خود اختیاری کی ابتداء ہوئی اور انتخابات ہونے لگے تو مسلمانوں کی پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ اب وہ ایک نہایت اہم مسئلہ سے دوچار تھے یہ ان کی موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ ایک تو ان کی معاشی اور تعلیمی پستی انھیں جمہوری

۵؎ سر سید سلطان احمد" سلطنت متحدہ اور ہندوستان کے درمیان ایک معاہدہ صفحہ ۶۹

۶؎ ایضاً ایضاً صفحہ ۶۹

۷؎ ایضاً ایضاً صفحہ ۶۹

اداروں میں شریک ہونے سے روکتی تھی، تو دوسرے یہ خوف کہ جمہوری اصول کے تحت اکثریت کا راج قائم ہو جائے گا اور مسلمان دوامی طور پر ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ ہندوستان اب تک جمہوری ادارات سے نا آشنا تھا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان میں مقامی مجالس اور بلدی ادارات میں انتخابات ہونے لگے۔ جمہوری ادارات کی ترویج کے ساتھ ہی اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ سلطنت مغلیہ کے عہد میں نہ اکثریت کا مسئلہ تھا اور نہ اقلیت کا۔ چونکہ مسلمان حکمران تھے لہذا اقلیت میں ہونے کے باوجود ان کے حقوق کی حفاظت ہو جایا کرتی تھی اور ہندوؤں کو بھی شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مغل فرمانروا یہ سمجھ چکے تھے کہ ہندو جماعت کو جو اکثریت میں ہے نظر انداز کر کے ہندوستان پر حکومت کرنا آسان نہیں اور بہت ممکن ہو کہ انھوں نے اس مجبوری کے تحت ہی روا داری کی حکمت عملی اختیار کی ہو۔ لیکن ہندوستان میں عمومی ادارات کی ترویج سے مسلمان گھبرانے لگے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے جنوری ۱۸۸۳ء میں جب صوبۂ متوسط کا مقامی حکومت خود اختیاری کا مسودہ پیش ہوا تو   جماعہ اراکین کے انتخاب کی مخالفت کی اور (سرکاری) اراکین کی نامزدگی پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مذاہب کے آدمی رہتے ہیں ...... ایک قوم بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے دوسری قوم کو ان معاملات کی پروا نہ ہو پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان

میں ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں (نیابتی ادارات) کے جاری کرنے سے بڑی
مشکل اور سوشل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان
ہے جہاں قومی امتیاز باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں
تفرقہ و اختلاف تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں۔ اس معاملہ میں
اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتی ہیں .... انگلستان کی آبادی
ایک ہی قوم ہے بلاشبہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی نسبت ایسا نہیں کیا
جا سکتا۔ ایکشن کے ذریعہ ممبروں کے مقرر کرنے سے رعایا کے ایک
حصہ کی رائے اور مطالب کی حمایت کرنے سے مراد ہے اور ان ملکوں میں
جہاں کہ آبادی صرف ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوتی ہے۔ یہ
قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جا سکتا ہے .... ایسے
ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے اختلافات اب تک
موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملت نہیں ہوئی ہیں اور جہاں کہ
مذہبی اختلافات شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے
باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں
کی ہے مجھکو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں میں مختلف مطالب
کی حمایت کی غرض سے ایکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے
سے محض تمدنی خیالات کی بہ نسبت زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا
ہوں گی۔ جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز
ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہیگا ......
اس وقت تک ایکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا
جا سکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آوے گی"[۹۸]

سرسید کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آبادی میں یگانگت اور شعور ہم جنسی ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوا جو عمومی اداراتی کا روح رواں ہے۔ علاوہ ازیں آبادی کے مختلف طبقات کا تعلیمی اور معاشی زندگی میں توازن بگڑ جانے سے انتخابات کا اصول ہندوستان کے لئے موزوں نہیں جمہوری ادارات کی ترویج کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک میں مساوی تعلیم۔ اتحاد و ایک خاص قسم کے عادات و اطوار کی ضرورت ہے۔[۵۹] ہندوستان میں اس قسم کے ماحول کا فقدان تھا۔ چنانچہ سرسید نے کہا " ہندوستان کا کوئی حصہ اب تک اس درجہ کو نہیں پہنچا ہے جبکہ ریپریزنٹیشن کا قاعدہ معاملات مختص المقام کے لحاظ سے بھی پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جاوے .... لیکن انگلستان سے ریپریزنٹیٹیو انسٹی ٹیوشنوں (نیابتی ادارات) کے ذریعہ سے سیلف گورنمنٹ کا اصول مستعار لیتے ہیں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سوشل اور پولیٹیکل حالت کئی صدیوں کی خودمختار حکومت .... ایک قوم کے دوسری قوم پر اور ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر

ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر صفحہ ۳۲۔ [۵۸] تقریر سر سید احمد خاں جنوری ۱۸۸۳ء بحوالہ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سر سید۔ صفحات ۱۶۵ تا ۱۶۶۔

[۵۹] بینی پرشاد (ہندو مسلم مسائل صفحہ ۳۳)۔

غلبہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے[9]

سرسید کا خیال تھا کہ انتخابات کے مسائل سے جو پیچیدگیاں پیدا ہونگیں، ان سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔ چنانچہ اس کی بابت انھوں نے کہا "فرض کیجئے کہ تمام مسلمان کے ممبر ہونے کے لئے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لئے کل ہندو ووٹ دیں اور گنئے کہ مسلمانوں کے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے لئے کتنے .... یعنی ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہوں گے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں۔ پس میتھے میٹکس (ریاضی) کے ثبوت سے ایک ووٹ مسلمان کے لئے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لئے۔ پس مسلمانوں کا ٹھکانہ ہندوؤں کے مقابلہ میں کیا رہیگا اور جوئے کے اصول کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لئے اور ایک پانسہ ہمارے لئے ہوگا[10]۔

سرسید کو یہ بھی خدشہ تھا کہ مسلمان عمومی ادارات کی شرائط رائے دہندگی پر تعلیمی اور معاشی پستی کی وجہ سے پورے نہیں اتر سکتے ایک تو تعداد میں کم تھے جس کی وجہ سے نیابتی ادارات میں وہ اقلیت میں ہوکر جاتے تو دوسرا پستی کی وجہ سے ان کی قوت رائے دہی بہت ہی کم ہوجاتی۔ چنانچہ انھوں نے کہا" اے مسلمانوں تم اپنی قسمت پر روؤ کہ تمہارے پاس ایسی جائدا داور دولت ہے جو ملک کے ہندوؤں کے پاس ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر فرضاً یہ درجہ مقرر ہو کہ (۵) ہزار روپیے

---

[9] مجموعہ لکچرس و اسپیچیز سرسید۔ تقریر جنوری ۱۸۸۳ء صفحہ ۱۶۵

[10] ایضاً ایضاً بمقام لکھنو ۲۸/دسمبر ۱۸۸۷ء صفحہ ۳۵۳

آمدنی والے ایلکٹر مقرر ہوں تو بتلاؤ کتنے مسلمان نکلیں گے جن کی آمدنی اس قدر ہے اور کس کے حق میں ووٹ زیادہ دینے والے ہوں گے ...... لیکن اس عقلی قاعدے سے کسی ایک مسلمان کو بھی موقع نہیں مل سکیگا کہ وائسرائے کی کونسل کا ممبر بن سکے[۱۲] اور پھر انھوں نے کہا۔ اُن لوگوں کو بھی مجھے بتلاؤ جو منتخب ہو کر اپنے کاروبار چھوڑ کر روپیہ خرچ کرکے کلکتہ اور شملہ میں حاضر ہوں گے اور تمام اخراجات اپنی ذات سے یا ملک کے چندے سے برداشت کریں گے ...... مجھے بتاؤ کہ ہماری قوم میں کون ہے۔ اودھ پنجاب میں جو ہماری قوم اور قوم کے کام پر اپنا روپیہ فدا کرے گا۔ کاروبار چھوڑے گا اور وائسرائے کی کونسل میں گفتگو کرے گا[۱۳]

ہندوستان میں قومی تحریک کے آغاز اور عمومی ادارات کی ترویج سے مسلمان بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ایک طرف سرسید جیسی شخصیت ان کو کانگریس اور سیاسی امور میں علیحدہ رہنے کی ہدایت کر رہی تھی تو دوسری طرف بدرالدین طیب جی ان کو کانگریس میں شریک ہونے کی دعوت دے رہے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں سرسید اور بدرالدین طیب جی میں طویل خط وکتابت رہی۔ بدرالدین طیب جی نے سرسید کو یقین دلایا کہ اگر کانگریس میں کوئی ایسی تحریک پیش ہو جس سے مسلمان کی اکثریت کو اتفاق نہ ہو تو وہ مسترد کردی جائے گی۔

۱۲؎ مجموعہ لکچرز و اسپیچیز سرسید تقریر بمقام لکھنؤ ۲۸/ ڈسمبر ۱۸۸۷ء صفحہ ۳۵۳

۱۳؎ ایضاً صفحہ ۳۵۴

لیکن سرسید کو خوف تھا کہ کہیں مسلمان کانگریس کی قومی تحریک میں شریک ہو کر حکومت سے ٹکرا کر ختم نہ ہو جائیں۔ سرسید نے غدر کے خونی نظارے بچشم خود دیکھے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمان گھرانے تباہ وتاراج ہوئے۔ غدر کے بعد مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ جس طرح کہ انقلاب فرانس کے بعد فرانیسی امراء تباہ وتاراج ہو گئے اسی طرح غدر کے بعد ہندوستان کے مسلم امراء کو نقصان پہنچا۔[۱۴] ایسے حالات میں مسلمانوں کی ذہنیت پر ایک عام ہیبت طاری تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ مسلمان قومی تحریک میں شریک ہوں تو بہتر ہے۔ ابتداء میں مسلمان کانگریس میں اس لئے نہیں شریک ہو سکے کہ ایک تو مغربی تعلیم سے بے بہرہ تھے اور دوسرا یہ محسوس کیا گیا کہ ان کا سیاسی مزاج سیاسی تحریک کے لئے خطرناک ہوگا۔[۱۵] چنانچہ سرسید نے اپنی تقریر مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۸۸ء بمقام میرٹھ مسلمانوں کو سیاسی تحریک سے احتراز کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا "ہم پولیٹیکل شور وغوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور ہم اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم میں کم ہیں۔ دولت میں کم ہیں۔ پس ہم کو اپنی قوم کی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیئے۔ اس وقت ہمارا یہ حال ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت ان کے ہاتھ میں ہے .... اس وقت ان سے لے جا پولیٹیکل معاملات

---

[۱۴] خطبات کانگریس جلد دوم۔ خطبہ صدارت مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۱۲۔

[۱۵] ایضاً ایضاً صفحہ ۶۱۲۔

میں بنگالیوں سے دوستی پیدا کرنا اور ان کے ساتھ شامل ہونا مضرت کا باعث ہوگا۔ اگر میری قوم ایسا کرے گی تو گورنمنٹ سے فائدہ اٹھا دیگی ورنہ یاد رکھو گورنمنٹ تم پر سخت نظر رکھیگی کیونکہ تم بڑے متمرد، بڑے بہادر، بڑے سپاہی اور بڑے لڑنے والے ہو[۱۶]"

ان صورت حالات میں سرسید نے مسلمانوں کو قومی تحریک میں شریک ہونے سے منع کیا۔ نہ صرف مسلمان بلکہ وہ ہندوؤں کا بھی سیاسی تحریک میں شریک ہونا پسند نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ اپنی میرٹھ والی تقریر میں انھوں نے کہا "اس اختلاف میں جو اس وقت پولیٹکل معاملات میں ہو رہا ہے مجھے افسوس ہے کہ اس میں ہمارے ہندو بھائی بھی شریک ہیں .... غالباً کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ شریک ہوگئے ہیں[۱۷]" دراصل سرسید کو غدر کا خونی ڈرامہ پریشان کر رہا تھا جس کے بعد مسلمان تباہ و برباد ہوگئے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اگر پھر مسلمان حکومت سے ٹکر لیں تو قوم کی رہی سہی جان بھی ختم ہو جائے گی۔ سرسید دراصل انگریزوں اور مسلمانوں میں جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اس کو رفع کرنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی حکومت اور مسلمانوں میں بہت میل کروانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان انگریزوں کی شکایت کرنے لگے تو سرسید نے کہا "کوئی گورنمنٹ ایسی نہیں ہے کہ تمام لوگ اس سے راضی ہوں۔ اگر ہم کو بھی انگریزی حکومت سے شکایت ہے تو

---

[۱۶] مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید تقریر میرٹھ ۱۶/مارچ ۱۸۸۸ء صفحات ۳۷۵ تا ۳۷۶

[۱۷] ایضاً ایضاً صفحہ ۳۷۳۔

کوئی نئی بات نہیں۔ خدا کی گورنمنٹ میں بھی تو لوگ اس کا شکر نہیں کرتے"[۱۸]
چنانچہ اسی ضمن میں انھوں نے میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا "خدا نے
ان (انگریزوں) کو ہم پر حاکم کیا ہے پس ہم ان سے دوستی کریں اور
وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو ہندوستان میں ...
...... استحکام رہے .... قرآن مجید بھی انھیں سے دوستی
کرنے کی ہدایت کرتا ہے"[۱۹] ظاہر ہے کہ سرسید انگریزوں اور مسلمانوں
میں مفاہمت کروانا چاہتے تھے اور ایسی صورت میں وہ مسلمانوں کو قومی
تحریک کی صفوں میں شریک ہونے سے منع کرتے رہے اس لئے کہ
قومی تحریک برطانوی سامراج کے خلاف چلائی جا رہی تھی اور مسلمان
برطانوی سامراج سے ٹکر لیکر غدر ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو چکے تھے لہذا
حکمران طبقے اور مسلمانوں میں جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور جس کی وجہ
سے مسلمان ملازمتوں سے ہٹائے جا رہے تھے اور معاشی بدحالی کا
شکار ہو گئے تھے اس کو سرسید رفع کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک
سیاسی تحریک سے زیادہ ایک دم توڑی ہوئی قوم کے مسائل اہمیت
رکھتے تھے۔ سرسید بالکل حق بجانب تھے جبکہ انھوں نے مسلمانوں کے
مزاج کو پہچان کر سیاست سے علیحدہ رہنے کی تلقین کی اور تعلیم حاصل
کرنے کی ہدایت فرمائی جو ان کی ترقی کے لئے ضروری تھی[۲۰] دیگر فرقے

---

[۱۸] مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید تقریر لکھنو ۲۸/ دسمبر ۱۸۸۷ء صفحہ ۳۵۳

[۱۹] ایضاً تقریر میرٹھ ۱۶/ مارچ ۱۸۸۸ء صفحہ ۳۴۲

[۲۰] اخبار کامریڈ ۹/ جنوری ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۴۔

کافی ترقی کر چکے تھے اور جامعات کلکتہ بمبئی و مدراس سے (۳۰) سال سے استفادہ کر رہے تھے[۲۱] ظاہر ہے کہ جو ملاح اپنی ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کو طوفانی سمندر سے لا رہا ہو وہ کسی طرح سیاسی بھنوریں کو دنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ سرسید کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس چاپلوسی سے بہت دور تھے جو ان کے سیاسی تنقید نگار اُن پر منطبق کرتے ہیں[۲۲] سرسید کا مطالعہ کرنے کے بعد ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں نہ تھے انھوں نے کبھی بھی فرقہ واریت کی بنا نہیں ڈالی ان کی تقاریر سے اور ان کے دوستانہ تعلقات سے جو کہ ہندوؤں سے تھے ان پر کبھی بھی فرقہ واریت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔[۲۳] حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سرسید نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ دانشمندانہ تھا اور مسلمانوں کا یا سارے ہندوستان کا کوئی بھی خواہ مسلمانوں کی رہبری کے لئے شاید ہی کوئی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا تھا۔[۲۴]

لیکن سرسید کی حکمت عملی سے انگریزوں کو بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنے میں سٹریچی علیگڑھ کالج کے پرنسپل کا کچھ کم ہاتھ نہ تھا۔ وہ کبھی تو ڈیفنس ایسوسی ایشن اور کبھی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے نام سے کانگریس کی مخالفت کرتے رہے[۲۵]

---

۲۱ اخبار کامریڈ ۹ر جنوری ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۷۔

۲۲ خطبات کانگریس جلد دوم خطبہ صدارت مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۱۲

۲۳ ایضاً ایضاً صفحہ ۶۱۴

۲۴ ایضاً ایضاً صفحہ ۶۱۵

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید کو مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غلط فہمی رفع کرنے میں بڑی کامیابی ہوئی۔ مسلمانوں کی عدم مداخلت کی اس حکمت عملی سے انگریزوں کو یقینی بڑا فائدہ ہوا۔ اب حکومت نے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرکے اپنی بقا کا سامان فراہم کیا۔ چنانچہ لارڈ ڈفرن نے ۲۱ مارچ ۱۸۸۸ء کو محمڈن لٹریری سوسائٹی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں مسلمان فرقہ کی یہ کوششیں کہ وہ ہندوؤں کی طرح تعلیم اور تمدن کی دیگر ضروریات کے معاملہ میں ایک سطح پر آجائیں ان حالات کا نہایت دلچسپی سے مطالعہ کرتا رہوں گا اور وہ کامیابی جس کی پیشین گوئی کرنے میں مجھے تامل نہیں۔ میری ساری ہمدردیاں آپ کے شامل حال رہیں گی"[۲۵]
ڈفرن کی ایک اور تقریر جو کہ اس نے ۱۰ اپریل ۱۸۸۸ء کو کی تھی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انگریز مسلمانوں کے ہمدرد بن چکے تھے۔ یہ ہمدردی ظاہر ہے نیک نیتی سے زیادہ مصلحت پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا "۵۰ ملین اشخاص بذات خود ایک قوم ہیں اور ایک بہت طاقتور قوم ہیں ۔۔۔۔۔
آپ (مسلمان) ایک عرصہ سے ہندوؤں کے مقابلہ میں نقصان دہ حالت میں ہیں۔ جبکہ ان کے نوجوان ابتدا سے ان چیزوں کی تکمیل کرتے رہے جو کہ پبلک ملازمت کے لئے ناگزیر ہے مسلمان بچے روحانی رہنماؤں کی تعلیم حاصل کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس دوڑ میں آپ کو ساتھ چلنا تھا اس میں آپ پیچھے رہ گئے"[۲۶]

۲۵۔ تقاریر ڈفرن صفحہ ۲۰۰۔

۲۶۔ ایضاً صفحات ۲۱۲ تا ۲۱۳۔

دراصل گزشتہ صدی کے آواخر میں مسلمانوں کی سیاست حکومت خود اختیاری کے اِدارات کی ترویج اور اُن کے نتائج پر مبنی تھی۔ مسلمانوں کو ہندو راج کا خدشہ تھا۔ چنانچہ سرسید نے اِس لئے بھی کانگریس میں مسلمانوں کو شریک ہونے سے منع کیا کہ کانگریس نیابتی ادارات کا مطالبہ کر رہی تھی اور یوں ہی اِس بات کا احساس ہوا کہ مسلم فرقہ (۱:۴) کے تناسب کی اِقلیت میں ہے تو مسلمان اُس کی مخالفت کرنے لگے[۱۰] مسلمانوں نے نیابتی ادارات کی ترویج کی اِس وجہ سے مخالفت کی کہ وہ جانتے تھے کہ انتخابات نسلی اور مذہبی بنیادوں پر لڑے جائیں گے اور ہمیشہ اُن کو حلقہ ہائے انتخاب میں شکست ہوگی[۱۱] تھیوڈور ماریسن نے نیابتی ادارات کی سخت مخالفت کی اس نے لکھا کہ " ہم نے ہندوستان میں کبھی ایک قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی اور نیک نیتی کے ساتھ جو ادارات قائم کئے ہیں ان میں انتشاری رجحان پایا جاتا ہے[۱۲] ہندوستان میں آزاد ادارات کی ترویج سے ٹکڑوں میں تقسیم اور اختلاف پیدا ہوا[۱۳] کوئی عقلمند آدمی یہ اُمید نہیں کر سکتا کہ جو فرقے روزمرہ ایک دوسرے کے خلاف لڑائی جھگڑوں میں برسرپیکار رہیں۔ انتخابات کے وقت اختلافات کو بالائے طاق رکھکر انتخابات سیاسی اصول پر لڑیں گے[۱۴]"

---

[۱۰] ہندوستان میں شہنشاہی حکومت از تھیوڈور ماریسن صفحہ (۹)

[۱۱]	ایضاً	ایضاً	ایضاً صفحات (۶ و ۷)
[۱۲]	ایضاً	ایضاً	ایضاً سفحات (۷ و ۸)
[۱۳]	ایضاً	ایضاً	ایضاً صفحہ (۲۹)
[۱۴]	ایضاً	ایضاً	ایضاً صفحہ (۳۴)

مجالس بلدیہ کے لئے جب انتخابات شروع ہوئے تو ہندو مسلم فسادات بھی شروع ہوئے[۳۲]۔ اس کے علاوہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں قومی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی[۳۳]۔ تھیوڈور ماریسن نے لکھا ہے کہ حالیہ چند سالوں سے حکومت کی پالیسی سے بالعموم ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی[۳۴]۔ علاوہ ازیں نیابتی ادارات کے لئے سیاسی جماعتیں ضروری ہیں اور چونکہ ہندوستان میں نسل و مذہب میں اختلاف ہے اور جماعتیں انہی بنیادوں پر قایم ہونے لگیں لہذا کشیدگی بڑھنے لگی[۳۵]۔

ہندوستان میں نیابتی ادارات کی ترویج سے بڑی مشکلات پیدا ہورہی تھیں ملک کے مختلف طبقات کی رفتار ترقی مساوی نہ تھی اور نہ معاشی اور تعلیمی حالات میں یکسانیت تھی جس کی وجہ سے ان ادارات کی ترویج میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔ لارڈ ڈفرن نے ہندوستان کے معاشی سماجی اور سیاسی حالات کا اس طرح جائزہ لیا ہے[۳۶]۔ یہاں کی آبادی میں بکثرت نمایاں قومیتیں ہیں جو مختلف المذاہب ہیں اور جن کے رسوم علیحدہ علیحدہ ہیں اور جو مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ آبادی میں ایک دوسرے سے اختلاف اور تعصب پایا جاتا ہے۔ یہاں کی آبادی میں دو زبردست سیاسی فرقے ہندو اور مسلمان

---

[۳۲] ہندوستان میں شہنشاہی حکومت از تھیوڈور ماریسن صفحات ۲۶ تا ۲۷

[۳۳] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷

[۳۴] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۱۷

[۳۵] ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۱۳

[۳۶] ان ٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ شائع شدہ ۱۹۱۸ء صفحہ (۱۹)

ہیں جن کے مذاہب۔ تاریخی روایات۔ سماجی تنظیم۔ فطری رجحانات وغیرہ میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اپنی حکومت کی یاد تازہ ہے جبکہ وہ دہلی اور ہمالیہ سے لیکر جنوبی ہند تک حکومت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی قومیں ہیں جو سیاسی اور لسانی اعتبار سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرح مختلف النوع ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں ہے۔ سکھ۔ پارسی۔ روہیلے۔ پٹھان۔ بلوچی۔ آسامی وغیرہ اس کے علاوہ سرحد کے قبائل اور برما کے منگولی اپنا علیحدہ مذہب و تمدن رکھتے ہیں۔ گونڈ۔ بھیل اور دیگر غیر آریائی قومیں دکن میں رہتی ہیں۔ ان فرقوں میں تمدن کا ہر درجہ ملتا ہے جس سے انسانیت ما قبل تاریخ سے گزر کر آج تک آئی ہے ایک طرف ننگے وحشی پہاڑی قبائل ہیں جو پتھر سے شکار کرتے ہیں اور توہمات میں مبتلا ہیں تو دوسری طرف یوروپی رنگ میں ڈھلا ہوا ہندوستانی جس کا لباس انگریزی اور جس کے جمہوری خیالات ہیں جو مغربی علوم اور فلسفے سے دلچسپی رکھتا ہے۔ بعض ایسے بھی فرقے ہیں جو ابھی خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں اور جن میں قبائلی نظام مروج ہے۔

ان حالات سے واضح ہوتا کہ نیابتی ادارات کی ترویج سے ایک تو ہندوستان کے مختلف فرقے جات اپنی تعلیمی پستی اور جہالت کی وجہ سے گھبرانے لگے تو دوسرے خود حکومت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر فرقے اور خصوصاً اقلیتوں کی نیابت کے مسائل اہمیت پکڑنے لگے۔ جمہوری ادارات کی ترویج سے مسلمانوں کو یہ خوف تھا کہ ہندو راج قائم ہو جائیگا۔ بہر کیف مسئلہ اقلیت کی حقیقی بنیادیں ہندوستان میں نیابتی ادارات کے آغاز نے ڈالی ہیں۔ تھیوڈو ماریسن ان ادارات کے سخت مخالف تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا حل یہ ہوگا کہ

برطانوی شاہی سے ان کی وفاداری استوار کی جائے[۳۷]۔ ان کا خیال تھا کہ شاہی کا کام ان منتشر عناصر کی شیرازہ بندی کرنا ہے جن پر وہ حکومت کرتی ہے۔ شاہی کے اداروں کی قدر و قیمت دیسی ریاستوں کی حکومتوں سے واضح ہوتی ہے[۳۸]۔ وہ ہندوستانیوں کے شاہ پرستی کے جذبہ کو ملکۂ انگلستان سے وابستہ کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے مختلف فرقوں کو جو آپس میں بٹے ہوئے تھے وفاداری کے مشترکہ مرکز پر لانا چاہتے تھے۔ بجائے اس کے کہ نیابتی ادارات کی توسیع کی جائے لیکن مورس کے اس حل سے ہندوستانیوں کی آزادی کا جذبہ اور تحریک قومیت بے جان ہو کر رہ جاتی۔

۳۷؎ ہندوستان میں شہنشاہی حکومت۔ صفحہ ۴۵۔

۳۸؎ ایضاً ایضاً صفحہ ۴۷۔

بابِ دوم

اوائل بیسویں صدی میں برطانوی سامراج کو ہندوستان میں خطرہ اور فرقہ واریت کی تبدیلیاں

اوائل بیسویں صدی میں ایک تو ہندوستان کی نراجی اور انقلابی تحریکیں اور دوسرے بین الاقوامی سیاسیات کے پیچ وتاب برطانوی سامراج کے لئے پر خطر تھے۔
ہندوستان کی افقِ سیاست پر پھر سے انقلابی گھٹائیں چھانے لگیں کانگریس کی قوت میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا۔ کانگریس میں تاجر طبقہ گھس آیا تھا جو تامین تجارت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمان تاجر اور پیشہ ور طبقات کے اتحاد کے امکانات پیدا ہو چکے تھے ڈفرن اور کرزن کے عہد میں کانگریس کی انتہا پسندی کی آہستہ

نشو و نما ہونے لگی۔ کرزن نے ایک مرتبہ وزیر ہند کو لکھا کہ ہندوستان میں میرا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ کانگریس کی پرسکون موت میں ہاتھ بٹاؤں[1]۔ اس زمانہ میں بال گنگا دھر تلک نے ہندوؤں میں انقلابی خیالات کا پرچار شروع کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ہندوستان میں قحط کے ساتھ پلیگ نمودار ہوا تو انقلابیوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر عوام کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنا شروع کیا۔ یہ پروپگنڈا کیا جانے لگا کہ انگریز ہندوستان کی آبادی کم کرنے کی خاطر ملیریا اور پلیگ پھیلاتے ہیں[2]۔

تلک نے ورزشی جماعتیں قائم کیں جس میں طالبعلموں کو انقلابی تربیت دی جاتی تھی۔ حکومت کے اکثر قوانین کی مخالفت ہو رہی تھی۔ اسلحہ و ہتیار جمع کئے جانے لگے۔ اس غرض کے لئے باقاعدہ چندہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ تو سر اینڈریو فریزر جس ریل میں سفر کر رہا تھا پٹری سے اتار دی گئی دوسری مرتبہ اس پر گولی چلائی گئی مظفرپور میں دو انگریز عورتوں کا قتل عمل میں آیا۔ مغربی اشیاء کے استعمال کے خلاف بائیکاٹ کا پرچار کیا گیا اور سودیشی تحریک زور و شور پر جاری ہوئی ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کے کانگریس کے اجلاسوں میں بائیکاٹ کی تائید میں قرار دادیں منظور ہوئیں۔

انتہا پسند کانگریسیوں کی ایک جماعت نے لندن میں ایک "انڈیا ہاؤز" قائم کر رکھا تھا۔ اس کے بانی شیاماجی ورما تھے۔ یہ جماعت انقلابی

---

[1] بحوالہ سوانح حیات لارڈ کرزن جلد دوئم از رونالڈ شے صفحہ ۱۵۱۔

[2] ہندوستانی خلفشار صفحہ (۲۱)

پروپگنڈے کا مرکز بن گئی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکم جولائی ۱۹۰۹ء کو امپیریل اِنسٹی ٹیوٹ لندن میں ایک انگریز کرزن وِلی اور ایک پارسی ڈاکٹر لال کاکا کا قتل عمل میں آیا۔ یہ جماعت ایک پرچہ بھی نکالا کرتی تھی اور خفیہ سازش کا مرکز بن گئی تھی۔[۳] بھدرا لوک جماعت ہندوؤں میں اِنقلابی پروپگنڈہ کر رہی تھی۔ سوامی ویواکنندا نے جو شکاگو کی مذہبی کانفرنس میں ہندومت کی نیابت کر چکے تھے۔ ہندوستان اگر قومیت کی تعلیم دینا شروع کر دیا تھا اور مذہبی قومیت کا پرچار شروع کر دیا تھا۔[۴] بھگوت گیتا کی اِشاعت اور تبلیغ کی جا رہی تھی۔ میزنی اور گریبالڈی کے خیالات اُن کی سوانح عمریوں کے ذریعہ مقبول ہونے لگے اِنقلابی اور سازشی طریقوں سے عوام کو روشناس کروایا جا رہا تھا۔[۵] ہندو اساتذہ بھی عوام میں اِنقلاب کی تعلیم دیتے تھے دھاکواشیاء پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ انگریز عہدہ داروں پر اکثر مقاموں پر حملے ہونے لگے۔ ۱۹۰۷ء میں نراجی تحریک پنجاب میں بھی شروع ہو گئی پنجاب کے اکثر شہروں میں تعلیم یافتہ طبقہ علانیہ انگریزوں کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ سکھوں کو بھی انگریزوں کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔[۶] ہندوستانی سپاہیوں اور پولیس کے جوانوں کو ملازمت چھوڑنے پر مائل کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان سے انگریزوں کو نکال

---

[۳] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ششم صفحہ ۲۵۲

[۴] ایضاً صفحہ ۵۵۱

[۵] ایضاً صفحہ ۵۵۲

[۶] ایضاً صفحہ ۵۵۳

باہر کرنے کی شد و مد سے جد و جہد جاری تھی۔ لاہور اور راولپنڈی میں سخت فسادات ہوئے۔ لالہ لاجپت رائے اور راجیت سنگھ کو گرفتار کرکے جلا وطن کر دیا گیا۔ پنجاب میں زرعی اصلاحات کی عام مخالفت ہو رہی تھی۔ اس سے فایدہ اٹھا کر عوام کو انگریزوں کے خلاف اُچھالا جانے لگا۔ صوبہ متحدہ میں بھی خفیہ طور پر سازش جاری تھی[1]۔ ہندوستان کا پریس بے لگام قلم دوڑا رہا تھا جس کی وجہ سے حکومت نے پریس کے اختیارات پر تحدید عاید کی۔ بنگال میں بیروزگاروں اور مفلسوں کو حکومت کے خلاف مشتعل کیا جا رہا تھا[2]۔

دکن میں مسٹر تلک کا بڑا اثر تھا انھوں نے قومی مدارس کے قیام کی مہم شروع کی۔ جس کا مقصد طالبعلموں کی سیاسی تربیت تھی۔ ۱۲ مئی اور ۹ جون ۱۹۰۸ء کو تلک نے اپنے اخبار "کیسری" میں مظفر پور کے قتل عام پر مضمون لکھا اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جب حکومت کا طرز عمل ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اس وقت عوام بغاوت کر دیتے ہیں۔ بعد میں مسٹر تلک کو ملک معظم کی رعایا میں بدامنی اور اشتعال پھیلانے کے الزام میں گرفتار کرکے جلا وطن کر دیا گیا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں یہ ساری بے چینی کرزن کی تعلیمی پالیسی اور تقسیم بنگالہ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ تقسیم بنگال کے بعد بنگال میں دہشت انگیز تحریک شروع ہوئی۔ قتل و خون عام ہونے لگا۔ تقسیم بنگالہ کے بعد بنگال کے

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد ششم صفحہ ۵۵۳
[2] ایضاً " صفحہ ۵۵۹۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہوئی۔ مسلمان تقسیم کی تائید کر رہے تھے اور ہندو اس کے سخت مخالف تھے۔ ہندوؤں نے سمجھا کہ تقسیم بنگالہ کے ذریعہ حکومت قومی تحریک پر ضرب لگانا چاہتی ہے۔ ہندو انقلاب پسند طبقے نے خفیہ جماعتیں بنانا شروع کیں۔ اسلحہ جمع کئے جانے لگے۔ بموں کی تیاری عمل میں آ رہی تھی۔ لارڈ منٹو نے نومبر ۱۹۰۷ء کو اپنی مجلس مقننہ میں کہا کہ نہ صرف فوج میں بغاوت پھیلائی گئی ہے بلکہ سرحدی قبائل کو بھی مشتعل کر دیا گیا ہے[۹]۔ طالب علموں میں کافی بے چینی پائی جاتی تھی۔ یہ مغربی تعلیمی نظام کا نتیجہ تھا[۱۰]۔ اس زمانہ میں اشیاء کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا جس سے اہلکار، استاد اور حکومت کے ادنیٰ عہدے دار بری طرح متاثر ہوئے اس وقت جبکہ ایک تجارتی طبقہ وجود میں آ رہا تھا۔ امپیریل حکومت کی پالیسی غیر ہمدردانہ تھی[۱۱]۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کیساتھ جو سلوک کیا گیا اس کی وجہ سے جذبات برانگیختہ ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی داخلی بے چینی کو بین الاقوامی سیاسیات سے شہ پہنچ رہی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں حبشہ کی اٹلی پر فتح نے ایشیائی ممالک کی ہمتوں کو بلند کیا۔ تین صدی بعد پہلی مرتبہ ایک مشرقی فوج کو مغربی فوج پر فتح حاصل ہوئی[۱۲]۔ جاپان کی روس پر فتح۔ چین و ایران کی انقلابی تحریکیں یہ سب ہندوستانی سیاسیات کو متاثر

---

[۹] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۱۲-۵۱۳۔

[۱۰] ہندوستانی قومیت (ر) صفحہ ۲۲۰۔

[۱۱] ایضاً ایضاً

[۱۲] ایضاً صفحہ ۱۱۰۰

کئے بغیر نہ رہ سکیں[۱۳]۔

اس کے علاوہ ہندوستان کے باہر بھی حکومت برطانیہ کے خلاف سازش ہو رہی تھی۔ امریکہ میں ہندوستانیوں نے انقلابی جماعتیں بنانا شروع کیں ان کا مرکز کیلی فورنیا تھا اور اس کی شاخیں نیویارک اور شکاگو میں تھیں بنگالی طالبعلموں نے کینیڈا سے ایک اخبار "آزاد ہندوستان" نکالا کینیڈا میں بنگالی شورش پسند جماعت نے آئیرستانی شورش پسندوں سے میل جول پیدا کر لیا تھا۔ اکثر اشتعال انگیز مضامین امریکہ میں شائع ہو رہے تھے جاپان میں انڈو جاپانی جماعت کام کر رہی تھی۔ پیرس۔ جنیوا برلن اور نیویارک میں بھی سازشی جماعتیں برسر عمل تھیں[۱۵]۔

ایک طرف تو یہ حال تھا دوسری طرف بین الاقوامی معاملات حکومت برطانیہ کو پریشان کر رہے تھے۔ یہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے قبل کا زمانہ ہے۔ جبکہ اس جنگ کے اسباب فراہم ہو رہے تھے۔ قیصر ولیم دوم کی اقدامی حکمت عملی نے حکومت برطانیہ کو پریشان کر رکھا تھا۔ برلن بغداد ریلوے کی اسکیم ہندوستان کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔ خلیج فارس کی سیاست بھی برطانوی سامراج کے لیے تشویش کا باعث بن رہی تھی۔ خلیج فارس میں جرمن۔ فرانسیسی اور روسی اثرات کام کر رہے تھے۔ روس کی وسط ایشیا اور ایران کے ساتھ حکمت عملی سے بھی حکومت برطانیہ کو تشویش کا سامنا کرنا تھا۔ بہرکیف سامراج کو ایک شدید خطرہ لاحق تھا۔ ایسے حالات میں

۱۳؎ یادو اشتیں (ڈائری) از وائی کونٹ مارلے جلد دوم صفحہ ۱۵۴۔

۱۵؎ ہندوستانی خلفشار صفحات ۱۴۸ تا ۱۵۰۔

ہندوستان میں بھی بے چینی تھی۔ ظاہر ہے کہ باغی ہندوستان کسی طرح جنگ میں حکومت برطانیہ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ ایک تو ہندوستان میں ان کا اقتدار اعلیٰ برقرار رہے اور دوسرے ہندوستانیوں کو اصلاحات کے ذریعہ سے مطمئن کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے منٹو اور مارلے نے ہندوستانی سیاسیات میں فرقہ واریت کی تخم ریزی کی اور قومی تحریک کو ہندو مسلم مسئلہ سے کمزور کرنے کی کوشش کی۔

چنانچہ ان حالات سے واضح ہوگا کہ بیسویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان میں انقلابی ماحول پیدا ہو چکا تھا جو غدر سے زیادہ بھیانک پس منظر کا حامل تھا۔ کچھ تو تعلیم یافتہ طبقے کی بڑھتی ہوئی قوت اور کچھ بین الاقوامی سیاست کے اثرات اور سب سے زیادہ کرزن کی تعلیمی پالیسی اور تقسیم بنگالہ نے قومی تحریک کو قوت بخشی تھی۔ ہندوستان کا ایک کثیر تعلیم یافتہ طبقہ ملٹن، برک، مل اور اسپنسر کے خیالات سے متاثر تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک زبردست اثر پیدا کرنے والی قوت موجود تھی اور ان سے اصول آزادی، قومیت اور حکومت خود اختیاری کے متعلق معلومات حاصل ہوتی تھیں[۱]۔ تعجب نہیں کہ ہندوستانی ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے متاثر ہوئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ غدر کا خونی ڈرامہ پھر سے کھیلا جائے گا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے لارڈ منٹو کو یہ سمجھکر ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا تھا کہ وہ ہندوستان جاکر تعلیم یافتہ طبقے سے اچھے تعلقات قایم کرے گا[۲]۔ ہندوستان آنے سے قبل

---

[۱] تقاریر مارلے ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۹ء۔ تقریر ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۴۸۔

[۲] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ششم صفحہ ۵۶۰۔

اُس نے انگلستان میں کہا تھا کہ وہ ہندوستان کے تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کو وقتاً فوقتاً آرام دینا چاہتا ہے[۱۷]۔ اس نے بڑی حد تک تعلیم یافتہ طبقے کے بے چین قلوب کو طمانیت پہنچا دی۔ اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس نے فوری بحران کا مقابلہ کیا[۱۸]۔ منٹو اپنے گرد (۲) قسم کی بے چینی کی لہریں دیکھ رہا تھا۔ ایک لہر اس طبقے کی تھی جو مغربی علوم حاصل کر چکا تھا اور حکومت میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ دوسری لہر انقلابی اور نراجی تھی۔ ان دونوں کو نظر انداز کرنے سے دھماکہ یقینی تھا[۱۹]۔ چنانچہ انھیں حالات کو دیکھتے ہوئے لارڈ مارلے نے لیڈی منٹو سے کہا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ کسی وائسرائے کے کندھوں پر اتنی بھاری ذمہ داری جب سے کہ ہندوستان تاج کے تحت آیا ہے رکھی گئی[۲۰]۔ مارلے نے ۳۱ر جنوری ۱۹۰۸ء کو دارالعلوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم نے پریشان کن زمانے میں ہندوستان کے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ ہم زبردست مشکلات کے وقت آئے جن کو کہ ہم نے پیدا نہیں کیا۔ ان دو سالوں میں ہندوستان کے اُفق پر کالے اور گھنے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہماری پالیسی سے ایک حد تک وہ بادل چھٹ گئے ہیں[۲۱]۔ اِن حالات سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج ہندوستان میں ایک

۱۷ء لارڈ منٹو از بک ہیں صفحہ ۳۱۸

۱۸ء ایضاً صفحہ ۳۲۲

۱۹ء ایضاً صفحہ ۳۲۰

۲۰ء ایضاً صفحہ ۳۵۷

۲۱ء تقاریر مارلے صفحات ۵۵ تا ۵۶

پرخطر دور سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ مارلے نے پریشانی میں منٹو کو لکھا "اگر اصلاحات حکومت کو نہیں بچا سکتے تو کوئی قوت نہیں بچا سکتی[۲۲]" اس کا جواب منٹو نے یہ دیا "جب تک کہ انگریز نسل باقی ہے ہمارا راج ہندوستان پر سے ختم نہیں ہوگا کیونکہ ہم اس کے لئے شدت سے لڑیں گے . . . . اور ہمیشہ کی طرح اب بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ ہم کو وہ وقت [illegible] دیکھنا نہ پڑے[۲۳]" وزیر ہند لارڈ مارلے نے منٹو کو متنبہ کر دیا تھا کہ ہم کو ہر ایک شخص دھمکا رہا ہے کہ "ہندوستان میں ایک نئی اسپرٹ پیدا ہو رہی ہے . . . . تم اسی اسپرٹ میں حکومت نہیں کر سکتے۔ تم کو کانگریس جماعت اور کانگریس کے اصول سے مقابلہ کرنا ہوگا . . . . . یقین رکھیئے کہ مسلمان تمہارے خلاف کانگریس میں شریک ہو جائیں گے[۲۴]" حکومت برطانیہ کانگریس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھی۔ چنانچہ لارڈ کرزن نے کانگریس کے اثرات کو متوازن کرنے کے لئے "کونسل آف پرنسس" کی تجویز پیش کی تھی[۲۵] لارڈ منٹو نے بھی اپنے ایک مکتوب میں وزیر ہند کو لکھا تھا کہ "میں ابھی کافی غور و خوض کر رہا تھا کہ کانگریس کے مقاصد کے لئے ایک ممکنہ توازن قائم کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کا حل کونسل آف پرنسس میں دریافت کر سکتے ہیں[۲۶]" ظاہر ہے کہ حکومت کانگریس سے گھبرا کر اس میں

---

۲۲ لارڈ منٹو از بک ہین صفحہ ۲۷۷

۲۳ ایضاً صفحہ ۲۷۷ تا ۲۷۸

۲۴ ڈائری مارلے جلد دوم صفحات ۱۷۳ تا ۱۷۴

۲۵ ایضاً صفحہ ۱۷۶

۲۶ ہندوستان۔ منٹو اور مارلے ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۰ء از کرسٹن آف بیٹو صفحہ ۲۹۔

انتشار پیدا کرنا چاہتی تھی۔ حکومت کو یہ بھی خوف تھا کہ کہیں اور زیادہ تعداد میں تعلیم یافتہ طبقہ کانگریس میں شریک نہ ہو جائے۔ چنانچہ منٹو لکھتا ہے کہ صرف کانگریس ہی بہت زیادہ اہم عنصر نہیں جس کا ہم کو سامنا کرنا ہے بلکہ تعلیم یافتہ طبقے کی بڑھتی ہوئی طاقت جو بالکل وفادار اور معتدل خیال ہے اور جو بجا طور پر حکومت میں شریک ہونے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جماعت سے ہم زبردست امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر اس کے وجود کو تسلیم نہ کریں تو یہ جماعت کانگریس لیڈروں کے ہاتھ لگ جائے گی اور کانگریس کو مجبوراً اپنا نجات دہندہ تصور کرے گی[۱۲۷] یہی وجہ ہے کہ حکومت تعلیم یافتہ طبقہ اور مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی بلکہ کانگریس پر ان کے ذریعہ سے ضرب لگانا چاہتی تھی۔ سورت کانگریس میں کانگریس کی دو جماعتوں میں اختلافات پیدا ہوئے تو مارلے نے منٹو کو مشورہ دیا کہ ان میں سے ایک جماعت کو اپنے ساتھ ملا لو۔ گوکھلے اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہہ کر کہ ملک میں تمہارا ساتھ دینے والا کوئی نہیں اور نئی نسل کو یہ کہتے ہوئے کہ قابل اصحاب تمہارے خلاف ہیں ختم کیا جا سکتا ہے[۱۲۸] مارلے یہ جانتا تھا کہ حکومت برطانیہ کے لئے کافی خطرات ہیں[۱۲۹] وہ ہندوستانی حالات سے بہت پریشان تھا چنانچہ اس نے منٹو کو لکھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں وھائیٹ ہال میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوں۔

۱۲۷؎ منٹو مارلے صفحہ ۱۰۴

۱۲۸؎ ڈائری مارلے جلد دوم صفحہ ۲۳۶

۱۲۹؎ ایضاً صفحہ ۲۸۵

جبکہ ہندوستان میں گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔

بہرکیف بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سامراج کو زبردست خطرہ لاحق تھا۔ کانگریس طاقتور ہو چکی تھی۔ تعلیم یافتہ طبقہ بغاوت پر مائل تھا ظاہر ہے کہ سیاسی تحریکوں کو ٹھکانہ پر نہ لگایا جاتا تو انقلابی راستہ اختیار کرتیں[۱۳۰] یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور تعلیم یافتہ طبقے کو حکومت میں جگہ دینے کی حمایت کی گئی۔ حکومت برطانیہ نے بروقت انتہا پسندوں کی قوت توڑنے کے لئے تعلیم یافتہ طبقے کی حمایت کی اور توازن قایم کیا۔ چنانچہ اِس انقلابی طوفان کو ٹھنڈا کرنے کا سہرا لارڈ منٹو کے سر ہے جس نے قومی تحریک کو انقلاب اختیار کرنے سے روک دیا۔

اِن حالات کا مقابلہ برطانوی مدّبرین نے ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالکر کیا۔ غدر نے جو سبق دیا تھا اس کی وجہ سے ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے خلاف اور ایک مفاد کو دوسرے مفاد کے خلاف اور ایک جماعت کو دوسری جماعت کے خلاف کامیابی کے ساتھ کھڑا کیا گیا[۱۳۱] جبکہ ہندوستان میں کانگریس طاقتور ہو رہی تھی تو منٹو نے مسلمانوں کو کھڑا کیا اور اس طرح سے مسئلہ اقلیت پیدا ہوا[۱۳۲]۔ برطانوی سامراج کو استحکام پہنچانے کی خاطر منٹو نے مسلمانوں کی تائید کی اور فرقہ وارانہ نیابت کی بنیادیں رکھیں۔

(جب آغاخاں کے وفد نے وائسرائے کی خدمت میں اپنا مشہور ایڈریس

---

۱۳۰ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ششم صفحہ ۵۶۰

۱۳۱ اقلیتوں کا مسئلہ از کے۔ بی کرشنا صفحہ ۹۰

۱۳۲ ایضاً صفحہ ۱۳۲

پیش کیا تو حکومت برطانیہ کو اطمینان قلب نصیب ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں کو انقلابی صفوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ چنانچہ ایڈریس کے جواب میں منٹو نے کہا "میں آپ کا ایڈریس سن چکا۔ مجلس بلدیہ مقننہ وغیرہ میں آپ مسلم فرقہ کی نیابت بہ حیثیت فرقہ چاہتے ہو۔ آپ کہتے ہیں کہ انتخابی جماعتوں سے ایک مسلم امیدوار کے منتخب ہونے کی بھی امید نہیں اور اگر ایسا امیدوار منتخب ہو کر آئے تو دوسرے فرقے کے زد پہ آئیگا۔ آپ بجا طور پر مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ کی حیثیت آپ کی تعداد پر منحصر ہو بلکہ آپ کے فرقے کی سیاسی اہمیت کے مطابق ہو اور وہ خدمات جو کہ آپ نے سلطنت کے لئے انجام دی ہیں۔ ہندوستان میں انتخابی نیابت کا طریقہ ناکام ہوگا۔ اگر ہندوستان کے فرقوں کی روایات اور عقائد کا خیال نہ رکھا جائے۔ ہندوستان کا کثیر طبقہ نیابتی ادارات سے واقف نہیں ہے[۳۳]" بالآخر منٹو نے مسلمانوں کو کہا "آپ اطمینان رکھیئے کہ میں آپ کے سیاسی حقوق اور مفادات کے تحفظ کی کوشش کرونگا اور آپ برطانوی راج پر بھروسہ کریں[۳۴]"

بہرکیف منٹو کے اس جواب سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی ساری مہربانیاں مسلمانوں کے ساتھ ہوگئیں تھیں۔ چنانچہ جس دن آغاخاں کے وفد نے وائسرائے کے پاس اپنا ایڈریس پیش کیا اسی دن ایک عہدہ دار نے میری منٹو کے پاس ایک خط روانہ کیا جس میں اس نے

---

[۳۳] منٹو اور مارلے صفحہ ۴۶

[۳۴] ایضاً ایضاً صفحہ ۴۶

لکھا :" آج ایک زبردست چیز وقوع پذیر ہوئی ہے۔ یہ تدبر کا ایسا کارنامہ ہے جو ہندوستان اور تاریخ ہند کو کئی سال تک متاثر کرے گا۔ آج چھ کروڑ بیس لاکھ آدمیوں کو مخالف سازشی صفوں سے کھینچ لیا گیا ہے[۳۵]۔"

اس وفد کی اطلاع کے بعد ہی مارلے نے اپنے ایک مکتوب بنام منٹو مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں اطمینان بخش حالات پر مسرت کا اظہار کیا اور لکھا کہ اب مسئلہ آسان ہو گیا ہے[۳۶] مسلمانوں کے جذبات کی ستائش کی گئی اور ہندوؤں کو باغی قرار دیا گیا۔ بہرکیف مسلمانوں کے مطالبات سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔ منٹو کی جوابی تقریر کے متعلق بکہیں نے لکھا ہے کہ "بلاشبہ اس تقریر نے باغیوں کی صف میں مسلمانوں کو شریک ہونے سے روک دیا یہ آئندہ مصیبتوں کے آنے والے زمانے کے لئے زبردست فائدہ ہوا[۳۷]"۔ چنانچہ اس طرح منٹو نے ہندوستان کی انقلابی اور نراجی تحریکوں پر قابو پا لیا اور بغاوت میں حصہ لینے سے روک دیا۔ منٹو کی یہ کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ چنانچہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا "پھر جس سے ہم اندھے ہو گئے تھے غائب ہو رہی ہے اور سورج پھر سے چمکنے لگا ہے[۳۸]۔"

فرقہ واری مسئلہ کی سامراجی اہمیت کا اندازہ وزیر ہند مارلے کی

---

۳۵ منٹو اور مارلے۔ صفحات ۴۷ تا ۴۸

۳۶ ایضاً صفحہ ۴۸

۳۷ لارڈ منٹو از بکہیں صفحہ ۲۴۳

۳۸ منٹو اور مارلے صفحہ ۴۵۰

اس تقریر سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کہ اس نے جنوری ۱۹۰۸ء کو انڈیا آفس میں کی تھی۔ اس نے کہا "مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ...... یہ شبہ ہو جاتا کہ ہم ہندوستان میں مسلمانوں سے ناانصافی کر رہے ہیں قسطنطنیہ میں زبردست اور ضرر رساں ردعمل ہوگا۔"[۳۹] معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بین الاقوامی حیثیت کی وجہ سے بھی ان پر مہربانیاں کی جا رہی تھیں اس زمانے میں دول یورپ سلطنت عثمانیہ اور اس کے مقبوضات پر نظر لگائے بیٹھی تھیں۔ دول یورپ میں مشرقی مسئلہ کی بابت آپس میں رقابت جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں حکومت برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو برہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تائید سے سلطنت عثمانیہ میں حکومت برطانیہ کے لئے فضا سازگار کرنا مقصود ہو۔ چنانچہ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں بھی درج ہے کہ "۱۹۰۶ء میں مارلے اور منٹو نے اصلاحات کا جو اقدام اٹھایا اس کے محرکات کچھ داخلی اور کچھ خارجی تھے۔"[۴۰] ایسے حالات میں اصلاحات کے ذریعہ ہندوستان کی سیاسی آگ بجھائی گئی اور فرقہ واریت پیدا کرکے آئندہ انقلابی تحریکوں کو روکنے کی خاطر تدارک کیا گیا۔

ان حالات سے علانیہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک تو قومی تحریک کو کمزور کرنے کی خاطر مسلمانوں کی تائید کی گئی۔ تاکہ ان کو اس میں شریک ہونے سے روک دیا جائے دوسرے بین الاقوامی سیاست

۳۹۔ تقاریر مارلے صفحہ ۱۰۱۔

۴۰۔ مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ صفحہ ۴۲۔

انگریزوں کو پریشان کر رہی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کی نراجی تحریکوں کو اصلاحات کے ذریعہ ختم کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کو برہم نہیں کرنا چاہتے تھے اِس لئے کہ اس زمانہ میں انگلستان کو سلطنت عثمانیہ کے مسائل سے دلچسپی تھی۔ انھیں حالات نے انگریزوں کو مسلمانوں کی تائید پر مجبور کیا اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں کے مطالبات کو پورا کیا اور دستور میں فرقہ واریت کی ابتداء کی گئی۔

بابِ سوم

مسلمانوں کے مطالبات اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات

قومیت کی جو تحریک بیسویں صدی کے اوائل میں چل رہی تھی اس میں ہندو ہی شریک تھے۔ آریہ سماج تحریک کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندومت کے احیاء کی کوشش شروع ہوئی۔ بظاہر ہندومت کے احیاء کی تحریک سماجی تھی لیکن اس کے پس پردہ سیاسی مقاصد کام کر رہے تھے۔ ہندوؤں نے ۸۔ ۹ صدی سے آزادی کی فضا میں سانس نہیں لی تھی، چنانچہ انگریزی حکومت کا جوا اتار پھینکنے کی شدید جد وجہد جاری تھی۔ یہ ایک فطری جذبہ تھا۔ ہندوستان کی حصول آزادی کے لئے بلاشبہ ہندوؤں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ سیاسی قوت اور آزادی ہر قوم و جماعت کو

عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ انگریزی راج کے خلاف ممکنہ جدوجہد کی گئی۔ (جس کا تذکرہ گزشتہ باب میں ہوچکا ہے) مسٹر تلک مہاراشٹرا میں مرہٹوں کی تنظیم کر رہے تھے اور عوام کو حکومت کے خلاف آمادہ کر رہے تھے مہاراشٹرا اور بنگال شورش کے مرکز تھے۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ حکومت کرنا ان کا پیدائشی حق ہے۔ مرہٹے یہ سمجھتے تھے کہ اگر انگریز ہندوستان نہ آتے تو پیشواؤں کی حکومت ہوتی بنگالی اپنی تعلیم پر نازاں تھے اور خیال کرتے تھے کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد ان کو اقتدار حاصل ہوگا۔ ہر فرقے کو یہ فکر لاحق تھی کہ انگریز ہندوستان چھوڑنے کے بعد کیا ہوگا؟ آزادی کی جو تحریک جاری تھی اس سے مسلمانوں نے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا۔ ان کو یہ گھبراہٹ تھی کہ اگر ہندوستان آزاد ہوجائے تو مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائینگے نہ صرف ہندوؤں کو تعدادی برتری حاصل تھی بلکہ وہ تعلیمی اور معاشی حالت میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ آگے تھے۔ تعلیم اور قابلیت کے اعتبار سے بھی ہندو حکومت کرنے کے اہل تھے۔ اس کے برخلاف مسلمان ایک تو تعلیم میں پست تو دوسرے معاشی ابتری کا شکار تھے۔ اس قوم کی اس تباہی میں کچھ تو خود اس کی غلطی تھی کہ اس نے انگریزی تعلیم سے انحراف کیا اور ماحول سے بغاوت کی اور کچھ حکومت بے اعتنائی برت رہی تھی بعض ہندو لیڈر مسلمانوں کو یہ بھی دھمکی دینے لگے تھے کہ جس طرح مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکالا گیا اسی طرح ہندوستان سے نکالا جائے گا۔ چنانچہ ایک مسلمان نے اپنے ایک مکتوب بنام شبلی رد میں لکھا ہے کہ پنجاب اور بنگال ہر جگہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ کی طرح ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالا جائے گا۔ آنے والے ۵۰ یا ۱۰۰ میں مسلمان ہندوؤں کے غلام

ہو جائیں گے۔ گوکھلے کی ترقی پسند جماعت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب دوسرے لوگوں کا راج ہے مسلمانوں کا جو حشر ہسپانیہ میں ہوا ہندوستان میں بھی وہی ہونے والا ہے[1] اس قسم کا جذبہ ہندوؤں میں پیدا ہونا کوئی تعجب نہ تھا۔ حکمران قوم کے خلاف محکوم قوم انتقامی جذبات سے کام لیتی ہے۔ آزادی ہر قوم کو عزیز ہوتی ہے لیکن مسلمان پریشان تھے۔ ان کے لئے یہ بڑا ہی نازک زمانہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستان آزاد ہوگا تو مسلمان ہندوؤں کے محکوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب تقریباً سارے ہندو انگریزوں کے خلاف برسر عمل تھے تو مسلمانوں نے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ سر سید احمد خاں نے بھی ان کو سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے سے منع کیا تھا۔ جب ہندو مت کا احیاء ہونے لگا اور ان کی مذہبی قومیت تشدد کا راستہ اختیار کرنے لگی تو مسلمانوں نے گھبرا کر انگریزوں کا دامن پکڑا۔ اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ انگریز مسلمانوں کو ہندوؤں کے تشدد سے بچا سکتے تھے[2] مسلمانوں نے اپنے وجود کو ہندوؤں سے گھبرا کر انگریزوں سے وابستہ کر دیا۔ خود انگریز مسلمانوں کو قومیت کی اس خطرناک تحریک میں شریک ہونے سے روکنا چاہتے تھے جو سامراج کے لئے باعث خطرہ ہو گئی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی عدم مداخلت کی اس حکمت عملی سے قومی تحریک کو نقصان پہنچا۔ مسلمانوں کی مجبوری اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے ان کو اپنا آلۂ کار

لہ ہندوستانی خلفشار صفحہ ۱۲۴

سٹہ ایضاً صفحہ ۱۲۱

بنالیا۔ مسلمانوں کی اس بے بسی اور کمزوری سے حکومت نے زبردست فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ ہندوؤں کو یہ شکایت تھی کہ آزادی کی تحریک میں مسلمان شریک نہیں ہیں جب ہندوؤں کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے درحقیقت خواہاں نہیں تو وہ اُن کے (مسلمانوں کے) مخالف ہوگئے۔

ایک طرف تو یہ حال تھا اور دوسری طرف حکومت کی ملازمتوں اور با اقتدار عہدوں پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ عدالت پریس اور مختلف پیشوں میں ہندوؤں کا تناسب آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ ہندو زندگی کے ہر شعبے میں حاوی تھے اور مسلمانوں کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔

ان حالات کے تحت مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اگر سرسید کی تعلیمات کے بموجب سیاست سے علیحدگی اختیار کی جائے تو مسلمان قوم ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جائے گی۔ سرسید نے تو مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے منع کر دیا تھا۔ اب مسلمان محسوس کرنے لگے کہ ان کے حقوق کی حفاظت کی خاطر ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنائی جائے یہی وہ حالات تھے جو مسلم لیگ کے قیام کے لئے راستہ صاف کر رہے تھے۔ لیکن مسٹر ماریسن علیگڑھ کالج کے پرنسپل کی مخالفت سے مسلمان کوئی سیاسی انجمن تشکیل نہ دے سکے۔ جب وقارالملک نے محسوس کیا کہ علیگڑھ کی سرزمین میں کوئی سیاسی تحریک پنپ نہیں سکتی تو انھوں نے بمقام لکھنؤ ایک ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں انھوں نے بتایا کہ مسلمان روز بروز روبہ تنزل ہیں۔ ان کے سیاسی حقوق پر حملے ہو رہے ہیں۔ کانگریس میں مسلمان

اس لئے نہیں شریک ہو سکتے کہ یہ جماعت نیابتی ادارات اور مقابلے کے امتحانات کی تائید کرتی ہے جو مسلمانوں کے لئے مہلک تصور کئے گئے تھے۔ لہذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک علیحدہ سیاسی جماعت تشکیل دیں چنانچہ محمڈن پولیٹکل ارگنائی زیشن کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ انگریزوں سے وفاداری کا اظہار کرنا بھی تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمان اس قدر مفلس اور بےبس ہو چکے تھے کہ بغیر حکومت کی مالی امداد کے ان کی کوئی تحریک یا انجمن چل نہیں سکتی تھی۔

اس زمانے میں مسلمان اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ ہندوؤں سے اُن کو شکایات ہو سکتی تھیں لیکن اُنھوں نے مخالفت نہیں کی۔ نواب محسن الملک بہادر نے ۲۷ دسمبر ۱۸۹۵ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان میں جب تک ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہمدرد نہ ہوں گے اور آپس میں دوستانہ برتاؤ نہ رکھیں گے اور فراخ حوصلگی اور بے تعصبی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش نہ آویں گے۔ وہ ملکی بھائی اور ہموطن کہنے کے مستحق نہ ہوں گے اور جو کوئی مسلمان ہو یا ہندو باہمی دوستانہ برتاؤ کے قائم رکھنے اور ترقی دینے میں سعی نہ کرے گا وہ درحقیقت ملکی اور قومی گنہگار ہوگا .... بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علیگڑھ پارٹی کے مسلمان ہندوؤں کے مخالف ہیں اور ان کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ دوستانہ نہیں ہیں۔ صاحبو! یہ خیال بالکل غلط ہے اور ہم شمالی ہند کے رہنے والوں پر تہمت ہے

ہم ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہمارا باہمی برتاؤ دوستانہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہیں۔ غالباً یہ خیال ان اختلافات سے پیدا ہوا ہے جو ہماری اور آپ کی بعض پولیٹکل کارروائیوں میں ہیں ...... کسی خاص پولیٹکل مسئلہ میں اختلاف رائے کا ہونا درحقیقت مخالفت نہیں ...... رائے کا اختلاف اور چیز ہے اور مخالفت دوسری بات ہے[۱]"

مسلمانوں کے مطالبات

جب لارڈ منٹو کی حکومت نے اعلان کیا کہ قریب ترین مدت میں ہندوستان کو اصلاحات عطاء کئے جائیں گے تو مسلمان بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ عمومی اصلاحات میں ان کا مقام ہندوؤں سے کم ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اختیارات کی تحویل میں ہندوؤں ہی کا حصہ زیادہ ہو سکتا تھا اس لئے کہ تعلیم اور دولت کے علاوہ وہ تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ کتنا ہی مسلم اقلیت کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جاتا لیکن اختیارات زیادہ ہندوؤں ہی کو دئے جا سکتے تھے[۲] مسلمان جانتے تھے کہ جدید مقننات میں ہندوؤں کو زیادہ نشستیں ملیں گی۔ ان حالات کے مدنظر مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ سیاسیات سے

---

[۱] مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک۔ صفحہ ۲۴۰

[۲] ہندوستانی خلفشار۔ صفحہ ۱۲۸

بالکل بے تعلق رہیں۔ اِس لئے کہ ہندوستان کے حالات اور کونسلوں کی توسیع
نے ان کے لیڈروں کے کندھوں پہ بڑی بھاری ذمہ داری عاید کر دی تھی[5]

چنانچہ ان حالات کے تحت مسلمانوں کے ایک وفد نے سر آغا خاں
کی سرکردگی میں لارڈ منٹو سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ملاقات کی اور مسلمانوں
کے مطالبات کو ایک ایڈریس کی شکل میں پیش کیا۔ اس ایڈریس پر مسلم
امراء۔ زمیندار۔ وکلاء۔ تجار۔ اور مختلف ریاستوں کے مسلم وزراء کے
دستخط تھے۔ اسی وفد نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس ایڈریس
کے پیش کروانے میں مسلمانوں سے کچھ زیادہ حکومت کا ہاتھ معلوم ہوتا
ہے۔ مسٹر آرچ بالڈ نے وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کرنل ڈنلاپ کی
مدد سے مسلمانوں اور حکومت سے مفاہمت کا راستہ صاف کیا۔ چنانچہ
مولانا محمد علی نے اِس ایڈریس کی بابت کہا کہ یہ "حکم کی تعمیل" تھی[6]
سر آغا خاں کے اس مشہور ایڈریس میں مسلمانوں نے جو مطالبات پیش
کئے تھے وہ یہ ہیں[7]

ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے یعنی
کل آبادی کا ($\frac{1}{4}$ تا $\frac{1}{5}$) حصہ اگر پست اقوام کو ہندوؤں میں شمار
نہ کیا جائے تو مسلمانوں کا تناسب ہندوؤں سے بھی بڑھ جائے گا
کسی طریقہ نیابت میں چاہے وہ راست ہو یا بالواسطہ جس سے ان کی

---

[5] ہندوستانی خلفشار صفحہ ۱۲۲

[6] خطبات کانگریس۔ خطبہ صدارت مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحات ۶۲۰ و ۶۲۱۔

[7] تقسیم ہند از امبیڈکر۔ آغا خاں کے خطبہ کا پورا متن صفحات ۴۲۸ تا ۴۳۴۔

حیثیت متاثر ہوتی ہو اس میں نہ صرف ان کی تعداد بلکہ اُن کی سیاسی اہمیت کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے اور دفاع میں جو انھوں نے خدمات انجام دیں ہیں ان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے چونکہ مسلمانوں کی آبادی بہ استثنائے روس ہر درجہ اوّل کی قوت سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے وہ حق بجانب ہیں کہ مملکت میں اپنا وجود تسلیم کروائیں۔ اب تک مسلمانوں کی نامزدگی کا جو طریقہ چلا آرہا تھا وہ ان کی ضروریات کا کفیل نہیں اور ان نامزد شدہ امیدواروں کو مسلمانوں کی تائید حاصل نہیں۔ مشرقی نیابتی ادارات ہندوستان کے لئے بالکل نئے ہیں اور اکثر عقلمند مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان ادارات کو ہندوستان کے مذہبی سماجی اور سیاسی حالات کے اعتبار سے نہ ڈھالا جائے تو شدید خطرات درپیش ہوں گے۔ اگر احتیاط برتی نہ گئی تو مسلمانوں کے قومی مفادات اکثریت کے رحم وکرم سے وابستہ ہو جائینگے۔

بلدیات اور مجالس ضلع میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نشستوں کا تعین ہو جانا چاہیئے۔ یہ تناسب ان کی تعداد سماجی اہمیت۔ مقامی اثرات اور دونوں فرقوں کی خاص احتیاجات کا پابند رہے۔ ہر فرقہ کو اپنا علیحدہ نمایندہ منتخب کرنے کی اجازت ہو۔ ہندوستانی جامعات کی سنات اور سنڈیکٹ میں مسلمانوں کے تناسب کا اعلان ہو جانا چاہیئے۔ صوبجاتی مجالس مقننات میں مسلمانوں کے نمایندوں کی تعداد کا تعین مذکورہ بالا اصول کے تحت ہو۔ صاحب حیثیت مسلم زمیندار۔ وکلاء تجار اور دیگر اہم مفادات کی نمایندگی ہونی چاہیئے۔ مجالس ضلع بلدیہ کے مسلم اراکین۔ مسلم لیلسان وغیرہ کو انتخابی حلقے قرار دیا جائے اور ان کو علیحدہ اپنے نمایندے روانہ کرنے کا حق حاصل ہو۔ مرکزی مجلس مقننہ میں

مسلمانوں کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب سے نہو اور نہ وہ غیر موثر اقلیت بن کر رہ جائیں۔ جہاں تک ممکن ہو انتخابات کو نامزدگی پر ترجیح دیجائے۔ مسلم اراکین کے انتخاب کے لئے مسلم زمیندار۔ وکلاء۔ تجار۔ مفادات جن کو حکومت نے تسلیم کیا ہو۔ صوبجاتی مجالس متقننہ کے مسلم اراکین اور مسلم رفقائے جامعات کو حق رائے دہی حاصل ہو۔

اب تک مسلمانوں کی نیابت ناکافی رہی ہے۔ انتخابات کی حالت یہ ہے کہ مروجہ قواعد کی روسے کسی مسلمان کا منتخب ہونا ممکن نہیں تاوقتیکہ وہ اکثریت کی تائید حاصل نہ کرلے۔ یہ شکایت بھی کی گئی کہ انتخابی جماعتوں اور ملازمتوں پر ہندو قابض ہیں۔ پنجاب۔ سندھ۔ بنگال میں باوجود مسلمانوں کی اکثریت کے مسلمان امیدواروں کو انتخابات میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ افلاس اور تعلیم کا فقدان ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ کسی قوم کی سیاسی وقعت اس قوم کے سرکاری ملازمین کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ چونکہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں کم ہیں لہذا ان کے سیاسی موقف کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں ادنیٰ و اعلیٰ عہدوں میں مسلمانوں کا ایک مناسب تناسب مقرر کردیا جائے۔ چونکہ عدالتوں میں بھی مسلمان جج بہت کم ہیں۔ لہذا ہر ہائیکورٹ اور چیف کورٹ میں کم از کم ایک مسلمان جج ضرور مقرر کیا جائے۔ مسلمان جج کے ہونے سے مسلمانوں کے مقدمات کی سماعت اور عدل گستری میں آسانی ہوگی۔ صوبجاتی مجالس متقننہ اور مرکزی مجالس متقننہ میں مسلمانوں کی تعداد معین کردی جائے۔ یہ کہنا کہ عہدوں کے لئے قابل مسلمان دستیاب نہیں ہوتے غلط ہے۔ جتنی طلب ہے اتنے مسلمان مل سکتے ہیں۔ البتہ

یہ کہکر کہ دوسرے فرقوں میں ان سے زیادہ قابل آدمی ملتے ہیں اُن کو بلا وجہ مسترد کر دیا جاتا ہے۔ مسابقت کا طریقہ بُرا ہے۔ اس وقت عدالتوں میں ایک مسلمان جج بھی نہیں حالانکہ کلکتہ کی عدالت میں (۳) ہندو جج ہیں جس وجہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اسی طرح پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود (۲) ہندو جج ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مفادات بھی ہیں لیکن مسلمانوں کے بعض مخصوص مفادات بھی ہیں اور مسلمانوں کی مناسب نیابت نہونے سے ان کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلدیات اور مجالس ضلع کا تعلق عوام کی صحت تعلیم، آرام و آسائش اور مذہبی ضروریات سے ہے۔ لہٰذا ان میں مسلمانوں کی مناسب نیابت ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایک مسلم یونیورسٹی کی سخت ضرورت ہے تاکہ مسلمان اپنی تعلیم کا اپنی مخصوص ضروریات کے مطابق انتظام کر سکیں۔

مسلمانوں نے نیابتی اِدارات کے ساتھ مسابقتی اِمتحانات کی بھی مخالفت کی اس لئے کہ مسابقت میں مسلمان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے سرسید نے بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ مولانا محمد علی نے مسابقتی اِمتحانات کی مخالفت میں ۱۹۱۳ء کو رائل کمیشن کے سامنے حسب ذیل وجوہات پیش کی تھیں[۱]۔ انڈین سیول سرویس کے مسابقتی امتحانات جس میں صرف ذہنی قابلیت دیکھی جا سکتی ہے ہندوستانی حالات کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہندوستان میں ذات پات کا طریقہ ہے جس کی وجہ سے آبادی مختلف حصوں میں

---

[۱] اخبار کامریڈ ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء صفحات ۱ تا ۲

تقسیم ہوگئی ہے اور ہر ذات کو بعض فوائد اور سہولتیں حاصل ہیں تو نقصانات اور برائیاں بھی ہیں۔ انگلستان میں سابقتی امتحانات اس لئے مناسب ہیں کہ وہاں قومی کیرکٹر میں ہم آہنگی ہے۔ امیدوار مساوی جسمانی اور ذہنی قابلیت کے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض حصوں کے لوگ جسمانی طور پر طاقتور ہیں تو بعض ذہنی قابلیت کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ ایسے حالات میں مسابقتی امتحانات مناسب نہیں۔ ہندوستان میں ہر صوبے کے حالات مختلف ہیں۔ مولانا نے ایک تجویز یہ پیش کی کہ اگر مسابقتی امتحانات ضروری سمجھے جائیں تو مسابقت میں بعض نشستیں پست فرقے مثلاً راجپوت۔ سکھ۔ مسلمان۔ مرہٹوں وغیرہ کے لئے مختص کردی جائیں۔ اس لئے کہ جب کھلی مسابقت ہوتی ہے تو ہندو فرقہ اعلیٰ ملازمتوں میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے اجارہ حاصل کرلیتا ہے۔

مسلمانوں نے جو مطالبات پیش کئے وہ اصولاً غیر واجبی معلوم ہوتے ہیں لیکن جن مشکلات اور جس بے بسی میں یہ قوم مبتلا تھی اس کا لحاظ کیا جائے تو ان کے مطالبات غیر واجبی نہیں کہے جا سکتے۔ ایک قوم کی زندگی اور بقا کا سوال تھا۔ مسلمانوں کو یہ گھبراہٹ تھی کہ اب ساری قوم تباہ و برباد ہونے کو ہے۔ ہندو تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے ان سے بڑھے ہوئے تھے حکومت کے بڑے بڑے عہدے ہندوؤں کو ملتے تھے۔ ملازمت میں ہندوؤں کی تعداد تناسب سے زیادہ تھی۔ جہاں کہیں ملازمت کا دروازہ کھلتا ہندو پہلے داخل ہوتے تھے[۹]۔ ہندوستانی جو پہلے چیف جسٹس ہوئے ان میں

---

[۹] کے۔ بی۔ کرشنا۔ مسئلہ اقلیت۔ صفحہ ۹۵۔

پہلے ہندو تھے۔ ایڈوکیٹ جنرل کے ذمہ دار عہدوں پر بھی ہندوؤں کا پہلے تقرر ہوا۔ عاملہ کے عہدے بھی پہلے ہندوؤں نے حاصل کئے۔ پہلا ہندوستانی جس کے سپرد ضلع کا نظم ونسق کیا گیا ہندو تھا[10]۔ دو ہندو ڈویژنل کمشنر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے لیکن ۱۹۰۹ء تک کوئی مسلمان یہ عہدہ حاصل نہ کر سکا۔ پہلا ہندوستانی جو انڈین سیول سرویس میں داخل ہوا وہ بھی ہندو تھا اور پہلا بیرسٹر بھی ہندو تھا مسلمان ہندوؤں کی رہبری پر عمل کرتے تھے لیکن قلیل تعداد میں[11]۔ ایسے حالات میں اگر کوئی جماعت اپنی تعلیمی اور معاشی پستی کی بناء پر تحفظات کا مطالبہ کرے تو یقینی بے جا نہیں اور جبکہ ایک قوم کی موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ سیاسیات میں تحفظ کی تلاش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خود مملکتیں بین الاقوامی معاملات میں اپنا تحفظ چاہتی ہیں۔ اسی طرح جماعتیں اور گروہ داخلی سیاسیات میں معاشی تمدّنی اور مذہبی تحفظ چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے قوت حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ سیاست بالعموم تحفظ اور قوت کے گرد گھومتی ہے جداگانہ تحفظ کے لئے جماعتوں میں کشمکش ہوتی ہے[12]۔ سیاست میں بے چینی مستقبل کے غیر یقینی ہونے اور شبہ کی بناء پر پیدا ہوتی ہے[13]۔ سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ نیابتی ادارا

---

۱۰ کے۔ بی۔ کرشنا — صفحہ ۹۵

۱۱ ایضاً — صفحہ ۹۵

۱۲ بینی پرشاد۔ ہندو مسلم مسائل — صفحہ ۴۳

۱۳ ایضاً — صفحہ ۵۷

یا مسابقت کے ذریعہ ہندو راج قائم ہو جائے گا۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کانگریس میں رہ کر بھی اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر سکتے تھے۔ مگر کئی وجوہ کی بنا پر وہ کانگریس سے الگ تھلگ رہے۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ [illegible] سید نے ان کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کی تھی۔ مسلمانوں کو یہ شبہ تھا کہ اردو ہندی اختلافات میں کانگریسی اراکین کا ہاتھ تھا اور ہندو مت کا احیا بھی کانگریس کے ہندو اراکین کی جانب سے عمل میں آ رہا ہے۔ جب کانگریس نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی تو مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ کانگریس کا مخالف ہو گیا تقسیم بنگالہ کی تنسیخ ہندوؤں کی جیت تصور کی گئی۔ اس کے علاوہ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک قومی ادارہ ہے جس میں ہر فرقے کے لوگ شریک ہیں۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ صرف مسلمانوں کے سیاسی و معاشی حقوق کا تحفظ کرے۔ کانگریس قومی تحریک چلا رہی تھی۔ وہ مسلمانوں کے مطالبات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں وجوہات کی بنا پر مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہے۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں مسلمانوں کے پیشہ ور طبقات بھی پیدا ہو چکے تھے اور یہ اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی انجمن نہ تھی جو ان کے حقوق کا تحفظ کرتی۔ چنانچہ ان حالات کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ سیاسی جماعت کے قیام کی شدید ضرورت لاحق ہوئی۔ مسلم لیگ کا سنگ بنیاد آغا خاں کا وفد تھا۔ ۳۰ ہر ڈسمبر ۱۹۰۶ء کو کل ہند مسلم لیگ کا پہلا جلسہ بمقام ڈھاکہ منعقد ہوا جس کی صدارت وقار الملک نے کی۔

ایک طرف یہ حال تھا اور دوسری طرف انگریز مسلمانوں کو کانگریس کی قومی تحریک سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے چنانچہ مسلمانوں کے مطالبات اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر لارڈ منٹو نے مسلم لیگ کے قیام میں اعانت کر کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو شہہ دی اور سامراج کی بقا کا سامان فراہم کیا۔
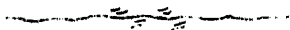
منٹو مارلے اصلاحات اور فرقہ واریت

فرقہ وارانہ مسئلہ کو پہلی مرتبہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں جگہ دی گئی جبکہ مسلمانوں کے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے مطالبہ کو تسلیم کیا گیا۔ اگر ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند میں مفادات کی نیابت تسلیم کی گئی لیکن آہستہ سے فرقہ واریت ضرور داخل کر دی گئی ـــ دراصل لارڈ ڈفرن کانگریس کی اشتعال انگریز تقاریر سن چکا تھا۔ وہ کسی طرح اس خلفشاری دور کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۵ ہر نومبر ۱۸۸۸ء کو اس نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا تھا کہ "اگر ہم کانگریس کی طاقت اور اس کے حامیوں کے خیالات کا صحیح اندازہ نہ لگائیں تو یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔ ہم کو اپنے شہنشاہی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے ہندوستانیوں کے جائز اور حق بجانب مطالبات کو پورا کرنا چاہئیے

اور ان کو حکومت میں شریک کرنا ہوگا۔ ڈفرن نے مجالس مقننہ کی توسیع کے لئے سفارش کی اور بتایا کہ موجودہ حالات میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے ہم اپنی پالیسی کی توضیح کریں یا غلط بیانی کی صفائی کریں اگرچہ کہ ایسا ذریعہ نہ ہونے سے اس وقت تک کوئی بہت بڑے نتائج پیدا نہیں ہوئے لیکن مستقبل میں شدید خطرات کا امکان ہے[1] ڈفرن کا خیال تھا کہ غیر سرکاری اراکین کی تعداد بہت کم ہے اور ان کے اختیارات بھی کم ہیں لہذا اہم سیاسی مباحث صحافت میں جگہ پاتے ہیں اور اخبارات مخالفت کا ذریعہ بن گئے ہیں جو کچھ اس میں دینا ہے ہم کو نیک دلی سے دینا چاہیئے اور یہ اعلان کر دینا ہوگا کہ ۱۰ - ۱۵ برس تک پھر کچھ نہیں دیا جائے گا تاکہ اشتعال انگیز تقاریر کا سد باب ہو[2] لارڈ ڈفرن نے مفاداتی نیابت پر زور دیا۔ لارڈ سالسبری کو بھی اس سے اتفاق تھا چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۲ء کا قانون مجالس ہند منظور ہوا۔ اس قانون میں یہ وضاحت موجود تھی کہ گورنر جنرل اور گورنر تجارتی اور پیشہ ورانہ جماعتوں سے مشورہ کریں گے اور قابل اعتماد اصحاب کو مقننہ کے لئے نامزد کریں گے ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس کی رو سے صوبجاتی مقننہ میں اہم فرقوں جماعتوں اور مفادات کی نیابت مقصود تھی۔ مگر بظاہر فرقہ وارانہ تقسیم تسلیم نہیں کی گئی۔ گورنروں اور لفٹنٹ گورنروں کو یہ ہدایت تھی کہ خاص خاص جماعتوں اور مفادات کی نیابت ہو جس میں مسلمانوں کا

---

[1] سوانح حیات لارڈ ڈفرن جلد دوم صفحات ۱۵۱ تا ۱۶۰

[2] ایضاً صفحہ ۴۳

بھی نام لیا گیا[۳] لیکن انتخاب کا حق کسی فرقے کو نہیں دیا گیا بلکہ گورنر یا لفٹننٹ گورنر کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ مختلف فرقوں کی نیابت اور ان کے مطالبات ملحوظ رکھے جائیں۔ بنگال کے صوبے میں حکومت ہند نے ہندوؤں، مسلمانوں، اینگلو انڈینس اور یوروپینس کو نیابت کے لئے تسلیم کیا۔ اسی وقت سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت ہند نے جماعتوں اور فرقوں کی تقسیم کی اور ان کا علیحدہ وجود تسلیم کیا۔ وزیر ہند نے گورنر جنرل کو جو مراسلہ لکھا اس میں "نسل" "طبقات" اور "حلقہ جات" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں[۴]۔ چنانچہ معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۲ء کے قانون مجالس ہند میں مفادات اور جماعتوں کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال ہے کہ پہلی مرتبہ مسلمانوں کے لئے ۱۸۹۲ء ہی میں نیابت کا اصول آہستہ سے مقننہ میں مروج کردیا گیا[۵]۔ اگرچہ کہ قانون مجالس ہند میں علانیہ طور پر جداگانہ نیابت سے متعلق کوئی دفعہ نہیں ملتی اور قانون اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ مگر جن لوگوں کو دستور مدون کرنے کی ذمہ داری عطا کی گئی تھی ان کو ہدایت کی گئی کہ مسلمانوں کا لحاظ رکھا جائے[۶]۔ کسی منظم مسلم جماعت نے جداگانہ نیابت کا مطالبہ نہیں پیش کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس

---

[۳] رپورٹ سیمین کمیشن جلد اول صفحہ ۱۸۳۔

[۴] ڈینل۔ وفادار ہندوستان صفحات ۴۱ تا ۴۲

[۵] تقسیم ہند از امبیڈکر صفحہ ۲۴۰

[۶] ایضاً ایضاً

کی ابتداء کس کے ہاتھوں ہوئی ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ڈفرن اس کا ذمہ دار تھا۔[۶]
اس نے مجالس مقننہ کی نیابت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان
میں انگلستان کی وضع پر طریقہ نیابت کو مروج کرنا سودمند نہ ہوگا بلکہ نیابت
کی بنیاد مفادات پر ہونی چاہیئے ۔ خود مسٹر کرزن نے ۱۸۹۲ء کے قانون
کے مسودہ کی خواندگی کے موقع پر کہہ دیا تھا کہ اس قانون کا مقصد ہندوستان
میں پارلیمانی حکومت قایم کرنا نہیں ہے ۔ یہ سوال فطرتاً پیدا ہوتا ہے کہ
آخر ڈفرن نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ
رکھنا مقصود تھا ۔ ۱۸۹۲ء کے قانون کے ذریعہ نہ مسلمانوں کو اپنے
نمایندے منتخب کرنے کا حق تھا اور نہ ان کے لئے نشستوں کا تعین کیا گیا
مگر اس قانون کی رو سے مسلمانوں کو جداگانہ نیابت حاصل ہوئی[۸] جداگانہ
حلقہ ہائے انتخاب کا مشورہ برطانیہ ہی کی جانب سے دیا گیا لیکن مسلمانوں
نے اس کی تائید کی[۹]

۱۸۹۲ء کے بعد سے چودہ سال کا عرصہ جس میں مجالس مقننات
میں تجربہ کیا گیا مجموعی طور پر اچھا رہا[۱۰] تنقید معقول تھی اگرچہ کہ ہر وقت
حالات کے بالکل مخالف نہ تھی[۱۱] غیر سرکاری اراکین سے مفید مشورے

---

۶ تقسیم ہند از امبیڈکر صفحہ ۲۴۱
۸ ایضاً ایضاً
۹ " " "
۱۰ مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۴۶ ۔
۱۱ " " ۴۷ ۔

ملتے رہے۔ اب کانگریس اور ہندوستانی آگے بڑھنے کا مطالبہ کر رہے تھے چنانچہ اگست ۱۹۰۶ء کو حکومت ہند نے جدید اصلاحات کے نفاذ کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے اپنی کونسل کے چند اراکین کی ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ ہندوستانی حالات کے متعلق سفارشات پیش کرے اس کمیٹی کے سرگرم رکن سر اے۔ ٹی ارنڈیل تھے۔ مارچ ۱۹۰۷ء کو امپیریل کونسل میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کو عنقریب اصلاحات عطا کئے جائیں گے اور ملک کے باشندوں کو حکومت میں شریک کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی جائے گی۔ لیکن آبادی کے مختلف طبقات اور فرقہ جات کی تعلیمی اور معاشی حالت میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے دِقّت پیش آنے لگی۔ سب سے اہم مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نیابت کا تھا۔ وزیر ہند مارلے نے ۲۳/ فروری ۱۹۰۹ء کو دارالامراء میں انڈین کونسل بل کی دوسری خواندگی کے وقت تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو ہم زبردست تاریخی مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں[۱۱۵] جو کمیٹی ہندوستان کے حالات کی چھان بین کے لئے مقرر ہوئی تھی اس کے حدود و استصواب یہ تھے۔

(۱) کونسل آف پرنس۔ اگر یہ نہ ہو تو وائسرائے کی کونسل میں ان کی نیابت۔

(۲) وائسرائے کی مجلس عاملہ میں ایک ہندوستانی رکن

(۳) مرکزی مجلس مقننہ اور صوبجاتی مجلس مقننہ میں نیابت کی توسیع۔

---

[۱۱۵] تقاریر مارلے صفحہ ۱۲۷۔

اِس کمیٹی کا تقرر کرتے ہوئے منٹو نے اپنی کونسل کو یہ یادداشت بھیجی

"..... ہندوستانی حالات اور ہندوستانی طرز نظم و نسق کبھی بھی ہندوستان یا انگلستان میں پبلک کی توجہ کا مرکز نہیں بنے جیسا کہ اس وقت بنے ہوئے ہیں۔ تعلیمی ترقی جس کی برطانوی حکومت نے ہمت افزائی کی ہے پھیل رہی ہے آبادی کے اہم طبقات اپنی حیثیت کا اندازہ کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا ہے اور حکمران قوم کے ساتھ مساوی شہری حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ انگلستان میں سیاسی زندگی کے اثرات ہندوستان کے سیاسی تخیل کی ترقی کے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ مگر ہم (حکومت ہند) ان حالات کو دیکھتے ہوئے آنکھ نہیں بند کر سکتے۔ سیاسی فضاء میں مکمل تبدیلی پائی جاتی ہے اور ایسے مسائل پیدا ہو چکے ہیں جن کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے اور جن کا ہمیں حل دریافت کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں یہ بات اہم ہے کہ پہل ہماری طرف سے ہونی چاہیئے تاکہ ملک کی سورش یا انگلستان کے دباؤ سے حکومت ہند مجبور نہ ہو جائے[1]۔"

منٹو ہندوستان میں مغربی طرز کی [illegible] رائج کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس ملک میں کئی نسلیں آباد ہوں وہاں یہ طریقہ مناسب نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مشرقی مزاج کے خلاف غیر فطری درآمد ہوگی۔ نہ ہندو راجاؤں نہ مسلمان شہنشاہوں کے عہد میں حکومتی معاملات میں عوام کی آواز شریک رہی۔ برطانوی ہاتھوں میں اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیئے نہ کہ کسی نیابتی مجلس کے سپرد کر دیا جائے[2]۔ ہمارے کا

---

[1] دستوری دستاویزات ہند سنہ [illegible] تا [illegible] جلد اول از [illegible] صفحہ ۲۵۱

[2] منٹو اور مارلے۔ صفحہ ۱۱۰۔

خیال تھا کہ جب مغربی تعلیم مروج کر دی گئی ہے تو مغربی اِدارات کی ترویج بھی لازمی ہے۔ جب مجالس مقننہ کا قیام عمل میں آچکا ہے تو اُن کو عمومی بنانا بھی ضروری ہے[۱۵]

جو گشتی کہ حکومت ہند نے ۲۴ راگست ۱۹۰۷ء کو مقامی حکومتوں کو روانہ کی تھی اِس میں تعلیم یافتہ طبقے کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی اور یہ واضح کیا گیا کہ حکمران رئیس۔ زمیندار طبقہ نیز تاجر طبقات جو ہندوستانی سماج کے باا ثر اور طاقتور رکن ہیں اب ان میں یہ قابلیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ پبلک زندگی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں اور حکومت کا زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹائیں۔ اَب وہ سیاسی زندگی سے علیحدہ شمار نہیں کئے جائیں گے۔ انھوں نے تعلیم سے خاطر خواہ فایدہ اُٹھایا ہے اور وہ عملی اِنتظامات میں اپنے خیالات کا اِظہار کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی دستور اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ طبقہ زمیندار طبقہ صناع اور تجار کی ضروریات کا لحاظ نہ رکھا جائے اور اس کے ساتھ اِعتدال پسند طبقے کو بھی حکومت میں شریک کرنا ہوگا۔ اپنی اِس یادداشت میں منٹو نے زمینداروں کی نیابت پر کافی زور دیا ہے[۱۶]

آغا خاں کے وفد کے مطالبات کی بنا پر حکومت ہند نے حسب ذیل سفارشات پیش کیا[۱۷]

---

۱۵ تقاریر مارلے ۔ صفحہ ۱۲۳ ۔

۱۶ دستوری دستاویزات ہند صفحات ۲۵۵ تا ۲۶۰ ۔

۱۷ ایضاً ۲۶۶ تا ۲۶۸

مرکزی اور صوبہ واری مجالس متقننات میں مسلمانوں کے لئے نشستیں محفوظ کر دی جائیں اور ایک خاص مسلم حلقۂ انتخاب تشکیل دیا جائے امپیریل کونسل میں مسلمانوں کے لئے جو چار نشستیں محفوظ کی جائیں گی ان میں سے (۲) وائسرائے نامزد کریگا۔ بقیہ دو بنگال بشرقی بنگال۔ آسام صوبہ متحدہ پنجاب۔ بمبئی اور مدراس کو بالترتیب دی جائیں گی۔ برما اور صوبہ متوسط میں مسلمانوں کی تعداد اتنی نہیں کہ ان کو مخصوص نیابت عطا کی جائے حکومت نے یہ بتایا کہ آغا خاں کے وفد کے مطالبات بالکلیہ تسلیم نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ اس سے دستوری پیچیدگی کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ حلقہ ہائے انتخاب کی بابت آغا خاں کے وفد نے ان سفارشات کو پیش کیا تھا۔

(۱) صوبجاتی مجالس متقننات کے غیر سرکاری مسلم اراکین کی تعداد بڑھائی جائے۔

(۲) جامعات کے مسلمان رفقاء کے لئے علیحدہ حلقہ ہو۔

(۳) مسلمان جہاں ۲۵ ہزار روپئے پر محصول آمدنی ادا کرتا ہو۔

صوبجاتی مجالس متقننہ کی بابت گشتی میں یہ امر واضح کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے حالات کے تنوع کی وجہ کسی ایک مخصوص اسکیم پر عمل نہیں کیا جا سکتا مختلف طبقات نسلوں اور مفادات کو وسیع ترین نمایندگی دیجانی چاہیئے مگر سرکاری اراکین کی اکثریت برقرار رہے۔ صوبجاتی متقننات صوبے کی آبادی کے مختلف طبقات۔ نسل ذات مذہب کا لحاظ کرتے ہوئے نشستوں کا تعین کریں اور ان خاص جماعتوں کو اپنے اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ اگر ہر ایک علاقہ میں

بالفرض (۸) اراکین کا انتخاب مقصود ہو تو (۴) نشستیں مسلمانوں کے لئے محفوظ رکھی جائیں اور بقیہ چار ہندوؤں میں تقسیم کی جائیں ہر ایک میں ایک نشست زمیندار کو ایک تاجر کو ایک کسان ایک پیشہ ور طبقے کو دی جائے تاکہ رائے دہی کی قوت فرقے کے ایک ہی طبقے میں نہ رہے۔

حکومت ہند نے جو مراسلۂ[1] اصلاحات مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء بنام وزیر ہند روانہ کیا تھا اس میں بھی اقلیتوں کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں منٹو نے بتایا ہے کہ تعلیم کی ترقی کی وجہ سے خاص مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ایسے ملک میں جہاں مختلف فرقے نسل۔ ذات اور طبقات جدا جدا ہیں جیساکہ ہندوستان ہے اور جہاں قومی جذبات نہیں پیدا ہوئے ہیں ایسی صورت میں ہر فرقہ ومفاد کو اپنے طور پر سوچنے کا موقع دیا جائے زمینداروں کی حد تک ہندو ہوں یا مسلمان عام طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرتے ہیں۔ مجالس مقننات میں زمینداروں کے مفاد کی جداگانہ نیابت کا بالعموم استقبال کیا جا رہا ہے اور اکثر اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ جس طبقہ کا نمایندہ کھڑا ہو وہ اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ مسلمان کہتے ہیں کہ ۱۸۹۲ء کے اصلاحات میں مختلف مفادات کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور علاقہ جاتی نیابت کو مروج کرنے سے پیشہ ور طبقات کا قوت رائے دہی پر بکلی اجارہ قائم ہو گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے متفقہ طور پر مجالس مقننات میں جداگانہ نشستوں کی تائید کرتے ہیں۔ ۱۸۹۲ء کے بعد سے جو تعلیمی ترقی ہوئی اس سے مسئلہ اور پیچیدہ بن گیا ہے۔ پست طبقات بھی

---

[1] دستوری دستاویزات ہند۔ صفحات ۱، ۷ تا ۹۲

اپنے حقوق اور مفادات سے روشناس ہوگئے ہیں اور جداگانہ نیابت اور مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اصولِ نیابت کی بابت لارڈ منٹو نے یہ وضاحت کی کہ جہاں تک ہم نے صوبجاتی حکومتوں سے معلومات فراہم کی ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ طبقات اور مفادات کی نیابت ہندوستانی مجالسِ مقنّنات کے لئے بہترین اصول ہے۔ ڈفرن کے ہوم سکریٹری مسٹر میکڈانل نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں مختلف نسلیں قومیتیں اور عقائد ہیں ان کو تسلیم کئے بغیر ہندوستانی مجالسِ مقنّنات کے لئے کوئی دستور مدوّن نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خود لارڈ ڈفرن نے اپنے مراسلہ ۶ نومبر ۱۸۸۸ء کو لکھا تھا کہ ہندوستانی آبادی کئی بڑی واضح قومیتوں اور مذاہب میں منقسم ہے اور ملک میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تعصب کی وجہ سے لوگ آپس میں منقسم ہوگئے ہیں۔ مختلف طبقوں کے مادّی مفاد میں ہر وقت کشمکش جاری ہے اور خود سر آغا خاں نے کہدیا تھا کہ "اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ جو اتحادی قوتیں کام کر رہی ہیں وہ موجودہ تہذیب کی مشنری سے تیز ہوگئی ہیں تب بھی ہندوستان کو ایک قوم بننے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے" ایوان بالائی میں مختلف طبقات فرقے اور دیگر مکاتب خیال کی نیابت کی مشکلات پر لارڈ ریپن نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ لارڈ کمبرلے نے تو کہا کہ "اس قدر وسیع ملک کی پارلیمانی نیابت کا خیال جو تقریباً یورپ کے مساوی ہے جس میں متعدد نسلیں بستی ہیں ایک وحشیانہ تصور ہے جو انسانی ذہن میں آسکتا ہے" اس نے یہ بھی کہا کہ مسلم جماعت کا خیال ضروری ہے ورنہ مشکلات پیدا ہوں گی۔ لارڈ نارتھ بروک نے کہا کہ

آبادی کے مختلف طبقات مختلف نسلوں اور مختلف مذاہب کی نیابت ہونی چاہیئے۔ لارڈ کمبرلے نے بالآخر کہا "اس ملک میں اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کرنا آسان کام نہیں .... کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی جیسی اقلیت کی پوری نیابت ہو جو ملک کے اکثر حصّوں میں اقلیت میں ہیں۔ دارالعوام میں مسٹر گلیڈسٹن نے بھی ہندوستان جیسے وسیع ایشیائی ملک میں جہاں قدیم تہذیب اور فرسودہ ادارات ہیں اور نسل و مذہب میں اختلافات کی وجہ سے انتخابی اصولوں کے مروج کرنے میں مشکلات کا اظہار کیا۔ ۱۸۹۳ء میں امپیریل کونسل میں جو غیر سرکاری اراکین منتخب ہوئے (۴۵) فیصد پیشہ ور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ زمینداروں کو ۲۷ فیصد نشستیں ملیں اور مسلمان صرف (۱۲) فیصد۔ حکومتِ ہند نے بتایا کہ (۱۵ - ۲۰) سال کے عرصے میں حالات بدل چکے ہیں۔ تعلیم بڑھ گئی ہے۔ لہذا حالات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ حکومت ہند نے حالات کو واضح کرنے کے لئے ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار پیش کئے ہیں[۱۹]۔

مفادات	آبادی	فیصد
زراعت	۱۵۵۶۷۸۰۰۰	۶۷٫۶۱
کامرس اور صنعت	۳۸۳۰۲۰۰۰	۱۶٫۶۵
پیشے	۳۸۰۷۱۰۰۰	۱٫۶۶

فرقہ جات

نام	تعداد	فیصد
ہندو	۱۵۸۶۰۱۰۰۰	۶۸
مسلمان	۵۳۸۰۴۰۰۰	۲۳
بدھ متی	۹۴۱۱۰۰۰	۴
عیسائی	۱۹۰۴۰۰۰	۸۱ء
سکھ	۱۵۷۴۰۰۰	۶۷ء
جین	۴۷۹۰۰۰	۲۰ء

مردوں میں تعلیم یافتہ

انگریزی زبان	۶۵۲۰۰۰	ایک فیصد
دیسی زبان	۸۶۱۶۰۰۰	۱۴ "

امپیریل کونسل کی تشکیل کے لئے حکومت ہند نے حسب ذیل سفارشات کو پیش کیا۔

ا غیر سرکاری اراکین ۸

ب صوبوں کی نیابت کرنے والے عہدہ دار ۸

ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۸۶ - ۵لہ دستوری دستاویزات ہند (اعداد بابت برطانوی ہند) صفحہ ۲۸۶

ج نامزد کردہ اراکین (۱۵) سے زائد عہدہ دار نہ ہوں۔
غیر سرکاری عہدہ داروں میں اقلیتوں کے نمائندے
خاص مفادات کے نمائندے یا ماہرین فن
ہوں۔ ۱۸

د منتخبہ اراکین ۲۸

د-۱ صوبہ واری مجالس مقننہ کے اراکین نیز مشاورتی
کونسل اور صوبہ متوسط کے اراکین۔ ۱۲

د-۲ مدراس۔ بمبئی۔ بنگال۔ مشرقی بنگال اور
آسام۔ صوبہ متحدہ۔ پنجاب اور صوبہ متوسط۔ ۷

د-۳ بنگال۔ مشرقی بنگال اور آسام۔ صوبہ متحدہ
پنجاب اور (یکے بعد دیگرے) مدراس
اور بمبئی۔ ۵

د-۴ ایوان ہائے تجارت کلکتہ و بمبئی۔ ۲

د-۵ انڈین کامرس کے نمائندے۔ ۲

وائسرائے ہند

جملہ ۶۳

زمینداروں کی نیابت کی بابت یہ سفارش کی گئی کہ اگر زمینداروں کے لئے حلقہ ہائے انتخاب نہیں بنائے جا سکتے تو انجمنوں کے ذریعہ انتخاب کیا جائے اور جہاں نمائندہ انجمن نہ ہو اور حلقہ انتخاب نہیں بنایا جا سکتا وہاں نامزدگی کے اصول پر عمل کیا جائے۔

مسلمانوں کی نیابت کے لئے یہ رائے ظاہر کی گئی کہ جملہ مقامی حکومتیں
مسلمانوں کی مخصوص نیابت کی تائید کرتی ہیں جو کہ حکومت ہند نے ۲۴
اگست ۱۹۱۷ئہ کو اپنے مراسلہ میں پیش کیا تھا۔ اِن تجاویز کی مسلمان
مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مذہب کو دوسرے مذہب
کے خلاف کھڑا کیا جارہا ہے اور متوسط تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان توازن
پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بعض ہندو مسلمانوں کی مخصوص
نیابت کی تائید بھی کرتے ہیں۔ بمبئی پریسیڈنسی ایسوسیشن نے مخصوص
نیابت کی مخالفت کی لیکن پھر بھی اس کو تسلیم تھا کہ مسلمان ایک مذہبی
جماعت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے
مطالبات کو اس طرح پورا کیا جاسکتا ہے کہ (۴) انتخابی نشستیں ان کو
دی جائیں اور ایک پر نامزدگی ہو۔ تا وقتیکہ انتخاب کی مناسب متبادل
شکل دریافت نہ ہو جائے چار نشستیں مستقل طور پر بنگال۔ مشرقی بنگال
اور آسام۔ پنجاب۔ صوبہ متحدہ کو ایک ایک دی جائے۔ اکثر صوبوں
میں مسلمان انتخابات کی تائید کرتے ہیں۔ بمبئی کے مسلمان منتشر اور
غیر منظم ہیں۔ انکے لئے مخصوص حلقۂ انتخاب کی تشکیل مشکل ہے۔ حکومت بنگال
اور آسام یہ سفارش کرتی ہے کہ مسلمان نمائندے صوبہ واری مسلم انجمنوں
سے لئے جائیں۔ پنجاب کا لفٹنٹ گورنر کہتا ہے کہ مسلم حلقۂ انتخاب بنانا نہایت
مشکل ہے۔ اس وقت نامزدگی ہی بہتر ہے جو لفٹنٹ گورنر کرے۔ ہمارا
خیال ہے کہ جہاں حلقۂ انتخاب نہیں بن سکتا وہاں مسلم انجمنوں کا حلقہ
انتخاب بنایا جائے اور جہاں یہ دونوں نہوں وہاں حکومت نامزدگی کے
اصول پر عمل کرے۔ یہ مسئلہ مقامی حکومتوں کا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت سے

مشورہ کر کے کوئی اصول مرتب کرے۔

حلقۂ تجارکی نیابت کے لئے مرکزی مجلس مقننہ میں (۴) نشستیں ہوں ایک ایوانِ تجارت کلکتہ ایک ایوانِ تجارت بمبئی۔ بقیہ (۲) نشستوں پر گورنر جنرل نامزدگی کریگا۔

غیر سرکاری عہدہ داروں میں (۳) کو گورنر جنرل نامزد کرے گا جس کے ذریعہ اقلیتوں مثلاً سکھ۔ پارسی۔ بدھ مت۔ ہندوستانی عیسائی یا بعض ماہرینِ فنون کو نامزد کیا جائے گا۔ بعض اقلیتیں انتخاب کے ذریعہ نشستیں حاصل کریں گی۔

صوبہ واری مجالس مقننات میں جماعتوں۔ نسلوں اور مفادات کی نمائندگی ہوگی تقریباً مرکزی مقننہ کے شرائط ان کے لئے برقرار رکھے جائیں لیکن سرکاری اور غیر سرکاری اراکین کی تعداد مساوی ہوگی۔

وزیر ہند لارڈ مارلے ابتدا میں جداگانہ حلقہ ہائے نیابت کے مخالف تھے چنانچہ پارلیمنٹ کے مباحثے کے وقت انھوں نے جداگانہ انتخابات کی مخالفت کرتے ہوئے مخلوط انتخابات اور نیابت متناسبہ کی سفارش کی تھی[۲۰] مارلے نے اپنی تقریر مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۰۹ء کو دارالامراء میں کہا تھا کہ مخلوط انتخابات کے ذریعہ دو اہم فرقے ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں اور ہندوستان کے تجربہ کار لوگ اس کی تائید کرتے ہیں جو انڈیا آفس میں میرے مشیر ہیں لیکن مسلمان کہتے ہیں کہ اس طریقے سے مسلم نمائندہ ہندوؤں کا مؤید ہوگا[۲۱] مگر جب لندن میں مسٹر امیر علی نے

---

۲۰ لارڈ منٹو از بک ہین صفحہ ۳۰۸-۳۰۹
۲۱ تقاریر مارلے۔ صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۵

مسلمانوں کے مطالبات کو پیش کیا تو لارڈ مارلے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے مؤید ہو گئے۔ چنانچہ ۲۶ نومبر ۱۹۰۸ء کو مارلے نے حکومت ہند کے مراسلہ کی تائید میں اپنا جواب[۱۲۵] روانہ کیا۔ وزیر ہند نے لکھا کہ مجھے طبقاتی نیابت کے اصول سے اتفاق ہے اور میں مقننات میں مسلمانوں اور زمینداروں کے طبقے کی نیابت ضروری سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں کی نیابت سے متعلق جو مشکلات ہیں وہ بھی جانتا ہوں۔ ایک مشکل اور ہے صوبجاتی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کر دینے کے بعد مسلمان علاقہ جاتی حلقہ انتخاب میں ووٹ نہیں دے سکتے۔ اگر اس کی اجازت دیجائے تو مسلمانوں کو دوھری رائے دہی حاصل ہو گی جس پر دوسرے فرقوں کو اعتراض ہو گا۔ مارلے نے بالواسطہ انتخابات کی تائید کی یعنی پہلے بلدیہ اور مختلف انجمنیں رائے دہندوں کو منتخب کریں اور رائے دہندوں کی یہ منتخبہ تعداد اراکین مقننہ کا انتخاب کریں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں۔ مارلے نے لکھا کہ ہر فرقے کو اپنے نمائیندوں کے انتخاب کا حق ہونا چاہیئے۔ اگر مسلمان اپنے مقررہ نمائیندے روانہ نہ کر سکیں تو بقیہ حکومت نامزد کریگی۔ مرکزی مجلس مقننہ میں سرکاری اراکین کی اکثریت ہونی چاہیئے مارلے نے منٹو کو لکھا کہ مرکزی مجلس مقننہ کی بابت میں آپ کی سفارشات کو مکمل طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ آپ جو اقلیتوں مثلاً سکھ۔ پارسی۔ ہندوستانی عیسائی۔ بدھ متی وغیرہ کی نیابت چاہتے ہیں مجھے اس سے پوری طرح اتفاق ہے۔

---

[۱۲۵] ملاحظہ ہو دستوری دستاویزات ہند جلد اول صفحات ۳۱۰ تا ۳۱۹۔

۴ مارچ ۱۹۰۹ء کو دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ منٹو نے کہا[۲۳] کہ مسلمان تین باتوں کے خواہاں ہیں۔ وہ اپنے نمائیندوں کے انتخاب کا مطالبہ کر رہے ہیں جیسا کہ جزیرۂ سائپرس میں ہوتا ہے۔ اس طرح بوہیمیا میں بھی جرمنوں کے لئے علیحدہ رجسٹر ہے۔ چنانچہ ہمارے لئے نظیر موجود ہے دوسرے وہ اپنی تعداد کے تناسب سے زیادہ نشستوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالبات پورے کئے جا سکتے ہیں۔ تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں ۲ ہندوستانی ممبر ہوں ایک ہندو اور ایک مسلمان اس نے یہ بھی کہا کہ ہم کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ مذہب اسلام اور ہندومت کے اختلافات صرف مذہب تک محدود نہیں بلکہ زندگی میں روایات میں تاریخ میں اور سماجی معاملات میں اُن میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

وزیر اعظم مسٹر اسکویتھ نے بھی یکم اپریل ۱۹۰۹ء کو تقریر[۲۴] کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کی تائید کی اور کہا کہ اصلاحات سے شدید خطرہ ختم ہو جائے گا جو گزشتہ چند سال سے لاحق ہے اور انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی اشارہ کیا کہ جو تحریک سارے ایشیا میں جاری ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ دیسی باشندوں کو انصرام حکومت میں زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے اس سے آنکھ نہیں بند کی جا سکتی ہے۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ اس تحریک کو زیادہ عرصہ تک روکا جا سکتا ہے۔

بہرحال ان ساری کاوشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء کا قانون منظور ہو

---

[۲۳] دستوری دستاویزات ہند جلد اول صفحات ۳۳۶ تا ۳۳۷

[۲۴] ایضاً صفحات ۳۴۱ تا ۳۴۲

اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول تسلیم کیا گیا اور مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ نیابت کے ضمن میں ان کی سیاسی اہمیت اور دفاعی خدمات ملحوظ رہیں تسلیم کیا گیا۔ اس قانون کی رُو سے مرکزی مجلس مقننہ کے اراکین کی تعداد بشمول گورنر جنرل (۶۹) ہوگی جس میں سرکاری اراکین کو اکثریت حاصل رہے گی البتہ صوبوں میں غیر سرکاری اراکین کو اکثریت حاصل رہیگی۔ ہندوستان کے بڑے صوبوں سے ۵ مسلمان منتخب ہوکر آئیں گے اور ایک مسلم زمینداروں کی طرف سے یوروپین ایوان ہائے تجارت بمبئی و بنگال ۲ اراکین کا انتخاب کریں گے۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ میں پہلے ایک ہندوستانی رکن شامل کیا گیا۔ چنانچہ منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعہ پہلی مرتبہ جداگانہ فرقہ داری حلقہ ہائے انتخاب قائم ہوئے اور ہندوستانی نظام سیاست کا اہم جزبن گئے۔ قوم پرست جماعت اور بالخصوص ہندوؤں کی جانب سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ یہ کہا جانے لگا کہ حکومت کی جانب سے ہندوستانی قومیت پر ضرب لگائی جارہی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں دوٹ کے معاملہ میں ایک دوسرے سے بے نیاز ہوگئے اور جداگانہ نیابت کے ذریعہ ہندو مسلم تعلقات کی خلیج وسیع ہونے لگی لیکن مسلم فرقہ اس کو اپنے وجود کے لئے ناگزیر تصور کرتا تھا۔ اس طرح سے موقع کی نزاکت سے سامراج نے فائدہ اٹھایا ہے۔

فرقہ واریت کی ابتداء پر تبصرہ

نیابتی ادارات کی ترویج وہابی و آریہ سماج تحریکیں اردو ہندی

اختلافات حصول اقتدار کی خواہش یہ ساری چیزیں ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو وسیع کرتی جا رہی تھیں۔ مذہبی تحریکوں کی وجہ سے ہندو اور مسلمان ویدک کے دور اور خلافت کے زمانے کا بالترتیب احیاء کرنا چاہتے تھے۔ ویدک کے عہد اور خلافتی نظام میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خواہشات کے تحت ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی میں نمایاں فرق پیدا ہونے لگا روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ عہد وسطی میں جو مشترک زندگی پیدا ہوئی تھی آہستہ آہستہ اس کا خاتمہ ہونے لگا۔ ان حالات سے حکومت نے فائدہ اٹھایا۔ جب بیسویں صدی کی ابتداء میں انقلابی طوفان اٹھا اور سامراجی کشتی ڈگمگانے لگی تو حکومت برطانیہ کو شدید خطرہ لاحق ہوا۔ ایک تو ہندوستان کے حالات دوسرے بین الاقوامی سیاست حکومت برطانیہ کے لئے تشویش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اصلاحات کے ذریعہ ہندوستانیوں کے بے چین قلوب کو طمانیت پہنچائی گئی۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی پستی اور ان کے مطالبات سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا سرسید کی ہدایت کے بموجب مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہے لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں بعض مسلمان محسوس کرنے لگے تھے کہ قومی تحریک میں ہمیں بھی شریک ہونا پڑیگا اور کانگریس کا ساتھ دینا ہوگا۔ حکومت کو یہ ڈر تھا کہیں مسلمان کانگریسی تحریک کا شکار نہ ہو جائیں چنانچہ حکومت نے مسلمانوں کے مطالبۂ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اور دیگر مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ مسلمان اپنی معاشی اور سیاسی حالت کو سدھارنے کی خاطر ملازمتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ مارلے نے اپنے ایک مکتوب

بنام منٹو کو لکھا کہ مسلمان سیاسی اصلاحات سے دس لاکھ مرتبہ زیادہ اہمیت ملازمتوں کو دیتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ ہندوستان کے آزاد خیال لوگوں سے ملکر اس اہم مسئلہ پر بحث کیجئے۔ اس لحاظ سے مسئلہ اقلیت اتنا ہی سماجی ہے جتنا کہ سیاسی۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ نیابتی ادارات اور ملازمت میں ان کا تناسب آبادی کے لحاظ سے نہیں بلکہ انکی سیاسی اور دفاعی خدمات نیز انکی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے ہو۔ حکومت نے ان مطالبات کو ہمدردی اور نیک نیتی سے زیادہ سامراجی مسلک کے تحت قبول کیا۔ اس تبدیلی اور مسلمانوں پر نوازش سے فطرتاً ہندوؤں کو شکایت کا موقع ملا اور ہندو مسلمانوں کے مخالف ہونے لگے۔ اس سے قبل ملازمتوں میں انھوں نے اجارہ قایم کرلیا تھا لیکن اب مسلمانوں کے لئے سرکاری خدمات محفوظ ہونے لگیں۔ ۲۵ ؍جنوری ۱۹۰۹ء کو جدید مقننہ کا افتتاح کرتے ہوئے لارڈ منٹو نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی نیابت کو وسیع کرنے سے ہندوستان بہت سی مصیبتوں سے بچ گیا۔ میرے خیال میں انتظامی مشنری کی توسیع سے وائسرائے اور حکومت ہند کے ہاتھ بہت مضبوط ہوگئے اور وہ عناصر ہماری مدد کو آگئے ہیں جو کبھی ہم سے ہمدردی نہیں نہیں رکھتے تھے[۱] جن عناصر کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا اشارہ ایک تعلیم یافتہ طبقے کی طرف ہے جو ملازمتوں کا تحفظ ہونے سے خاموش ہوگیا دوسرا اشارہ بہت ممکن ہے کہ مسلمانوں کی طرف ہو بکھین نے لکھا ہے کہ اصلاحات کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقے کو طمانیت پہنچی۔ چنانچہ وہ ریاست کا لازمی

---

[۱] لارڈ منٹو اور بکھین صفحہ ۳۰۳

اثرات رک گئے اور کچھ عرصے کے لئے قومیت کو صوبجاتی اور مقامی جذبات میں غرق کر دیا گیا[۲۶]

جب ہندوستان میں اصلاحات کے نفاذ کا اعلان ہوا تو بعض طبقات اور فرقہ جات کو تشویش ہونے لگی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ جو اختیارات ہندوستانیوں کو دیئے جانے والے ہیں ان میں کس کو کتنا ملیگا۔ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ہندو جو تعلیمی حالت میں سب سے آگے ہیں اور جن کی معاشی حالت اچھی ہے انھیں کو زیادہ اختیارات ملیں گے۔

ملک کے مختلف فرقوں اور طبقات میں جو تعلیمی اور معاشی توازن بگڑا اس کی ذمہ داری حکومت ہی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض طبقوں نے انگریزی تعلیم اور جدید ماحول سے بغاوت کر کے اپنی ترقی کو روکا۔ لیکن حکومت کی توجہ سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ تعلیمی اور معاشی توازن کے بگڑنے کے بعد ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کی ترقی سے نہ صرف حسد و رقابت کا مادہ پیدا ہوا بلکہ خوف بھی دامنگیر ہوا۔ ہندوستان میں جب ایک فرقہ ترقی کرتا ہے تو دوسرے فرقے کو خوف اور تشویش ہوتی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے جس سے ہندو مسلم تاجر پیشہ طبقات میں اتحاد ہو رہا تھا۔ تامیں تجارت کے سلسلہ میں ہر فرقہ متحد ہو رہا تھا۔ اس اتحاد کے بعد سیاسی اتحاد کے بھی امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایسے حالات میں حکومت برطانیہ نے قومی محاذ میں فرقہ واریت کے ذریعہ

---

[۲۶] لارڈ منٹو از بکھین صفحہ ۳۲۲۔

رخنہ ڈالا۔ حکومت برطانیہ نے مختلف جماعتوں اور مفادات کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ فرقوں اور مفادات میں توازن کے ذریعہ کمزوری پیدا کی گئی۔ توازن کی پالیسی کی ابتداء ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوتی ہے جبکہ نو مولود طبقات اور جماعتوں کے مفادات تسلیم کئے جانے لگے اور پھر توازن کی پالیسی کے تحت ان کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ اسی پالیسی کے تحت حکومت نے بنگال کے قومی ایوانِ کامرس کے قیام کی پرزور تائید کی جس وقت ہندوستان میں فرقوں جماعتوں اور مفادات کے نظریوں کی تشکیل ہو رہی تھی لارڈ منٹو ہندوستان آیا۔ اس نے ہندوستان میں انقلابی گھٹاؤں کو دیکھا وہ سمجھ گیا کہ بغیر کسی جدید نسخے کے حالات کا سنبھلنا مشکل ہے۔ چنانچہ تعلیم یافتہ طبقے کو حکومت میں شریک کیا گیا۔ دراصل برطانوی راج نے ملک کو اتنا بھوکا اور مفلس کر دیا تھا کہ ہر طبقہ حصول ملازمت کے درپے تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے کو حکومت میں شریک تو کیا گیا لیکن اس طبقے کی قوت کے روک تھام کی خاطر زمیندار طبقے اور جماعتوں کو کھڑا کیا۔ اب رہا مختلف طبقات کو خوش کرنے کا سوال تو مراعات عطا کی جاتی تھیں لیکن اختیارات اور ذمہ داری نہیں۔ حکومت اکثر اعتدال پسند عناصر کی امداد سے انتہا پسند عناصر کی قوت پہ توازن قائم رکھتی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ تو زمانے کی ترقی اور کچھ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت مختلف طبقات کے مفادات وجود میں آرہے تھے۔ ان جماعتوں کے وجود میں آنے سے آپس میں رقابت پیدا ہونے لگی۔ حکومت برطانیہ نے اپنی پالیسی کے تحت اختلاف کی آگ [illegible]

طالب علموں اور درمیانی طبقے کے خلاف کر دیا۔[۲۷]

۱۹۰۹ء کے قانون میں لچک پیدا کر کے دیسی رؤسا، جاگیردار، تجار وغیرہ کو زیادہ تعداد میں شریک کیا گیا۔ مسلم پیشہ ور جماعت کو ہندو پیشہ ور جماعت کے خلاف کھڑا کیا گیا۔[۲۸] جب مسلمانوں کی جانب سے مرکزی مجلس مقننہ میں مسلم زمیندار۔ وکلا و تجار وغیرہ کی نیابت کا مطالبہ کیا گیا تو اسے فوراً تسلیم کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس لئے بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ کیا کہ ہندو پیشہ ور طبقوں کی وجہ سے مسلمانوں کی پیشہ ور جماعتوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا حکومت چاہتی بھی یہی تھی کہ ہندو مسلم پیشہ ور طبقات کی رقابتی کشمکش شدید ہو اسی وجہ سے حکومت نے مجالس مقننہ کی توسیع میں تامل سے کام نہیں لیا۔ حکومت اعلیٰ اور دولتمند طبقات کے مفادات کے تحفظ سے ادنیٰ طبقات کی بے چینی پر توازن قائم کرنا چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد حکومت نے دیسی روساء کے ساتھ نرم پالیسی کی ابتداء کی۔ چنانچہ لارڈ لٹن ہی کے عہد سے برابر ایوان روساء کے قیام کی شد و مد سے کوشش کی جا رہی تھی لیکن ۱۹۱۹ء کے قانون میں اس کو جگہ دی گئی۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات سے ایک پست ذہنیت کا خوشامد کرنے والا طبقہ پیدا ہوا۔[۲۹] حکومت یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے دوسری جماعتیں

---

[۲۷] کرشنا۔ مسئلہ اقلیت صفحہ ۸۵۔

[۲۸] ایضاً صفحہ ۹۶۔

[۲۹] ایضاً صفحہ ۱۲۹۔

بھی اس قسم کا مطالبہ کرینگی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل کئی جماعتیں اور طبقات پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس فرقہ واری اور مفاداتی کشمکش سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو شدید صدمہ پہنچا۔

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے حالات کی رفتار کا اندازہ لگا کر ایک مناسب حل تجویز کیا۔ چنانچہ اس انقلابی ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے فرقہ واری مسئلہ یا مسئلہ اقلیت کو پیدا کیا گیا۔

۱۹۰۹ء کی اصلاحات ہندوستان کی دستوری تاریخ میں ایک تنقیدی باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے پیچیدگی پیدا ہونے لگی۔[۱] جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے بجائے رائے عامہ کے فرقہ داری رائے پیدا ہونے لگی۔ چونکہ حلقہ ہائے انتخاب علیحدہ تھے لہذا مقننہ میں بھی اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔ جوں جوں ۱۹۰۹ء کے بعد سے رائے دہندگی کی توسیع کی گئی۔ دونوں فرقوں کے رائے دہندوں میں اضافہ ہوا اور اسی اضافہ سے اختلافات اور بڑھنے لگے۔[۱] اصلاحات کے ذریعہ ملک کے اونچے اور معتدل خیال طبقے کو حکومت کی طرف کھینچ لیا گیا جس کو اب تک ہندوستانی سیاست میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ اس طرح توازن قوت کو برقرار رکھتے ہوئے ادارات کو زیادہ عمومی بنانے سے روکا گیا۔[۲۴]
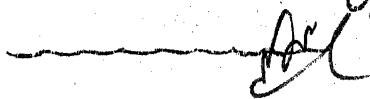
---

[۱] سر سید سلطان احمد۔ سلطنت متحدہ و ہندوستان کے درمیان ایک معاہدہ۔ صفحہ ۷۰۔

بہر کیف منٹو مارلے اسکیم نے فرقہ واری مسئلہ پیدا کر کے سامراج کا پیچ بچاؤ کیا۔ چنانچہ مارلے نے منٹو کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"ہم ایک سیاسی زبان بولتے ہیں اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر وقت ایک ہی چیز کہیں[۳۳]"

ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۳، و ۳۲ صفحہ ۹۹ - [۳۱] ہندو مسلم مسئلہ صفحات ۲۵ و ۲۶

[۳۲] مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ صفحہ ۲۸

[۳۳] لارڈ منٹو ازبکن صفحہ ۲۹۰

باب چہارم

ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد اور اسکے محرکات

میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء

۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں کو فرقہ وارانہ نیابت عطا کرنے کی بعض ہندوؤں نے شد و مد سے مخالفت کی اور یہ اعتراض کیا کہ ہندوستان کی اس طرح قومیت پر ضرب لگائی جا رہی ہے۔ یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ جداگانہ نیابت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات بڑھ جائیں گے اور آئندہ اتحاد ناممکن ہو جائے گا فرقہ وارانہ نیابت سے انتشاری قوتیں پیدا ہونگی مسلمانوں کو زیادہ اور جداگانہ نیابت دینے سے ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی ہوئی لیکن وہ خاموش رہے اور ارباب حکومت پر پہلے کی طرح اعتبار نہیں رہا۔[1]

---

[1] خطبات کانگریس۔ خطبہ صدارت بشن نارائن دھر ۱۹۱۱ء صفحات ۲۳، ۲۴۔

اب مسلمانوں کی جانب سے بلدی اور مقامی مجالس کے لئے بھی جداگانہ حلقۂ انتخاب کا مطالبہ ہونے لگا۔ مسلم لیگ کے لکھنؤ والے اجلاس ۱۹۱۲ء میں یہ قرار داد منظور کی گئی کہ مسلم فرقہ کے مفادات کے تحت فرقہ وارانہ نیابت مقامی جماعتوں کے لئے بھی ہونا چاہئے[1]۔ یہ کہا گیا کہ فرقہ وارانہ نیابت کی سخت مخالفت ہی سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی کتنی شدید ضرورت ہے اور کہا گیا کہ ہندو سیاسی محبّانِ وطن جو متحدہ ہندوستان چاہتے ہیں سیاسی رواداری نہیں جانتے۔ اس کے علاوہ جہاں مخلوط انتخابات رائج ہوئے وہاں مسلمانوں کو مایوسی ہوئی۔ اس وجہ سے بھی مسلمان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر زور دینے لگے۔ صوبہ متحدہ کی مجلس مقننہ کے لئے (۲) غیر سرکاری اراکین کا انتخاب کیا گیا۔ اس میں ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکا[2]۔ پنجاب میں جہاں کہ مسلمان اکثریت میں تھے مخلوط انتخاب میں ان کو ناکامی ہوئی۔ مجالس بلدیہ اور مجالس ضلع میں بھی ہندو حاوی تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۲ء کے انتخابات میں مجالس ضلع اور بلدیات سے مرکزی مجلس مقننہ کے لئے ایک مسلمان رکن بھی منتخب نہ ہو سکا[3]۔ انھیں صورت حالات کی بناء پر مسلم لیگ نے لکھنؤ ۱۹۱۲ء والے اجلاس میں بلدی اور مقامی مجالس میں بھی اصول جداگانہ نیابت کو مروج کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ اس وقت مسلمان ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو سمجھ چکے تھے۔ لیکن اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے

---

[2] کامریڈ ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۴۱

[3] صوبہ متحدہ کی مجلس مقننہ کے لئے دو سرکاری اراکین کی ضرورت تھی۔ (۳) امیدوار رائے سری رام، مدن موہن مالویہ اور نواب اسحاق۔ بالترتیب ۲۲، ۱۹ اور ۱۵ ووٹ ملے

اِنتخاب کا مطالبہ کرتے رہے۔ یہ کہا گیا کہ اگر مسلمانوں کو اپنی زندگی میں جداگانہ مفادات کا تحفظ نہ ہو تو جداگانہ حلقہ ہائے اِنتخاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلمان اپنی محرومی کی بنا پر جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرتے ہیں تو اصل مسئلہ حل کرنا ہوگا یعنی دونوں فرقوں میں جو تعصب اور اختلافات ہیں جس کی وجہ سے ایک وسیع خلیج پیدا ہوگئی ہے اس کو قومی اتحاد کے لئے پاٹنا ہوگا۔

...... یہ بھی کہا گیا کہ جب تک مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کو اپنے مخصوص مفادات کا تحفظ کرنا ہے کوئی عقلی بحث ان کو سیاسی جماعتیں بنانے سے باز نہیں رکھ سکتی یا کوئی طاقت ان کو ملک کے مجالس متقننات میں جداگانہ نیابت سے نہیں روک سکتی یہ کہا گیا کہ جب ایک مرتبہ جداگانہ نیابت کا اصول مجالس متقننہ کے لئے تسلیم کر لیا گیا تو اس اصول کا مقامی مجالس پر انطباق کرنے کی مخالفت کرنا غیر منطقی ہے۔ جداگانہ حلقہ ہائے اِنتخاب اس لئے ضروری سمجھے گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے زاویہ نگاہ اور زندگی میں بنیادی فرق تھا۔[۵]

۱۹۰۹ء کے بعد ایک طرف ہندو جماعت جداگانہ حلقہ ہائے اِنتخاب کی مخالفت کرنے لگی اور اس کو اصول قومیت کے منافی قرار دینے لگی تو دوسری طرف مسلمان اس کو اپنے وجود کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اسی زمانے میں انگلستان میں ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سر ڈبلیو ویڈربرن اور سر آغا خاں میں گفت و شنید ہوئی۔ ایک اتحاد کانفرنس کے قیام کی اسکیم طے پائی

ملاحظہ ہو بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲۔ اور مسلم امیدوار ناکام رہا۔ بحوالہ کامریڈ ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۴۱

[۵] اخبار کامریڈ ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۴۱

[۶] ایضاً ۱۱ جنوری ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۳

چنانچہ الہ آباد میں اس کا جلسہ ہوا۔ اس میں (۴۰) مسلمان اور (۶۰) ہندو اراکین شریک تھے۔ منجملہ اور امور کے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق جو امور طے پائے وہ یہ تھے۔ ایسی عدالتیں اور پنچائیتیں جن کے ذریعہ مصالحت کے لئے راستہ صاف کیا جا سکتا ہو ان کا قیام۔ طرفین سے جو بائیکاٹ کی کوشش جاری تھی اس کو روکنا بعض مخصوص محکموں میں ہندو یا مسلمان ہونے کی وجہ سے جو رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے اس جذبہ کو روکنا اردو ہندی اختلافات کا حل دریافت کرنا۔ بلدیہ اور مجالس ضلع میں مسلمانوں کی نیابت۔ آریہ سماج کی اشتعال انگیز تحریک کا سدباب کرنا گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجے کا حل۔ لیکن سر ویڈر برن کی یہ کوشش کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے بارآور ثابت نہ ہوسکی جب ایک ہندو لیڈر نے ۲۴ رجنوری ۱۹۱۱ء کو مرکزی مجلس متقنہ میں یہ قرارداد پیش کی کہ اصول جداگانہ نیابت ختم کردیا جائے چاہے وہ کونسل میں ہو یا مقامی مجالس سے متعلق ہو تو مسلمان برگشتہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ انیگلو انڈینس اس اتحاد کی کوشش کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ سر آغا خاں اور سر ویڈر برن کی ان کوششوں پر تنقید کرتے ہوئے ایک انیگلو انڈین اخبار نے لکھا کہ یہ دو اصحاب ان دو فرقوں میں اتحاد کیوں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تو یہ ۲ فرقے حکومت کے خلاف متحدہ ہو جائیں گے[۱]۔

۱۹۱۱ء کے بعد سے حکومت برطانیہ کی پالیسی کچھ ایسی رہی کہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت پر اعتماد باقی نہیں رہا۔ سر سید کی ہدایات کے بموجب مسلمان اپنا تحفظ انگریزوں کے وجود کے ساتھ وابستہ کر چکے تھے۔ سر سید کے انتقال کے

---

[۱] تاریخ کانگریس از پٹا بھائی سیتارامیا۔ صفحہ ۶ ، ۵

کئی سال بعد تک مسلمان انگریزوں کا دامن پکڑے رہے اور برادران وطن سے اتحاد کرنا پسند نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۱۱ء کے بعد حکومت برطانیہ کی پالیسی اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوئی تو مسلمانوں نے سمجھا کہ درحقیقت انگریزوں کو مسلمانوں سے ہمدردی نہیں۔ وہ نیک نیتی یا ہمدردی سے نہیں بلکہ سامراج کو ہندوستان میں مستحکم کرنے کے لئے مسلمانوں کی تائید کرتے ہیں جب انگریزوں سے مایوسی ہوئی تو مسلمانوں نے ہندوؤں کا دامن پکڑا اور ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو سمجھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض مسلمان قومی مفاد کے تحت کانگریس میں شریک ہونا مناسب سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ حکومت کی پالیسی سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت وقارالملک سرسید کی پالیسی سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ اس وقت بھی ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا تحفظ ہندوستان میں انگریزوں کے وجود سے وابستہ ہے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۲ء کو لیگ کے اجلاس بمقام کلکتہ میں سرسلیم اللہ خاں نے جہاں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ پر غم و غصہ کا اظہار کیا وہاں پھر سے حکومت کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا۔ اس وقت مسلمانوں میں ۲ گروہ پیدا ہو چکے تھے ایک حکومت سے مایوس ہو چکا تھا اور ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو سمجھنے لگا تھا۔ دوسرا گروہ باوجود مایوسی کے حکومت برطانیہ سے اپنی امیدیں وابستہ کر رکھا تھا۔ دراصل اس وقت مسلمانوں میں سرسید جیسی شخصیت موجود نہ تھی جو ان کو ایک مخصوص راستے کی نشاندہی کرتی۔ ابتدا میں مسلمانوں نے اپنے وجود کو انگریزوں سے وابستہ کر رکھا تھا۔ لیکن بعد میں یہ محسوس کیا کہ برادران وطن سے اتحاد سودمند ہوگا تقسیم بنگالہ کی تنسیخ ہی ایک ایسی ٹھوکر تھی جس کے بعد مسلم لیگ فرقہ واریت کے دائرے سے باہر نکل کر قومی میدان میں قدم رکھتی ہے۔ اب اس کے جلسوں میں مسلمانوں کے مطالبات کے

ساتھ ساتھ اہل ہند کے مفاد کے تحفظ کے لئے تجاویز منظور ہونے لگیں۔

اس زمانے میں ہندو مسلمانوں کے اس لئے مخالف ہو گئے تھے کہ مسلمان ایک تو جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرتے رہے اور دوسرے مسلمانوں نے حکومت کے خلاف جو سیاسی تحریکیں جاری کی گئی تھیں ان میں ہندوؤں کا ساتھ نہیں دیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو ملک کا غدار ٹھیرایا گیا۔

جن حالات کی بنا پر مسلمانوں نے انگریزوں سے اپنا اعتماد اُٹھا لیا اور ہندوؤں کے آگے دستِ تعاون بڑھایا وہ یہ تھے۔ حکومت برطانیہ کی خارجی حکمتِ عملی نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں کا مخالف کر دیا ۱۹۱۱ء میں اٹلی کا طرابلس پر حملہ اور روس کے شمالی ایران پر مظالم نے ہندوستانی مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ روس کی جارحانہ حکمت عملی سے مسلمان انگریزوں کے مخالف ہوتے جا رہے تھے اس لئے کہ ۱۹۰۷ء کے اینگلو رشین معاہدے کی رُو سے انگریزوں اور روسیوں میں مفاہمت ہو چکی تھی اس کے بعد جب ۱۹۱۲ء میں ترکی اور بلقان میں جنگ چھڑ گئی اور برطانیہ کی عدم مداخلت نے جس سے بلقان کے ساتھ ہمدردی کا شبہ پیدا ہونے لگا تھا مسلمانوں کو اور بھی مایوس کر دیا۔ جنگِ بلقان ۱۹۱۲-۱۳ء اسلام پر عام حملہ تصور کی گئی۔ دولِ مغرب ایک کے بعد دوسری اسلامی ممالک پر قبضہ کرتی جا رہی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس سے مسلمانوں کو تشویش ہونے لگی۔ شریفِ مکہ کی سلطانِ ترکی کے خلاف بغاوت کو برطانوی اشارہ پر محمول کیا جانے لگا۔ مراقش اور ایران کی اسلامی سلطنتوں کے خاتمہ کے بعد مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ عیسائی

طاقتیں اسلام کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔[8] بہرکیف حکومت برطانیہ کی خارجی حکمت عملی سے مسلمانانِ ہند کے جذبات کو ٹھیس پہنچایا۔ ایک طرف تو خارجی پالیسی سے مسلمان مایوس ہو چکے تھے اور دوسرے حکومت ہند کی داخلی پالیسی نے بھی ان کے احساسات کو مجروح کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام میں بعض قیود عائد کی گئیں۔ ۲۹ جون ۱۹۱۳ء کو کانپور کی مسجد کا واقع پیش آیا۔ جب سیدھی سڑک نکالنے کے لئے مسجد کا ایک حصہ منہدم کیا گیا تو مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ حکومت ان پر گولیاں چلائیں۔ اس واقعہ نے بھی مسلمانوں کے احساسات کو بری طرح مجروح کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں مولانا محمد علی۔ شوکت علی اور مولانا ابو الکلام آزاد کو نظربند کر دینے سے انگریزوں پر سے رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس کی وجہ مسلمان ہندوؤں سے اتحاد کرنے پر آمادہ ہوئے۔ برطانیہ کا اسلامی ممالک کے ساتھ جو سلوک رہا اس کی وجہ سے مسلمان ہندوستان کے فرقوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوئے اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو جو دھوکا دیا گیا اسکی وجہ سے بھی اتحاد کی اہمیت واضح ہونے لگی۔[9] یہی وہ ذہنی اور سیاسی پس منظر ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو میثاق لکھنو ۱۹۱۶ء کی منزل پر پہنچاتا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کے آثار ۱۹۱۳ء ہی سے پیدا ہو چکے تھے جبکہ لیگ نے اپنا مسلک حکومتِ خود اختیاری قرار دیا اور ہندو مسلم اتحاد

---

[8] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱۵

[9] خطبات کانگریس۔ خطبہ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۴۲

پر زور دیا۔ اسی سال بھو پندر ناتھ باسو نے بھی اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔
لیگ کے اس اجلاس میں کانگریس کے بعض ممتاز لیڈر بھی شریک ہوئے اب
لیگ فرقہ واریت کے محدود دائرے سے باہر نکل آتی ہے۔
۱۹۱۵ء ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام
رکھتا ہے۔ لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ بمبئی میں منعقد ہوئے
مسلم لیگ کے اجلاس میں ممتاز کانگریسی اراکین نے بھی شرکت کی اس وقت
لیگ کے اجلاس میں کانگریسی رضا کار بھی کام کر رہے تھے۔ ۱۹۱۵ء کے
اجلاس میں لیگ کی جانب سے کل ہند نوعیت کے معاملات کی بابت
قرارداد منظور کی گئی اور قومی حکومت کا مطالبہ ہونے لگا۔ صدر مسلم لیگ
مسٹر مظہر الحق نے ہندوستان کی ترقی کے لئے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔
اور کہا کہ لیگ اور کانگریس کا مشترکہ وفد حکومت برطانیہ کے سامنے اپنے
متحدہ مطالبات پیش کرے اور یہ بھی تجویز کیا کہ اس وفد کے قیام سے قبل
دونوں جماعتوں کے لیڈروں میں مشترکہ کانفرنس ہونی چاہیئے اور
اس کانفرنس کی سفارشات کو جملہ فرقوں کے سامنے منظوری کے لئے پیش
کیا جانا چاہیئے۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی نے بھی ہندو مسلم اتحاد پر زور
دیا۔ اس اجلاس میں یہ بھی تجویز پیش ہوئی کہ چونکہ آئندہ مستقبل قریب میں
اصلاحات دیئے جانے والے ہیں اس لئے مسلمانوں کی ایک کمیٹی اصلاحات
کا فارمولا مرتب کرے اور کانگریس سے مصالحت کی کوشش کرے۔ کانگریس
نے لیگ کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ ۱۹۱۵ء کے کانگریس کے اجلاس
کے صدر سنہا نے حکومت خود اختیاری پر زور دیا۔ جب لیگ اور کانگریس
کا سیاسی نصب العین ایک قرار پایا تو ان دونوں جماعتوں میں اتحاد

بعید از قیاس نہ تھا۔ اس سال کانگریس کی ساری جد و جہد ہندو مسلم اتحاد پر مرکوز رہی۔ چنانچہ پنڈت موتی لال نہرو کے مکان پر ۲۲۔۲۳ اور ۲۴ اپریل ۱۹۱۶ء کو لیگ اور کانگریس کی مجلس عاملہ میں بمقام الہ آباد گفتگو ہوئی اکتوبر ۱۹۱۶ء کو کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ کی کونسل نشست کی اور مابہ النزاع مسائل طے پائے۔ صرف پنجاب اور بنگال کی مقررہ نشستوں کو لکھنؤ میں طے کرنے کے لئے باقی رکھا گیا "انیسوں[۱۹] کی یادداشت" میں بھی کانگریس لیگ اسکیم کی تائید کی گئی۔ اس اسکیم میں پارلیمانی حکومت کا مطالبہ کیا گیا۔ اس یادداشت میں دستخط کرنے والوں میں سے ایک سکھ اور ۲ مسلمان تھے۔ بہرکیف ۱۹۱۳ء کے بعد سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو جد و جہد جاری تھی ۱۹۱۶ء میں بار آور ثابت ہوئی۔ اس سال کانگریس اور لیگ دونوں کے اجلاس بمقام لکھنؤ منعقد ہوئے۔ اور جو کانگریس لیگ اسکیم پر سمجھوتہ ہوا میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مجالس مقننہ میں نیابت کا مسئلہ حل کر لیا۔ اس میثاق میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت تسلیم کر لی گئی۔ مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت کا تناسب حسب ذیل مقرر کیا گیا[۱۰]۔

---

[۱۰] یہ اعداد حسب ذیل دو کتابوں سے بنائے گئے ہیں:۔

(الف) رپورٹ سیمن کمیشن جلد سوم صفحات ۳۲۲ تا ۳۲۳

(ب) رپورٹ برائے رائے دہندگی اور کمیٹی برائے تقسیم امور ۱۹۱۹ء صفحہ ۳۷۲۔

مجالس مقننات	آبادی کا تناسب فیصدی	مقرر کردہ نشستیں
پنجاب	۵۴ ء ۸	½ منتخبہ ہندوستانی اراکین
صوبۂ متحدہ	۱۴ ء ۰	۳۰ فیصد
بنگال	۵۲ ء ۶	۴۰ ″
بہار و اڑیسہ	۱۰ ء ۵	۲۵ ″
صوبہ متوسط	۴ ء ۳	۱۵ ″
مدراس	۶ ء ۵	۱۵ ″
بمبئی	۲۰ ء ۴	⅓
مرکزی مجلس مقننہ	۲۶	۳ ء ۳۳ ″

مرکزی مجلس مقننہ کی بابتہ یہ طے پایا کہ اس کی تعداد ۱۵۰ ہو۔ اراکین کا (⅘) حصہ منتخب ہو۔ حق رائے دہی وسیع کی جائے اور صوبجاتی مجالس مقننہ کے اراکین مرکزی مجلس مقننہ کے اراکین کا انتخاب کریں اور یہ طے پایا کہ کسی جماعت کے (¾) اراکین اگر کسی قرارداد کی جو اس جماعت کو متاثر کرتی ہو مخالفت کریں تو وہ منظور نہیں کی جائے گی لیکن ۱۹۰۹ء کے قانون میں مسلمانوں کو عام انتخابات میں ووٹ دینے کا جو حق دیا گیا تھا وہ واپس لے لیا گیا۔

کانگریس لیگ اسکیم کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ عاملہ مقننہ کے تابع ہوگی۔ وزیر ہند کی کونسل برخاست کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت خود اختیاری کی بابت لیگ اور کانگریس نے متحدہ مطالبہ پیش کیا۔ گورنر سیول سروس کا

ممبر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کی کونسل کے آدھے ہندوستانی اراکین ہوں جن کا انتخاب صوبجاتی مجالس مقننہ کریں گی۔ گورنر کی کونسل کے (۶) اراکین ہوں گے۔ بڑے صوبوں کی مجالس مقننہ میں (۱۲۵) ۔۔۔ اور چھوٹے صوبوں میں (۵۰) اراکین سے کم نہوں۔ انتخابات راست اور وسیع ہوں صوبہ واری اور مرکزی ذرائع مالگزاری کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ صوبہ واری کونسلوں کو صوبہ واری مالیہ پر کامل اختیارات[۱۱] ہوں۔ صوبہ واری مجالس مقننہ کو قانون سازی میں مکمل اختیارات حاصل ہونے چاہیئے۔ عاملہ کو ذمہ دار قرار دیا جائے۔ لیکن مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم میں اس مطالبہ پر اعتراض کیا گیا اس لئے کہ حقیقی حلقہ ہائے انتخاب وجود میں نہیں آئے تھے۔ دوسرے یہ اعتراض تھا کہ مقننہ کو ایسے اختیارات[۱۲] دینا جس سے عاملہ بے بس ہو جائے مناسب نہیں۔ اس وقت نہ حقیقی معنوں میں نمائندہ مجالس تھیں اور نہ کوئی انتخابی طریقہ موجود تھا[۱۳]۔ کانگریس لیگ اسکیم اس لئے ٹھیک نہیں تھی کہ اس میں مقننہ اور عاملہ کو اختیارات تو پارلیمنٹ کے ذریعہ حاصل تھے لیکن ان کی ذمہ داری حلقہ ہائے انتخاب کے سامنے نہیں قرار دی جا سکتی تھی[۱۴]۔ کانگریس لیگ اسکیم کے تحت جو اہم مطالبہ کیا گیا وہ یہ تھا کہ مقننہ کو قانون سازی اور موازنہ پر مکمل اختیارات ہوں۔ لیکن جائینٹ سیلکٹ رپورٹ میں اس مطالبہ پر بھی اعتراض کیا گیا[۱۵]۔

---

۱۱ مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱۱۲

۱۲ ایضاً ۱۳ ایضاً ۱۴ مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱۱۳

میثاق لکھنو ۱۹۱۶ء کے ذریعہ کانگریس اور لیگ نے حکومت کے سامنے متحدہ مطالبات پیش کئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۶ء کو پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا سیاسی اتحاد عمل میں آیا۔ ۱۹۱۶ء کی کانگریس کے صدر مسٹر امبا چرن موزمدار نے کہا کہ[1] "ہندوؤں اور مسلمانوں کا کھیل پورا پورا کھیلا جا چکا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس مسئلہ کو تقریباً حل کر لیا ہے۔ کانگریس اور لیگ کا اجلاس ایک مقام پر ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ وہ ایک ہی مقام ایک ہی وقت اور ایک ہی پنڈال میں ہوگا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے نزدیک آرہے ہیں اور یہ معجزہ ہوگا اگر وہ ایک مرکز پر نہ آئیں اس لئے کہ ان کو ایک بے پناہ قوت مرکز کی جانب کھینچ رہی ہے۔ ہندو مسلم اختلافات ادنیٰ طبقے میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی اہمیت کو مبالغے کے ساتھ بیان کرنا مناسب نہیں اور نہ یہ انصاف کا تقاضہ ہے۔ ہر دیسی ریاست میں ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ حیدرآباد کی مسلم ریاست میں (۷۰) فیصد ہندو آباد ہیں اور کشمیر کی ہندو ریاست میں (۶۰) فیصد مسلمان مگر یہاں نہ محرم میں فساد ہوتا ہے اور نہ گاؤکشی پر جھگڑا۔ دونوں فرقوں کے تعلقات خراب نہیں اور پھر تعجب ہوتا ہے کہ دیسی ریاستوں میں ہندو مسلم تعلقات اچھے ہیں لیکن برطانوی ہند میں ایسا کیوں نہیں ہندوستان کے پارسی اور نہ مسلمان شاہ ایران سے یا سلطان ترکی سے وفاداری وابستہ رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح وہ بھی ہندوستانی ہیں

---

[1] خطبات کانگریس۔ صفحات ۲۶۵ تا ۲۷۰۔

اس کے بعد صدر کانگریس نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ میں کسی راز کو افشا نہیں کر رہا ہوں اگر یہ اعلان کر دوں کہ ہندو مسلم مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ہندو مسلمان حکومت اختیاری کے متحدہ مطالبہ پر متفق ہو چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ صرف بیج بو دیے گئے ہیں ۔ اور پودے ابھی ابھی ابھرائے ہیں۔ خدا کے واسطے غلے کی تقسیم کے لئے مت لڑو۔ فصل ہماری متحدہ مساعی کی محتاج ہے۔"[۱۵]

میثاق لکھنؤ کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں نشستوں کی جو تقسیم عمل میں آئی تھی اس کا اصول یہ تھا کہ اگر مسلمان حکومت سے مل جاتے تو ہندوؤں کو شکست دے سکتے تھے۔

اور اگر ہندوؤں سے ملجاتے تو حکومت کو شکست دے سکتے تھے۔ اس ضمن میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں نے بڑے ایثار سے کام لیا۔ بعض مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی کی کہ بنگال اور پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہوتے ہوئے آبادی کے تناسب سے کم نشستیں کیوں قبول کریں۔ در اصل میثاق میں یہ اصول ملحوظ رکھا گیا کہ ایک فرقہ کو صرف اس وقت زیادہ نشستوں کے ذریعہ تحفظ عطا کیا جائے جبکہ وہ اقلیت میں ہو چونکہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان اکثریت میں تھے اس واسطے وہ تحفظ کے مستحق نہیں سمجھے گئے۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ میں مفاہمت ہندو مسلمان پیشرو طبقات کے متحدہ محاذ کی ابتداء کو نمایاں کرتی ہے مسلمانوں نے محسوس

---

[۱۵] خطبات کانگریس صفحات ۲۰۱

کرلیا کہ جب تک ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت ہے ان کے مفادات اور ہندوؤں کے مفادات میں فرق نہیں۔[۱۶] ہندو مسلم پیشہ ور طبقات کے اتحاد اور متحدہ محاذ نے ۱۹۱۹ء کی اصطلاحات کے اعلان پر مجبور کیا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں جو اتحاد پیدا ہوا وہ خود پیشہ ور طبقات کا اتحاد تھا۔ اس میثاق سے خود مسلمانوں کے اتحاد پر روشنی پڑتی ہے۔ بنگال کے مسلمانوں نے آبادی کی ۳/۴ نشستیں اور پنجاب کے مسلمانوں نے ۱/۵ نشستیں قبول کیں تاکہ اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کو زیادہ نشستیں ملیں اس سے مختلف صوبوں کے مسلمانوں میں اتحاد اور یگانگت کا پتہ چلتا ہے۔[۱۷]

مسٹر مانٹیگو کو کانگریس لیگ اسکیم سے اتفاق تھا اور نہ "انیس کی یادداشت" پسند تھی۔ لارڈ سڈن ہیم نے "انیس کی یادداشت" کو انقلابی قرار دیا اور کہا کہ ہندوستان میں جرمن سازش کام کر رہی ہے اور بعض اعتدال پسند بھی انتہا پسندوں کے اثر میں آکر انقلاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔[۱۸] کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند نے حالات پر قابو پانے کے لئے مقامی حکومتوں کو اس ضمن میں متنبہ کیا تھا۔ چنانچہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر اور مدراس کے گورنر نے عوام کو اس شورش سے علٰحدہ رہنے کی ہدایت فرمائی۔

۱۶؎ کرشنا۔ مسئلہ اقلیت صفحہ ۱۵۰

۱۷؎ رپورٹ برائے راے دہندگی وتقسیم امور ۱۹۱۹ء صفحہ ۳۷۲

۱۸؎ مسلم ہندوستان از محمد نعمان صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۲

آسام کے چیف کمشنر نے کہا کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دینا ایک بڑی غلطی ہے[۱۱۹]۔ یہ اعتراض بھی ہوا کہ جہاں مسلمان زیادہ ہیں ان کو تناسب سے کم اور جہاں کم ہیں تناسب سے زیادہ نشستیں دینا ناانصافی ہے مگر میثاق کی روح کچھ اور تھی۔ مسلمان اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ جن صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں وہاں تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کی جائیں تاکہ اپنے سیاسی و مذہبی مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ اور جہاں اکثریت میں ہیں اگر کم نشستیں ملیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اعتراض بھی ہوا کہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچایا جا رہا ہے اتنا ہی دوسرے فرقوں کا حق مارا جائے گا۔ ایک مرتبہ مسلمانوں کو آبادی سے زیادہ نیابت عطا کرنے سے مستقبل میں بطور نظیر کے پیش کیا جائے گا۔ یہ اعتراض بھی ہونے لگا کہ جن جماعتوں نے کانگریس لیگ اسکیم کی تدوین میں حصہ لیا وہ نمائندہ جماعتیں نہ تھیں۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی جملہ جماعتوں کی نمائندہ نہ تھی اور کانگریس نہ پست اقوام کی نمائندہ تھی اور نہ غیر برہمنوں کی[۱۲۰]۔

واقعہ یہ میثاق لکھنؤ کی تدوین میں نمائندہ جماعتوں ہی نے حصہ لیا۔ اس لئے کہ کانگریس اور لیگ سے زیادہ نمائندہ جماعتیں ہندوستان میں اس وقت موجود نہ تھیں۔ البتہ بعض مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس اسکیم سے اتفاق نہ تھا اور حکومت بھی ہندو مسلم اتحاد سے خائف ہو گئی تھی چنانچہ حکومت ہند نے اپنے مراسلہ بنام وزیر ہند میں میثاق کی مخالفت کی[۱۲۱]۔

---

۱۱۹ رپورٹ ہیومن کمیشن جلد سوم صفحہ ۱۲۴۔

۱۲۰ " " رپورٹ بیدی کمیٹی " ۱۳۵

۱۲۱ " " " " ۱۳۴

اکثر انگریزوں نے اس کی مخالفت کی۔ صوبہ متوسط کے چیف کمشنر نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے اصول سے اختلاف کیا اور آسام کا کمشنر بھی اس اصول کا مخالف تھا۔ ڈبلیو۔ ایچ ونسنٹ نے لکھا کہ بعض مسلمانوں کے نزدیک لیگ ان کے مفادات کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔[222]

اس مخالفت کے باوجود حکومت ہند جانتی تھی کہ میثاق کو ملک کے بڑے طبقے کی تائید حاصل ہے۔ چنانچہ حکومت نے اپنے مراسلہ میں لکھا کہ میثاق سے سب کو اتفاق ہے۔ اگر اس سے انحراف کر کے کوئی اصول بنائے جائیں تو پھر سے اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ ہم کو میثاق کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اگرچہ کہ حکومت بمبئی اور مدراس کو اس سے اتفاق ہے۔[223] کانگریس لیگ میثاق تسلیم شدہ حقیقت ہے اور ہندوستان سیاست میں نشان منزل کا کام دیتا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[224] حکومت ہند نے یہ بھی لکھا کہ میثاق سنجیدہ سوچ سے زیادہ سیاسی مفاہمت کا نتیجہ ہے۔ پنجاب کے قدامت پسند مسلمان اور بنگالی مسلمان اس کے مخالف ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلم فرقہ اس کو تسلیم کرتا ہے اور پھر منظم ہندو سیاسی خیال بھی اس سے متفق ہے۔[225] میثاق لکھنؤ کی بابت جائینٹ رپورٹ میں درج ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا متحدہ

---

[222] کمیٹی برائے رائے دہندگی رپورٹ آف ڈیفٹ از ونٹ صفحہ ۳۰۷

[223] رپورٹ ” ” (مراسلہ حکومت ہند صفحہ ۲۷۱)

[224] ” ” ” ” ۲۷۳

[225] ” ” ” ” ”

محاذ ہے جس کو ہندوستان کا ہر بہی خواہ پسند کرتا ہے۔ میثاق حالات کی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے۔ چنانچہ حکومت کو ایک نئی پالیسی کی ضرورت ہے۔ لارڈ چیمز فورڈ کی حکومت نے کہہ دیا تھا کہ بغیر نئی پالیسی کے اعلان کے حکومت کرنا بہت مشکل ہے[۲۶] کانگریس لیگ اسکیم نہایت مکمل اور ہندوستانی اہم سیاسی جماعتوں کی مستند دستاویز ہے۔ اس کو پوری تائید حاصل ہے[۲۷] دسمبر ۱۹۱۶ء کا مظاہرہ اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ مشترکہ مقاصد کے لئے شدید اختلافات ختم کئے جا سکتے ہیں[۲۸] یہ قومی جذبات کی بڑھتی ہوئی قوت کا مظاہرہ تھا[۲۹] جائنٹ رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ میثاق کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں فرقوں کے مذہبی اختلافات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس اتحاد کو آخری فیصلہ نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ جب تک دونوں فرقے اپنے علیحدہ مفادات کو محسوس کریں گے اُس وقت تک مذہبی دشمنی کا برقرار رہنا یقینی ہے۔ ہندو اور مسلمان ابھی تک متحد المقاصد نہیں ہوئے ہیں اور نہ مشترکہ مفاد کو محسوس کرتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کو بڑی مسافت طے کرنی ہے۔ حالیہ واقعات سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ مذہبی جھگڑے آئندہ بھی وقوع پذیر

---

[۲۶] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱۲

[۲۷] 〃 〃 〃 ۱۰۲

[۲۸] 〃 〃 〃 ۹۸

[۲۹] 〃 〃 〃 〃

ہوتے رہیں گے[۲۳]

میثاق لکھنؤ کے بعد درحقیقت حکومت بڑی مشکلات سے دو چار ہو گئی بغیر جدید پالیسی کے اعلان کے حالات سنبھل نہ سکتے تھے۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان سے ہندوستان میں ایک عام طمانیت محسوس کی گئی۔

---

۲۳ مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحات ۹۸ تا ۹۹

۱۹۱۹ء کی اصلاحات اور اقلیتیں

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اہل ہند نے حکومت برطانیہ کو ہر قسم کی ممکنہ امداد بہم پہنچائی۔ اہل ہند اپنی ان خدمات اور ایثار کا صلہ اصلاحات کی شکل میں چاہتے تھے۔ اس دوران میں ہندوستان میں قومی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات نے کافی قرار دی گئی۔ مسٹر تلک اور مسز اینی بسنٹ ہوم رول کی تحریک چلا رہے تھے۔ میثاق لکھنؤ کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا زبردست مسئلہ حل ہو چکا تھا ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔ "انیس کی یادداشت" میں ہندوستان کے قومی مطالبات پیش کئے گئے تھے۔ ایک سوسائٹی جس کو مدراس پارلیمنٹ کہتے ہیں اس نے ایک

دستور مرتب کیا۔ اس میں اقلیتوں کو آبادی کے تناسب سے نیابت عطا کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور اہم اقلیتوں کے لئے جداگانہ نیابت تجویز کی گئی۔ ہندوستان میں ایک پارلیمنٹ کی سفارش کی گئی۔ جس کے (۲۰۰) اراکین ہوں۔ ان میں سے آدھے صوبوں کی نمائندگی کریں گے اور بقیہ زمیندار۔ تجار، صنعتی جماعتیں وغیرہ کی: ۱۰اراراکین کی ایک کابینہ بنائی جائے۔ ۵ کا تقرر وائسرائے کرے گا اور ۵ کا انتخاب پارلیمنٹ کی جانب سے عمل میں آئے گا۔ بہرکیف ۱۹۰۹ء کے دستور کو ناکافی قرار دیا گیا اور حکومت خود اختیاری کے میدان میں ترقی پسند اقدام کا مطالبہ کیا گیا۔ ایسے حالات میں ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے پارلیمنٹ میں ملک معظم کی پالیسی کا اعلان کیا" ملک معظم کی حکومت پالیسی جس سے حکومت ہند کو بالکلیہ اتفاق ہے یہ ہے کہ انتظام حکومت کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھائی جائے اور بتدریج حکومت خود اختیاری کے ادارات کی ترقی ہو تاکہ ہندوستان میں تدریجاً ذمہ دارانہ حکومت کا قیام عمل میں آئے اور جو سلطنت برطانیہ کی جزو سلطنت رہے گی ....
اس کی اس ملک میں ترقی کی پالیسی درجہ بدرجہ ہی ہو سکتی ہے۔ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند جس پر ہندوستانیوں کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے یہ ترقی کے وقت اور پیمانہ کا تعین کریگی ....
اس تجویز کو جو کہ چند دن کے اندر پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی جائے گی پبلک کو کافی بحث و تمحیص کا اختیار عطا کیا جائے گا[1]"

---

[1] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱

اس اعلان سے قومی تحریک کے علمبردار بڑی حد تک مطمئن ہو گئے اس سے قبل ۲۵۔ اگست ۱۹۱۱ء کو حکومت ہند نے ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت میں شریک کرنے کی تائید کی تھی اور کہا تھا۔ آہستہ آہستہ صوبوں کو بڑی حد تک حکومت خود اختیاری دینا چاہیئے حتیٰ کہ ہندوستان بالآخر متعدد انتظامی اکائیاں بن جائے اور صوبہ وارانہ معاملات کی حد تک بالکل آزاد رہے[۱] " ۱۹۱۶ء کو مسٹر کرٹس ہندوستان آئے اور حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان کے لئے " دوعملی"[۲] کا اصول پیش کیا اور ہندوستان کی آئینی ترقی کی منزل قلمرو بی درجہ قرار دیا۔ اس کے بعد وزیر ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان تشریف لائے تاکہ حالات کا بچشم خود مطالعہ کریں۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں مکمل فرمہ دارانہ حکومت عطا کرنے سے اختلاف کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ایک تو ہندوستان کے حالات اس قسم کی حکومت کے لئے سازگار نہیں دوسرا حکومت ہند وزیر ہند کے توسط سے انگلستان کی پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہے لہذا ہندوستانیوں کو مکمل اختیارات حوالے نہیں کئے جاسکتے مجالس مقننہ میں غیر سرکاری اراکین کے اضافے کی سفارش کی گئی اور حتی الامکان راست انتخابات پر زور دیا گیا۔ اگرچہ کہ فرقہ وارانہ نیابت کی مخالفت کی گئی اور اس کو ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں رکاوٹ تسلیم کیا گیا لیکن حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو تسلیم کیا گیا۔

---

[۱] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ششم صفحہ ۵۵۵

[۲] ڈایرکی

ہندوستانی قائدین ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے مسلسل دباؤ ڈالتے رہے۔ ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں حکومت میں شریک کرنے کے برابر مطالبے ہوتے رہے۔ اس وقت انتخابی طریقوں میں جو برائیاں تھیں اس کو جائینٹ رپورٹ میں تسلیم کیا گیا۔ ایک تو محدود رائے دہندگی دوسرا رائے دہندوں اور اراکین مجالس مقننہ میں بہت کم ربط تھا۔ رائے دہندوں کے قانون پر اثرات نہیں پڑتے تھے۔ وکلاء کو ضرورت سے زیادہ نیابت حاصل تھی۔ عام طور پر سرکاری عہدہ داروں کو سوالات کرنے کا یا قرار دادیں منظور کرنے کا۔ مباحثوں میں مداخلت کا یا اعتراض عاید کرنے کا حق نہ تھا[۵۵]۔ کونسل میں ہندوستانی عہدہ دار بہت کم ہوتے تھے اور پھر غیر سرکاری عہدہ داروں میں انگریز تھے جو حکومت کی تائید کرتے اور جس کی وجہ سے ہونے والی کارروائی کا قبل از وقت پتہ چل جاتا تھا اور مباحثوں میں جان نہیں رہتی تھی[۵۶]۔ غیر سرکاری اراکین کی بہت کم کونسل میں آواز موثر ثابت ہوتی تھی۔ چنانچہ غیر سرکاری اراکین کے اضافہ کی سفارش کی گئی یا تو خود ہم کو حکومت کرنی چاہئیے یا عوام کو حکومت کرنے کا موقع عطا کیا جائے درمیانی راستہ مناسب نہیں[۵۷]۔ منٹو مارلے اصلاحات سے جو امیدیں وابستہ کی گئی ان کی مدت حیات بہت کم ثابت ہوئی۔ ۹ سال کے اندر اندر

---

[۵۵] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۵۵

[۵۶] ،، ،، ،، ۵۶

[۵۷] ،، ،، ،، صفحات ۶۶ تا ۶۸

ان اصلاحات نے اپنی افادیت کھو دی اور عوام کے لئے قابل قبول نہ رہیں[۱] محدود رائے دہی اور بالواسطہ انتخابات کی وجہ سے اراکین میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہ ہو سکا۔ حکومت کے ہاتھ میں اقتدار تھا اور کونسلوں کو صرف تنقید کا حق حاصل تھا۔

جائینٹ رپورٹ میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کا واضح چربہ اتارا گیا اور اسی روشنی میں نیابت کی مشکلات اور فرقہ وارانہ مسائل کی پیچیدگی سے بحث کی گئی[۲] چونکہ ملک نہایت وسیع ہے اور آبادی میں تنوع ہے۔ لہٰذا یکساں نوعیت کے اصلاحات وضع کرنا بہت مشکل ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں زندگی بسر کرتا ہے دیہاتی بہت کم شہروں کو آتے ہیں۔ ان کو انتخابات اور نیابتی مجالس سے دلچسپی نہیں۔ پارلیمنٹ یا مقننہ کا نام تو انھوں نے سنا ہی نہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد بہت کم ہے تعلیم میں آریا۔ برہمن۔ پارسی وغیرہ پیش پیش ہوتے ہیں۔ مسلمان تعلیم میں بہت پست ہیں۔ ان کی معاشی حالت ٹھیک نہیں۔ صرف تعلیم یافتہ لوگوں کی مٹھی بھر تعداد اصلاحات کا مطالبہ کرتی ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ جاہل اور پست ہے کاشتکاروں اور زمینداروں کے مسائل پر شملہ یا دہائیٹ ہال میں توجہ نہیں کی جاتی۔ کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات اچھے نہیں ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ حکومت میں شریک ہونا

---

[۱] مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ صفحہ ۸۸

[۲] " " " صفحہ ۹۴ تا ۹۹

چاہتا ہے۔ آئندہ ترقی کا انحصار اس امر پر ہے کہ کس حد تک تعلیم یافتہ
ہندوستانی جاہل عوام کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ اور کس حد تک اس کو جاہل
عوام سے دلچسپی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی سماجی اور پبلک خدمات انجام
دینے لگا ہے۔ مغربی تعلیم سے ہندوستانی بیرونی دنیا سے واقف ہونے
لگے ہیں۔ سماجی اور مذہبی رسوم میں اتنی سختی نہ رہی۔ اتحاد کا جذبہ بڑھ
رہا ہے۔ اس کے باوجود اہم سیاسی اور سماجی مسائل پر تعلیم یافتہ ہندوؤں
اور مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے نے جو فضا پیدا کر دی ہے
اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے سیاسی۔ مذہبی اور
سماجی حالات سے نیابت کی توسیع میں مشکلات آتی ہیں۔ بعض ایسے
علاقے ہیں جہاں نیابتی ادارات کی ترویج محض تصوری حیثیت رکھتی ہے
ہر جگہ لوگ اتنے جاہل اور پست ہیں کہ رائے دہندگی کی کسی شرط پر نہیں
اترتے۔ جو لوگ آزاد ادارات کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی تعداد پانچ
فی صدی سے زیادہ نہیں لیکن اس طبقے کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔
ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی آزادی کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے
ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی کی یہ خواہش ہے کہ اس کے ملک کی محکومی ختم
ہو جائے اور ہندوستان دنیا کی صف میں سلطنت کا خود اختیار جزبن جائے
ہندوستان میں جاگیردار طبقہ کافی اہمیت رکھتا ہے وہ اپنے اثرات۔
تعلیم اور حیثیت کے لحاظ سے پبلک امور میں خاطر خواہ حصہ لے سکتا ہے
ہندوستان میں اکثر لوگ سماجی اصلاحات کی مخالفت کرتے ہیں۔ تعلیم کی
پستی سے حکومت خود اختیاری کے تجربہ کو ابتدا میں پریشانی ہوگی لیکن بعد میں
یہ دشواری ترقی کے ساتھ ساتھ رفع ہو جائے گی۔ جب تک پست اقوام

اپنے مفادات کا تحفظ نہ کرسکیں حکومت کو ان کا تحفظ کرنا چاہیئے حتیٰ کہ وہ تحفظِ ذاتی کا سبق سیکھ جائیں۔ اگر ان کے مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہو تو حکومت ان کی معاونت کرے۔ اس عبوری دور میں حکومت کو چاہیئے کہ مفادات کے تحفظ کا ذمہ اپنے کندھوں پر لے۔

فرقہ وارانہ نیابت اور فرقہ وارانہ مسائل

سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل ہندوستان کے مختلف فرقوں میں کافی سیاسی شعور پیدا ہوچکا تھا۔ پست طبقات اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ پنجاب کے سکھ بمبئی کے مرہٹے اور مدراس کے غیر برہمن مسلمانوں کی طرح جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرنے لگے۔ چنانچہ جس وقت مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے حالات کا بچشم خود مطالبہ کرنے آئے اس وقت ہندوستان کی متعدد سیاسی و معاشی انجمنیں نیز مختلف فرقوں نے ان کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کیا۔ جب حکومت برطانیہ کی جانب سے ذمہ دارانہ حکومت کا وعدہ کرلیا گیا تو مختلف فرقوں۔ جماعتوں اور طبقات کو اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کی سوجھی۔ اس عرصے میں مختلف فرقوں اور طبقات میں کافی سیاسی شعور پیدا ہوچکا تھا۔ ہندوستان میں ہر وقت دستوری اصلاحات سے قبل مختلف فرقوں اور طبقات میں ہیجان پیدا ہوتا رہا ہے۔ ہر طبقہ نافذ ہونے والے اصلاحات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اس لیئے کہ اصلاحات فرقوں۔ طبقات اور جماعتوں کی معاشی و سیاسی حالت کو متاثر کرتے ہیں خصوصاً اونچے متمول طبقات مثلاً جاگیردار۔ زمیندار۔ تجار اور صنعتی طبقہ وغیرہ۔ یہی طبقہ بالعموم سیاسی

تحریکوں میں حصہ لیتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ سیاست میں حصہ لے کر وہ اپنے مفادات کا تحفظ بہتر طریقے پر کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس میں تاجر۔ صناع۔ جاگیردار وغیرہ کثیر تعداد میں شریک ہو رہے تھے اس لئے کہ یہ جماعتیں حکومت سے اپنے مطالبات کو منوا سکتی ہیں۔ اس مقام پر اگر مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے اس لئے کہ صناع۔ تاجر۔ زمیندار وغیرہ مذہب کے نام سے اپنے مطالبات میں استحکام پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہندو تاجر کا مقابلہ مسلمان تاجر سے اور ہندو صناع کی مسابقت مسلمان صناع سے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ طبقات اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مذہب کا دامن پکڑتے ہیں اور فرقہ واریت پیدا کرتے ہیں در اصل ہر فرقہ کا متمول طبقہ یہ الجھن پیدا کرتا ہے اس لئے کہ اصلاحات سے ان کے مفادات متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہندوستان میں کئی دساتیر اب تک نافذ ہو چکے ہیں لیکن طبقہ عوام کاشتکار وغیرہ جو زیادہ تعداد میں ہیں ان کی حالت جو کمپنی کے ابتدائی تسلط کے زمانے میں تھی اس سے آج بہت زیادہ مختلف نہیں۔ صناع۔ زمیندار۔ جاگیردار۔ تاجر وغیرہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سیاسی تبدیلیوں سے ان کے مفادات متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا اصلاحات کے نفاذ سے پیشتر ہر فرقہ کی یہی دوڑ دھوپ رہی کہ دئیے جانے والے مراعات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ ہندوستانی فرقوں اور طبقات کی اس رقابت اور کشمکش سے برطانوی مدبرین نے سامراج کے استحکام اور بقا کا سامان فراہم کیا۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ میں درحقیقت پیشہ ور طبقات نے آپس میں مفاہمت کی تھی۔ ۱۹۱۶ء کو کانگریس کے انتہا

پسندوں اور اعتدال پسندوں میں اتحاد ہوگیا جبکہ مسٹر تلک۔ سورت کی ۱۹۰۷ء کی پھوٹ کے بعد پہلی مرتبہ کانگریس میں داخل ہوئے لیکن یہ اتحاد زیادہ دن تک برقرار نہ رہا۔ ۱۹۱۸ء میں انتہا پسندوں کو کانگریس میں اکثریت حاصل ہوگئی جس کے بعد اعتدال پسندوں نے کانگریس سے نکل کر "آل انڈیا لیبرل فیڈریشن" کو قائم کیا۔ ۱۹۰۷ء کو بمقام سورت ہندو پیشہ ورطبقات انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ دراصل یہاں بھی مفاد کا مسئلہ تھا۔ تقسیم بنگالہ کی ہندوؤں کی جانب سے جو مخالفت ہوئی اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے ہندو پیشہ ورطبقات کے مفادات متاثر ہو رہے تھے اور ہندوں کا دائرہ ملازمت جو سارے بنگال میں پھیلا ہوا تھا متاثر اور محدود ہو رہا تھا۔[۱۰] بنگال کا مشرقی صوبہ علیحدہ کر دینے سے ایک تو ہندو پیشہ ورطبقوں کے مفادات متاثر ہو رہے تھے تو دوسرے ان کے لئے ملازمت کا حلقہ تنگ ہونے کا اندیشہ تھا۔ مسلمانوں نے تقسیم بنگالہ کی اس لئے تائید کی کہ وہ ایک علیحدہ صوبے میں اپنے مفادات کا بہتر طریقے سے تحفظ کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ اس تقسیم سے ہندوستان کی قومیت پر ضرب لگائی جا رہی ہے اسی طرح جب ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے حکومت خود اختیاری کی قرارداد منظور کی تو مسلمانوں کا ایک طبقہ جو یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو بحیثیت اقلیت کے جو حقوق حاصل ہیں متاثر ہوں گے اس نے اس قرارداد سے

بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۶) [۹] کرشنا مسئلہ اقلیت صفحہ ۱۵۰

[۱۰] اجیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۱۱۱

اختلاف کیا۔ انھیں اختلافات کا نتیجہ تھا کہ آغا خاں مسلم لیگ کی صدارت سے دست کش ہوگئے۔ اگرچہ کہ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ کے ذریعہ ہندو مسلم سیاسی اتحاد ہو چکا تھا لیکن مسلمانوں کا ایک قدامت پسند طبقہ جس کے مفادات متاثر ہوتے تھے میثاق کا مخالف ہوگیا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتیں اکثر آزادی سے زیادہ اپنے مفادات کے تحفظ میں برسرِ عمل رہی ہیں۔

سیاسی جماعتیں اور معاشی انجمنوں کی جدوجہد کا اندازہ ان کی ان ملاقاتوں سے بہتر طریقہ سے ہو سکتا ہے جو کہ انھوں نے مسٹر ماٹیگو وزیر ہند سے مل کر کی تھیں اور اپنے مطالبات کو پیش کیا تھا۔

۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو کل ہند مسلم لیگ کی صوبہ واری شاخ نے اپنے وفد کے ساتھ وزیر ہند سے ملاقات کی۔ انھوں نے کانگریس لیگ اسکیم کی تائید میں اپنا خیال ظاہر کیا۔[۱۱] اس کے بعد بھی صوبہ متحدہ کی مسلم ڈیفنس اسوسی ایشن نے ملاقات کی اور قدامت پسند مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا جن کی مسلم لیگ میں ابھی نمائندگی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے (۱۵۰) اراکین میں (۵۰) ہندو (۵۰) مسلمان اور (۵۰) انگریز ہوں[۱۲] ۱۱ نومبر ۱۹۱۷ء کو ہندو سبھا کے ایک وفد نے وزیر ہند سے ملاقات کی۔ اس نے کانگریس لیگ اسکیم کو تسلیم کیا لیکن مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت پر اعتراض کیا۔[۱۳]

---

۱۱ ڈائری از ماٹیگو صفحہ ۴۴

۱۲ " " " ۴۵

۱۳ " " صفحات ۶۴ تا ۵

۲۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو کانگریس لیگ کے متحدہ وفد نے دہلی میں وزیر ہند سے ملاقات کی۔ اس وفد کے متعلق مانٹیگو نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے "اب ہم ہندوستانی عالم سیاست کے حقیقی اکابر کے روبرو تھے ہمارے پاس صوبوں سے دھوکہ باز اور چاپلوس نہیں آئے تھے بلکہ ہمارے پاس مختلف صوبوں کے درجہ اول کے سیاست دان جمع تھے۔"[۱۲] اس وفد کے ساتھ مسٹر جناح بھی تھے جنھوں نے قانون سازی میں اقلیتوں کے اختیارات پر زور دیا۔

۲۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام دہلی کل ہندو سبھا کے وفد نے وزیر ہند سے ملاقات کی۔ اس وفد کے ساتھ دیوان مادھو راؤ تھے۔ انھوں نے فرقہ وارانہ نیابت کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اس سے تو ہندو مسلم اختلافات بڑھ جائیں گے۔ لیکن مانٹیگو نے کہا کہ یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ان کو منسوخ کرنا ناممکن ہے۔ مسلمانوں سے وعدہ کیا جا چکا ہے اگر اس کو منسوخ کیا گیا تو مسلمان بغاوت کر دیں گے۔[۱۵]

۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بمقام کلکتہ انڈین کرسچین فرقے کے افراد نے وزیر ہند سے ملاقات کی۔ ہندوستان میں ان کی کل تعداد (۳ ½) ملین تھی۔ ان کی تعلیمی حالت بہت اچھی تھی لیکن یہ فرقہ وارانہ نیابت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مانٹیگو نے لکھا ہے کہ اس کی ان کو ضرورت نہیں اصول جداگانہ نیابت جمہوریت کے منافی ہے۔ یہ ہندوؤں

---

[۱۲] ڈائری از مانٹیگو صفحہ ۵۶

[۱۵] ،، ،، صفحات ۱۰۴-۱۰۶

اور مسلمانوں میں پھوٹ کا ذریعہ بن گیا ہے۔ لہذا اس کی توسیع نہ کی جائے۔[۱۱۶] اسی دن کل ہند انجمن زمینداران اور زمینداران بہار اور آرتھوڈاکس ایسوسی ایشن نے وزیر ہند سے ملاقات کی یہ سب فرقہ وارانہ نیابت چاہتے تھے۔ آرتھوڈاکس ایسوسی ایشن کے لیڈر دھاربونگا نے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مصالحتی مجالس کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ تہوار پر امن طریقے پر گزر سکیں۔[۱۱۷]

۱۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو غیر برہمنوں کے وفد نے مدراس میں وزیر ہند سے ملاقات کی اور فرقہ وارانہ نیابت پر زور دیا۔ مانٹیگو نے لکھا ہے تعجب ہے کہ غیر برہمن۔ برہمنوں کے اثرات کی اکثر شکایت کرتے ہیں اور بجائے ان کا مقابلہ کرنے کے حکومت سے امداد طلب کرتے ہیں۔ یہاں جماعت بندی کا آغاز ہو چکا ہے لیکن وہ فرقہ وارانہ نیابت چاہتے ہیں جس سے افسوس کہ جماعت بندی کو دھکا لگے گا۔ مدراس کے برہمنوں کے اثرات کے خلاف ہر ایک کو خوف تھا۔[۱۱۸] اسی دن مدراس کے علماء نے ملاقات کی اور ان میں سے ایک نے کہا کہ اس نے قرآن انجیل اور دیگر مقدس کتابوں کا مطالعہ کیا ہے

لیکن کہیں بھی کانگریس لیگ اسکیم کا جائز ہونا نہیں پایا جاتا۔[۱۱۹]

---

۱۱۶ ڈائری مانٹیگو صفحہ ۱۰۰

۱۱۷ " " " ۹۹

۱۱۸ " " صفحات ۱۱۲ تا ۱۱۳

۱۱۹ " " " (۱۱۴)

۲۰ ر ڈسمبر ۱۹۱۷ء کو مدراس میں رام سوامی ایر نے وزیر ہند سے ملاقات کے دوران میں جداگانہ نیابت کے خلاف اظہار خیال کیا۔ البتہ انھوں نے مدراس میں برہمنوں کے لئے کم از کم نشستیں متعین کرنے کے لئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مسٹر ناٹیگر نے رام سوامی کے اس خیال کی تائید کی ہے[۱۲۰]

۲۱ ر ڈسمبر ۱۹۱۷ء کو مدراس میں غیر برہمنوں کے وفد کے لیڈر ڈاکٹر ناٹیر نے ملاقات کی انھوں نے فرقہ وارانہ نیابت کی پرزور طریقے پر سفارش کی۔ انھوں نے کہا برہمن عہدہ دار عموماً غیر برہمن امیدواری کی مخالفت کرتے ہیں[۱۲۱]

۲۴ ر ڈسمبر کو بمقام بمبئی اکثر جماعتوں نے وزیر ہند سے ملاقات کی اور کانگریس لیگ اسکیم اور فرقہ وارانہ نیابت کے مسئلہ پر بحث کی[۱۲۲] برانچ پے نے اپنی نیابت متناسبہ کی اسکیم پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یا تو فرقہ وارانہ نیابت کی توسیع کی جائے یا تو نیابت متناسبہ کی اسکیم تسلیم کی جائے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لئے نیابت متناسبہ کے ذریعہ جداگانہ حلقوں پر زور دیا[۱۲۳]

۲۷ ر ڈسمبر ۱۹۱۷ء کو بمقام بمبئی " دکن انجمن رعیت " کے نمائندوں نے

---

۱۲۰ ڈائری از ناٹیگر صفحہ ۱۲۳

۱۲۱ " " " ۱۲۷

۱۲۲ " " صفحات ۱۲۹ تا ۱۳۰

۱۲۳ " " صفحہ ۱۳۱

ملاقات کی اور فرقہ وارانہ نیابت کی کئی قسمیں پیش کیں اور کانگریس لیگ اسکیم کی تائید کی۔ وہ برہمن استبداد سے گھبرائے ہوئے تھے۔[۱۲۱]

۲۷ر ڈسمبر ۱۹۱۷ء کو بہادر ڈوگری نے پست اقوام کی حمایت میں گفت و شنید کی انھوں نے فرقہ وارانہ نیابت کو ضروری قرار دیا۔ ان کو پست اقوام کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔[۱۲۲]

فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق مسٹر مانٹیگو کی رائے ہے کہ اس کو برقرار رکھا جائے اس کے علاوہ زمینداروں سکھوں اور یوروپین فرقوں کے لئے اس کی توسیع کی جائے۔ ایوان تجارت سے فرقہ وارانہ نیابت اٹھالی جائے۔ جامعات میں اس اصول کو برقرار رکھا جائے۔ برہمن اور ہندوستانی عیسائی فرقہ وارانہ نیابت چاہتے تھے لیکن مانٹیگو نے لکھا ہے کہ مجھے فرقہ وارانہ نیابت سے اتفاق نہیں۔ ہندوستانیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے۔ وہ ہوشیار اور کافی تعلیم یافتہ ہیں۔[۱۲۳] کرٹس کے خیال میں مقامی جماعتوں کے لئے فرقہ وارانہ نیابت مشکل مسئلہ تھا۔[۱۲۴] چیمز فورڈ کو ملازمتوں میں فیصد کا تعین کرنے میں اعتراض تھا۔[۱۲۵]

مانٹیگو چیمزفورڈ رپورٹ میں جہاں ہندوستان کے دیگر سیاسی و دستوری

---

۱۲۱ ڈائری از مانٹیگو صفحہ ۱۴۸

۱۲۲ " " " "

۱۲۳ " " صفحات ۱۰۴ تا ۱۰۵

۱۲۴ " " صفحہ ۱۶۲

۱۲۵ " " " ۲۸۳

مسائل سے بحث کی گئی ہے وہاں نیابت انتخابات اور اقلیتوں کے مسائل کو بھی معرض بحث میں لایا گیا ہے[۲۹]۔ فرقہ واری نیابت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ نہایت مشکل مسئلہ ہے۔ جو وعدہ لارڈ منٹو نے کیا اور جس کو ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں عملی جامہ پہنایا گیا اس کی تبدیلی کے لئے مسلمان تیار نہیں ہوں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں جہاں نسلی اور مذہبی اور ذات پات کے اختلافات ہیں فرقہ وارانہ نیابت نہ صرف ضروری بلکہ بہترین چیز ہے۔ چونکہ مذہب ہندوستان میں با اثر عنصر ہوتا ہے۔ لہذا یہاں جمہوریت کا اصول فرقہ واری بنیاد پر ہو تو بہتر ہے اس نظریے کے اعتبار سے غیر سیاسی لوگوں کے لئے فرقہ وارانہ نیابت ضروری ہے۔ ذمہ دارانہ حکومت کے لئے ابتدا ہی سے مشترک مفاد کے احساس اور مذہبی اور لسانی اتحاد کی ضرورت ہے۔ یوروپ میں بھی اس اصول کی اس وقت ابتداء ہوئی جبکہ خون۔ مذہب اور علاقہ جاتی تفریق کا امتیاز ختم ہو چکا تھا۔ صرف آسٹریا۔ جرمنی کی چھوٹی ریاستوں اور سائپرس میں استثنائی صورتیں ملتی ہیں۔ جن قوموں نے حکومت خود اختیاری کے اصول کی ترویج میں ہاتھ بٹایا اور اس کو دنیا میں پھیلانے میں تعاون عمل کیا ان کی تاریخ شاہد ہے کہ مملکت میں تقسیم شدہ وفاداری برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان میں شہریت کی روح اور اس کے احساس کو پہلے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عقاید اور طبقات کی بنیادوں پر تقسیم کے یہ معنی ہوں گے کہ ایسے سیاسی محاذ قائم ہوں گے جو ایک دوسرے کے

---

[۲۹] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحات ۱۴۶ تا ۱۴۸۔

خلاف صف آرا رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے شہریت کا احساس نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس طریقے سے قومی نیابت کو وجود میں نہیں لایا جا سکتا اور حکومت برطانیہ پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حکومت کرنے کے لئے تقسیم کا اصول پیش نظر رکھتی ہے جب پست اور کمزور اقلیتوں کو مخصوص نیابت عطا کی جاتی ہے تو ان کے مفادات کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول حکومت خود اختیاری کے اصول کے لیے سخت رکاوٹ اور اس کے منافی ہے۔ مگر مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا جو حق عطا کیا گیا ہے اس کو ختم کرنے سے احتجاج ہوگا اور ایک ایسا فرقہ جو شدید مشکلات کے وقت وفادار رہا مخالف ہو جائے گا۔ مسلمان عمومی حکومت سے گھبراتے ہیں اور وہ صرف فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب میں اپنا تحفظ سمجھتے ہیں۔ جدید کونسلوں میں ان کی مناسب نیابت کو ملحوظ رکھنا حکومت کا فرض ہے۔ مجبوری کے تحت مسلمانوں کے لئے مروجہ طریقے کو برقرار رکھا جائے۔ چاہے وہ حکومت خود اختیاری کے منافی کیوں نہ ہو۔ مگر جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں فرقہ وارانہ نیابت کی چنداں ضرورت نہیں۔

دیگر فرقے مثلاً سکھ۔ مدراس کے غیر برہمن ہندوستانی عیسائی اینگلو انڈین، یورو پینس اور بمبئی کے لنگایت یہ سب فرقہ وارانہ نیابت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بڑے زمیندار بھی یہی چاہتے تھے۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ چونکہ مسلمانوں کو یہ حق دیا گیا ہے لہذا دوسرے فرقوں کے مطالبات رد نہیں کئے جا سکتے۔ سکھوں نے فوجی خدمات انجام دی ہیں اور وہ اقلیت میں ہیں ان کو جداگانہ نیابت دی جانی چاہئے۔ دوسری اقلیتوں کے لئے نامزدگی کا طریقہ مناسب ہے۔ جس کسی صوبے میں زمیندار ایک نمایاں طبقے کی

حیثیت رکھتے ہوں ان کو اپنا علیحدہ حلقۂ انتخاب بنانے کی اجازت دیجا سکتی ہے۔ فرقہ دارانہ حلقہ ہائے انتخاب کی بہ نسبت نامزدگی میں یہ فائدہ ہے کہ یہ طریقہ جب چاہے ختم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں نامزدگی سے مناسب نیابت نہ ہو وہاں عام حلقہ ہائے انتخاب میں اقلیتوں کے لئے نشستوں کا تعین ہو جانا چاہیے۔ مقامی مجالس کے لئے یہ سفارش کی گئی کہ اکثریتوں کے لئے انتخاب اور اقلیتوں کے لئے نامزدگی ہو۔

صوبہ داری مجالس مقننہ کی بابتہ یہ سفارش کی گئی کہ ہر صوبے میں ایک وسیع مجلس مقننہ ہو جس کی ترکیب اور تعداد ہر صوبے کے لحاظ سے مختلف ہو اس کا انتخاب وسیع اور راست رائے دہندگی پر ہو۔ فرقہ داری اور مخصوص نیابت کو ملحوظ رکھا جائے۔ بالواسطہ انتخابات کا طریقہ ختم ہو جانا چاہیئے صوبوں میں ایوان بالائی کے قیام سے اس ایوان میں اقلیتوں کی مناسب نیابت ہو سکتی ہے۔ اقلیتوں کے لئے ایک ایوان ہو تو وہ اپنے حقوق کا تحفظ بہتر طریقے پر کر سکتے ہیں۔ ایوان بالائی میں ایسے اشخاص کی نمائندگی ہو سکتی ہے جو انتخابات میں حصہ لینا پسند نہ کرتے ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ایوان قدامت پسند ہوگا جو ایوان زیرین کے انتہا پسند رجحانوں کے لئے روک کا کام کرے گا۔ مگر ہر صوبے میں دو ایوان قائم کرنے کے لئے حالات سازگار نہیں۔

مرکزی مجلس مقننہ کے لئے یہ سفارشات پیش کی گئیں۔ لیجسلیٹو اسمبلی میں سرکاری اراکین کی اکثریت ہو اور جملہ تعداد (۱۰۰) رکھی جائے۔ اس کا (۲/۳) حصہ انتخابات کے ذریعہ آئے اور (۱/۳) گورنر جنرل نامزد کرے اور اس کے (۱/۳) حصے کا کم از کم (۱/۴) حصہ غیر سرکاری اراکین پر مشتمل ہو۔ جو اقلیتوں یا مخصوص مفادات کی نیابت کریں۔ یوروپینس اور انڈین کامرس اور ٹریڈ سے

زمینداروں کے لئے مخصوص نیابت ہو۔ اکثر اضلاع میں مسلمانوں کے لئے مخصوص نیابت ہو۔ راست انتخابات میں مشکلات ہیں گورنر جنرل اس وقت اراکین کو نامزد کرے جبکہ انتخابات کے نتائج معلوم ہو جائیں تاکہ اقلیتوں کی نامزدگی ہوسکے۔ کونسل آف اسٹیٹ میں سرکاری اراکین کی اکثریت ہو اور اہم معاملات کے لئے یہ قانون ساز جماعت قطعی نوعیت رکھے گی۔ گورنر جنرل کے علاوہ (۵۰) اراکین ہوں (۲۵) سے زیادہ عہدہ دار نہوں۔ ۴ غیر سرکاری اراکین ہوں گے جن کو گورنر جنرل نامزد کرے گا۔ کونسل آف اسٹیٹ میں کم از کم ۶ مسلمان ہوں چاہیے انکا راست یا بالواسطہ طریقے سے انتخاب ہو یا گورنر جنرل ان کو نامزد کرے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کی سفارشات کے بموجب ایک کمیٹی برائے حق رائے دہندگی اور کمیٹی برائے تقسیم امور تشکیل دی گئی۔ جس نے فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق حسب ذیل سفارشات پیش کیں[1]

مسلمان (۱)۔ جائینٹ رپورٹ میں مسلمانوں کی نسبت جو سفارش کی گئی کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں ان کو فرقہ وارانہ نیابت عطا کی جانی چاہئے اس کی تائید میں شہادت ملتی ہے۔ اور مقامی حکومتیں متفقہ طور پر اس کی تائید کرتی ہیں سوائے بنگال اور پنجاب کے بقیہ سب صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی اور قوت رائے دہی دونوں لحاظ سے اقلیت میں ہیں۔ اگرچہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ان صوبوں میں ان کے رائے دہندے اقلیت میں ہے۔ ان دو صوبوں

---

[1] کمیٹی برائے رائے دہندگی اور تقسیم امور ۱۹۱۹ء صفحات ۹ تا ۲۲۔

اور باقی صوبوں میں فرقہ وارانہ نیابت عطا کی جائے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی اس کی تائید کرتے ہیں چنانچہ اس بنا پر اس کی سفارش کی جاتی ہے۔ مجالس مقننہ میں نیابت کا تناسب جو میثاق لکھنؤ میں طے پایا مناسب ہے۔ صوبہ بمبئی بنگال۔ صوبہ متحدہ پنجاب۔ بہار اور اڑیسہ میں مقامی حکومتوں نے بھی ہم سے میثاق کی تائید کی ہے۔ کل ہندوستان کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے ہم مسلمانوں کی نیابت کی بابت میثاق کی تائید کرتے ہیں۔

سکھ۔ ہم نے پنجاب میں سکھوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی تائید جائینٹ رپورٹ پیراگراف (۲۳۲) کی بنا پر کی ہے۔

ہندوستانی عیسائی۔ یوروپین اور اینگلو انڈین

دیگر اقلیتوں مثلاً ہندوستانی عیسائی۔ یوروپین اور اینگلو انڈین کے لئے بھی جداگانہ فرقہ واری حلقہ ہائے انتخاب کی سفارش کی گئی موجودہ حالات میں کہا گیا کہ ان فرقوں کو عام حلقہ ہائے

انتخاب کے ذریعہ نیابت عطا نہیں ہو سکتی اور ان کے امیدوار یقیناً عام حلقہ ہائے انتخاب میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہم نے فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کو مدراس کے ہندوستانی عیسائیوں مدراس اور بنگال کے اینگلو انڈین کے لئے مختص کیا ہے ان اقلیتوں کو صرف انھیں صوبوں میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی ضرورت ہے۔ مدراس کے

ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ان میں کافی معیاری تعلیم موجود ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جداگانہ نیابت کا اصول زیادہ دن تک جاری رکھنے کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔

دیگر اقلیتیں۔ بنگال اور آسام کے ماہیاں۔ کلکتہ کے مارواڑی بہار و اڑیسہ میں مقیم بنگالی آسام کے آہومس۔ صوبہ متوسط کے ماپاس آ مدراس کے یوریا اور بمبئی کے پارسیوں نے بھی فرقہ وارانہ نیابت کا مطالبہ کیا ہے لیکن ان کے لئے جداگانہ نیابت ضروری نہیں۔ مدراس میں غیر برہمنوں نے برہمنوں کے اقتدار کے خلاف شکایت کرکے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کیا ہے۔ بمبئی کے لنگایت فرقے نے تکثیری حلقہ ہائے انتخاب میں تعین نشست کا مطالبہ کیا ہے۔ اس منظم فرقے کو عام حلقہ ہائے انتخاب میں جہاں وہ زیادہ ہیں دقت نہیں ہوگی۔

مرہٹے۔ دکن اور جنوبی بمبئی کے مرہٹوں اور متعلقہ ذاتوں نے بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات کا مطالبہ کیا لیکن ان میں سے بعض نشستوں کو محفوظ کردینے پر زور دیتے ہیں۔ مسٹر مانٹیگو اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مستقر بمبئی کے (۱۴) ملین ہندوؤں میں (۵) ملین مرہٹے اور متعلقہ ذاتیں ہیں اور ان کی قوت رائے دہی کم از کم (۵) اضلاع میں حاوی ہوگی۔ لہذا مخصوص رعایت ان کے لئے ضروری نہیں۔

مدراس کے غیر برہمن

مدراس میں برہمن باوجود قلیل تعداد میں ہونے کے ایک تو سماجی اور مذہبی معاملات پر حاوی ہیں اور دوسرے تعلیم میں بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں اس کی وجہ سے ان کے اثرات بڑھ گئے ہیں۔ حکومت کی

ملازمتوں میں وہ آبادی سے زیادہ حاوی ہیں۔غیر برہمنوں نے تحفظ کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ان کا حل اس طرح ہو سکتا ہے کہ یا تو غیر برہمنوں کے لئے نشستیں محفوظ کردی جائیں یا ان کے حلقہ ہائے انتخاب برہمنوں سے علیٰحدہ کردئے جائیں ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ برہمن امیدواروں کی تعداد محدود کردی جائے۔ صوبہ مدراس میں بہ استثنائے پست اقوام غیر برہمنوں اور برہمنوں کا تناسب (۱۰:۲۲) ہے۔ اگر غیر برہمنوں کے لئے علیٰحدہ حلقۂ انتخاب تشکیل دیا جائے تو برہمنوں کے لئے بھی علیٰحدہ حلقہ قائم کرنا ہوگا۔ جیسا کہ برہمنوں نے مطالبہ نہیں کیا ہے۔ بغیر برہمنوں کی مرضی کے ان کے لیے جداگانہ حلقے نہیں بنائے جا سکتے۔ چنانچہ غیر برہمنوں کے لئے نشستیں محفوظ کردی جائیں۔

پست اقوام۔ پست اقوام کے لئے نامزدگی کا طریقہ مناسب ہے اس لئے کہ اس فرقے کے لئے مناسب شرائط رائے دہندگی بنانا مشکل ہے۔ نامزدگی کا طریقہ ان جماعتوں اور مفادات کے لئے بھی اختیار کیا جائے جن کو انتخابات میں کامیابی کی امید نہیں۔

کامرس اور تجارت۔ کامرس اور تجارت کے لئے جائنیٹ رپورٹ میں جداگانہ نیابت کی تائید کی گئی ہے۔ پنجاب۔ صوبہ متوسط اور آسام میں جہاں انڈین کامرس کی منظم جماعتیں ہیں۔ وہاں مالکان فیکٹری اور رجسٹرڈ کمپنیوں کے نمائندوں کو خاص حلقہ ہائے نیابت بنانے کی اجازت ہو

زمیندار۔ ان کی مخصوص نیابت مناسب ہے۔

لیجسلیٹو اسمبلی کی ترکیب بالتفصیل ساؤتھ برو کمیٹی نے پیش کی ہے۔ [۱۳۱]

---

[۱۳۱] ملاحظہ ہو رپورٹ کمیٹی برائے رائے دہندگی و تقسیم امور صفحہ ۲۰

کونسل آف اسٹیٹ میں انتخابی نشستوں کے لئے مسلمانوں اور سکھوں کے لئے بھی ترکیب پیش کی گئی ہے۔[۳۲]

مسٹر ڈبلیو۔ ایچ ونسنٹ نے اپنے ایک منٹ آف ڈسنٹ میں لکھا ہے۔[۳۳] کہ جہاں وہ بہت کمزور ہوں ان کے تناسب کو دوگنا کر دیا جائے مختلف صوبوں میں مسلمان کی نیابت کا تناسب بھی پیش کیا گیا ہے۔[۳۴]

مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی (۳۰) فی صدی نیابت فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہوگی۔ کونسل آف اسٹیٹ میں انتخاب کے ذریعہ مقررہ تعداد سے کم مسلمان آئیں تو اس کی تلافی نامزدگی کے ذریعہ سے کی جائے۔ حکومت ہند نے دستوری اصلاحات کے مراسلہ پنجم میں نیابت سے متعلق یہ تجاویز پیش کیں۔[۳۵] بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے تحت مختلف مفادات کا تعین کر دینا مناسب نہیں۔ جس وقت تک فرقہ داری نیابت کا اصول برقرار رہے گا نیابت کے مسئلہ میں مشکلات برقرار رہیں گی جب ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے لئے ماحول پیدا ہو جائے گا اور اکثریت کے فیصلے قابل قبول ہوں گے اس وقت نشستوں کے تعین سے دست برداری حاصل کی جا سکتی ہے۔ شرائط رائے دہندگی میں جائداد کی

---

۳۲ ملاحظہ ہو رپورٹ کمیٹی برائے رائے دہندگی و تقسیم امور صفحہ ۲۴

۳۳ " " " " " ۲۳۸

۳۴ " " " " " "

۳۵ " " " " صفحات ۳۵۹ تا ۳۸۰

شرط پر مسلمانوں کے افلاس کی وجہ سے مشکل پیش آئے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان رائے دہندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے بھی کم رہے گی حالانکہ ہندوؤں میں یہ بات نہیں جہاں تک پست اقوام کا تعلق ہے ان کی مناسب نیابت کے لئے حتی الامکان کوشش کی جائے گی پست اقوام کی آبادی کل آبادی کا (۱/۵) حصہ ہے اور یہ مشورہ دیا گیا کہ تقریباً (۸۰۰) نشستوں میں سے (۷) نشستیں پست اقوام کو دی جائیں مدراس میں پست اقوام کے لئے (۲) نشستوں کی سفارش کی گئی۔ بنگال صوبہ متحدہ بہار اور اڑیسہ میں ۴۴۔ صوبہ متوسط اور بمبئی میں ۴۔ اور بقیہ ایک ایک تاکہ وہ اپنے مفادات کی مناسب طریقے سے حفاظت کر سکیں بعض چھوٹی اقلیتوں کا جداگانہ انتخاب کی بجائے نامزدگی عطا کی جائے۔ اس لئے کہ ان میں تعلیم کم اور ان کی مالی حالت خراب تھی۔ چونکہ میثاق لکھنؤ کو تقریباً متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا لہٰذا اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اگرچہ کہ حکومت مدراس و بمبئی نے اس کی مخالفت کی ہے کمیٹی برائے رائے دہندگی نے یہ بھی کہا کہ جائنٹ رپورٹ میں مسلمانوں کو اس وقت کسی صوبے میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب دیا جائے جبکہ ان کے رائے دہندے اقلیت میں ہوں لیکن کمیٹی کا کہنا ہے[۵۳] کہ یہ حالت صرف بنگال اور پنجاب میں ہے کمیٹی کے خیال میں پنجاب میں مسلم رائے دہندوں کی تعداد ہندوؤں اور سکھ رائے دہندوں کی مجموعی تعداد سے کچھ بڑھ کر ہے۔ چونکہ فرق بہت کم ہے لہٰذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان

---

[۵۳] رپورٹ برائے رائے دہندگی و تقسیم امور ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۷۔

اقلیت میں گھر جائیں۔ سکھوں کا مطالبہ جداگانہ نیابت قبول کیا جا سکتا ہے۔ میثاق لکھنؤ کے ذریعہ بنگال کے مسلمانوں نے اپنی آبادی کا (۳/۴) حصہ نشستیں حاصل کیں اور پنجاب کے مسلمانوں نے (۹/۱۰) حصہ اور اس کی تلافی بقیہ صوبوں میں مسلمانوں کے لئے زیادہ نشستوں سے کر دی گئی۔ اس مفاہمت سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف صوبوں کے مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ موجود ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی اہمیت تسلیم کرنے کا وعدہ کیا جا چکا ہے ایک چیز اور ہے وہ یہ کہ مسلم فرقہ مفلس ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے شرائط رائے دہندگی کا ایک ہی معیار ہو تو مسلمانوں کا حلقۂ انتخاب اور چھوٹا ہو جائے گا۔ تیسری چیز یہ کہ مسلمانوں کی آبادی اور ان کی سیاسی قوت میں تناسب نہیں۔ بنگال اور آسام میں ان کی سیاسی قوت آبادی سے کم ہے۔ صوبہ متحدہ میں (۱۴) فی صد ہیں لیکن سیاسی قوت اس سے زیادہ ہے۔ کمیٹی نے میثاق میں ترمیم کیلئے کہا۔ بنگال میں مسلمانوں کی نیابت کا جو تعین کر دیا گیا ہے وہ ناکافی ہے وہاں کے مسلمان بہت پست ہیں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ سے ان کا نقصان ہوا۔ چنانچہ ان کے تحفظ کے لئے ان کو بجائے (۳۴) نشستوں کے (۴۴) نشستیں کر دی جائیں۔

حکومت ہند نے اپنے مراسلہ میں لکھا کہ دیگر اقلیتوں کا یہ مطالبہ کہ جداگانہ نیابت دی جائے ہمیں منظور ہے جب تک مدراس کے غیر برہمنوں کے مطالبات پورے نہ کئے جائیں ان سے تعاون کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ تعداد کے اعتبار سے غیر برہمن بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان کی قوت رائے دہی کمزور ہے۔ اس وقت ہندوستان کے

حالات کے اعتبار سے تعدادی اکثریت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔
حکومت ہند نے یہ بھی تجویز کی کہ (۶۱) غیر مسلم نشستوں میں سے (۴۰) نشستیں غیر برہمنوں کے لئے مختص کر دی جائیں اور باقی نشستیں دونوں جماعتوں میں انتخابی مقابلہ کے لئے چھوڑ دی جائیں۔ جب مدراس کے غیر برہمنوں کے مطالبات تسلیم کئے جائیں تو بمبئی کے مرہٹوں کے مطالبات بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

حکومت ہند نے اسمبلی میں منتخب شدہ امیدواروں کی ترکیب بالتفصیل پیش کی۔[۴۷]

۱۹۱۹ء کے قانون کے لئے جو جائنٹ سلکٹ کمیٹی بیٹھی اُس نے ہندوستان کے نیابتی مسائل کو حل کرنے کے لئے نیابت تناسب کا اصول پیش کیا اور بتایا کہ ہندوستان کے حالات کا اعتبار کرتے ہوئے یہ طریقہ نہایت موزوں ہے اور اس اصول پر غور کیا جائے تاکہ اس کو ہندوستان میں مروج کیا جا سکے۔[۴۸] مجلس منتخبہ نے میثاق لکھنؤ کو تسلیم کیا۔ اس نے مدراس کے غیر برہمنوں کو نشستیں محفوظ کر کے جداگانہ نیابت عطا کرنے پر زور دیا۔ یہ بھی سفارش کی کہ مرہٹوں کے لئے بھی اسی اصول پر عمل کیا جائے۔ ان مختلف رپورٹوں کے شائع ہونے کے بعد انگلستان کی پارلیمنٹ میں قانون حکومت ہند کے مسودے پر گرم مباحثے رہے۔ دارالامراء کے اکثر اراکین جن میں لارڈ کرزن اور لارڈ

---

[۴۷] ملاحظہ ہو رپورٹ کمیٹی برائے رائے دہندگی و تقسیم امور صفحہ ۴۳

[۴۸] رپورٹ قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۰

اپھل شامل تھے فرقہ وارانہ نیابت کی تائید کر رہے تھے۔ بالآخر ۱۹۱۹ء
کو یہ مسودہ منظور ہوا۔ اس قانون میں اقلیتوں کی نیابت کے متعلق حسب ذیل
امور طے پائے۔ مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب برقرار رہے گے۔
سکھوں کو بھی جداگانہ حلقہ ہائے نیابت عطا کیا گیا۔ صوبہ مدراس
کے غیر برہمنوں کے مطالبات تسلیم کئے گئے۔ پست اقوام کے
اراکین کی نامزدگی عمل میں آئے گی۔ منظم مزدور جماعتوں کی نیابت تسلیم
کی گئی۔ یوروپینس ہندوستانی عیسائی اور اینگلو انڈینس کے لئے حلقہ
ہائے انتخاب مقرر کئے گئے۔ جامعات کی نیابت علی حالہ قائم رکھی
گئی۔ دیگر مفادات کی نیابت بھی برقرار رہی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں
کی نشستوں کے تعین میں تقریباً میثاق لکھنو پر ہی عمل کیا گیا۔ عیسائیوں
کو صرف صوبہ مدراس میں۔ اینگلو انڈینس کو صرف بنگال میں یوروپینس کو
سب صوبوں میں سوائے پنجاب صوبہ متوسط اور آسام کے جداگانہ
نیابت عطا کی گئی۔ سکھوں کو ان کی فوجی خدمات کی وجہ سے زیادہ نیابت
عطا کی گئی۔ مدراس میں (۲۸) نشستیں غیر برہمنوں کے لئے محفوظ کردی گئیں۔
صوبوں میں مجالس مقننہ کے لئے یہ نشستیں عطا کی گئیں[۳۹]۔ مدراس (۱۲۷)۔
بمبئی (۱۱۱)۔ بنگال (۱۳۹) صوبہ متوسط (۱۲۳)۔ پنجاب (۹۳)۔
بہار اور اڑلیسہ (۱۵۳) صوبہ متحدہ (۷۰)۔ اسام (۵۰)۔ سرکاری اراکین کی
تعداد (۲۰) فی صدی سے زاید نہ ہو اور منتخب شدہ اراکین کی تعداد
کم از کم (۷۰) فی صد ہو۔ مسلمانوں۔ یوروپینس ہندوستانی۔ عیسائیوں
کے لئے فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب تسلیم کئے گئے۔

۳۹۔ کیتھ۔ دستوری تاریخ ہند صفحات ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۶۰، ۲۶۱

عیسائیوں کے لئے صرف مدراس۔ اینگلو انڈینس کو مدراس اور بنگال اور یورپینس کو سوائے پنجاب صوبہ متوسط اور آسام کے بقیہ صوبوں میں جداگانہ نیابت عطا کی گئی۔ سوائے آسام کے بقیہ صوبوں میں جامعات زمینداروں۔ کامرس۔ صنعت۔ کان کنی اور پلانٹنگ کے لئے مخصوص نشستیں معین کی گئیں۔ مدراس میں (۱۳) مخصوص نشستیں معین کی گئی۔ (۲۰) فرقہ واری اور (۶۵) عام حلقہ ہائے انتخاب کے لئے چھوڑ دی گئیں۔ بنگال میں (۲۱) مخصوص۔ (۴۶) فرقہ واری اور (۴۶) عام پنجاب میں (۷) مخصوص (۴۴) فرقہ واری (جس میں سکھوں کے (۱۲) شامل ہیں) اور صرف (۲۰) عام۔ مرکزی مقننہ لیجیلیٹو اسمبلی کے (۱۴۳) اراکین ہونگے جس میں سے (۲۵) سرکاری۔ غیر سرکاری نامزد شدہ (۱۵) اور (۱۰۳) منتخب شدہ۔ اراکین میں سے (۱۵) عام حلقہ ہائے انتخاب سے منتخب ہوں گے۔ (۳۰) مسلمانوں کی جانب سے جداگانہ حلقہ ہائے نیابت کے ذریعہ۔ (۲) سکھ۔ (۷) زمیندار۔ (۹) یورپینس اور (۴) انڈین کامرس۔ کونسل آف اسٹیٹ کے (۶۰) اراکین میں سے (۱۹) سرکاری (۶) غیر سرکاری نامزد شدہ اراکین (۳۴) منتخب شدہ اراکین (۲۰) عام (۱۰) مسلمان (۱) سکھ اور (۳) یورپینس۔

۱۹۱۹ء کے قانون میں صرف مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے قانون میں اس اصول کی دیگر فرقہ جات کے لئے توسیع عمل میں آئی۔ حکومت ہند اس کی برائیوں سے واقف تھی۔ خود مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے

باوجود فرقہ وارانہ نیابت کے اصول پر عمل کیا گیا۔ مانٹیگو ایک طرف تو اصول جداگانہ نیابت کا مخالف تھا اور کہتا تھا کہ یہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں زبردست رکاوٹ ہے لیکن اس کے باوجود وہ کہتا تھا کہ ہندوستانی حالات کا اعتبار کرتے ہوئے اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ نہ صرف مسلمانوں بلکہ دیگر فرقوں کے لیئے بھی اس جداگانہ نیابت کی سفارش کی۔ مانٹیگو کو یہ ڈر تھا کہ اگر یہ حق جو کہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا ہے واپس لے لیا جائے تو مسلمان بغاوت کردیں گے[۱] اگر مسلمانوں سے بغاوت کا ڈر نہ ہو تو کم از کم وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان کی وفاداری حکومت کے ساتھ برقرار نہ رہے گی۔ چنانچہ جائنٹ رپورٹ میں درج ہے کہ ایک تو مسلمان اس حق کو واپس لینے سے احتجاج کریں گے اور ایک ایسا فرقہ جس نے شدید مشکلات کے زمانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور وفادار رہا۔ مخالف ہو جائے گا[۲] حکومت برطانیہ کو اوائل بیسوی صدی میں خطرات اور مشکلات لاحق ہوئے اس وقت مسلمانوں کی وفاداری سے اس نے بڑا فائدہ اٹھایا تھا لیکن تقسیم بنگالہ کی تنسیخ اور حکومت برطانیہ کی اسلامی ممالک کے ساتھ پالیسی نے اس وفاداری کو متزلزل کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میثاق لکھنؤ کا سیاسی اتحاد عالم وجود میں آیا۔ اگر مدبرین برطانیہ مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی سے مایوس نہ کر دیتے تو شاید میثاق لکھنؤ معرض وجود میں نہ آتا۔

---

[۱] ڈائری از مانٹیگو صفحہ ۶۰

[۲] رپورٹ مانٹیگو چیمسفرڈ صفحہ ۱۴۹

اس میثاق کا بڑا محرک مسلمانوں کو انگریزوں کی طرف سے مایوسی تھی۔ ان حالات کا مدبرین برطانیہ بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ حکومت برطانیہ نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کی وجہ سے بھی مسلمان انگریزوں سے بدظن تھے۔ چنانچہ ایسے حالات میں اگر جداگانہ نیابت کا جو حق مسلمانوں کو دیا گیا چھین لیا جاتا تو مسلمانوں کی جانب سے رہی سہی وفاداری بھی ختم ہو جاتی اور حکومت برطانیہ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مانٹیگو ان چیزوں کو محسوس کر رہا تھا اس وقت بعض انگریزوں کو یہ بھی خیال تھا کہ مسلمانوں کو مراعات عطا کر کے ہندوؤں میں انتشار پیدا کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی مدد سے مزید اصلاحات ملتوی کی جا سکتی ہیں[۲۲] لیکن کیتھ کا خیال ہے کہ حکومت کے خلاف جو اتحاد پیدا ہو چکا تھا مسلمانوں کو کسی ترغیب سے اس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا[۲۳] جب لکھنؤ کا سیاسی اتحاد ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہو چکا تو بعید از قیاس نہ تھا کہ دیگر فرقوں میں بھی سمجھوتہ ہو جاتا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی جتنی وسیع خلیج حائل تھی اس کے باوجود جب ان دونوں میں اتحاد ہو سکتا تھا تو دیگر فرقوں میں اتحاد اور مفاہمت مشکل امر نہ تھا۔ چنانچہ حکومت نے مختلف اقلیتوں کے مطالبات قبول کئے تاکہ ان کی وفاداری حکومت سے وابستہ رہے۔ حکومت کی مشنری چلانے کے لئے مختلف فرقوں سے تعاون ضروری تھا ورنہ مشکلات

---

[۲۲] تقریر اے۔ بی۔ کیتھ (ہندوستانی مسائل) بحوالہ انڈین ریویو ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۷۳

[۲۳] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

پیدا ہو جائیں۔ چنانچہ حکومت ہند نے اپنے مراسلہ پنجم میں لکھا کہ جب تک مدراس کے غیر برہمنوں کے مطالبات تسلیم نہ کئے جائیں گے اس وقت تک ہم ان سے تعاون عمل کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں؟[1] اس سے ظاہر ہے کہ مختلف فرقہ جات کے مطالبات کو اس لئے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ حکومت کو ان کا تعاون عمل حاصل رہے چاہے ان کے مطالبات کی تکمیل سے ہندوستان کے قومی مفاد کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ جائے۔

۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند سے قبل مختلف فرقوں میں پیشہ ور طبقات پیدا ہو رہے تھے۔ یہ پیشہ ور طبقات اپنے اپنے فرقے کے سہارے حکومت کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرتے تھے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر انھوں نے مذہب کا دامن پکڑا حالانکہ ان طبقات کا مذہب سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ مسٹر مانٹیگو کی آمد کے ساتھ ہی مختلف فرقوں کے پیشہ ور طبقات نے ان سے مل کر اپنے مفادات کے تحفظ کا وعدہ لیا۔ چونکہ یہ طبقات جانتے تھے کہ مجالس مقننہ کی نیابت کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں لہٰذا انھوں نے مذہب اور فرقہ واری جامہ اوڑھ کر نشستیں حاصل کرنا چاہا۔ ایک طرف تو یہ نام نہاد فرقے حکومت کا سہارا تلاش کر رہے تھے اور دوسری طرف حکومت ان کا اشتراک عمل چاہتی تھی تاکہ بے چینی کے دور کا خاتمہ ہو جائے اور برطانوی سامراج کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ حکومت نے پیشوں کو مخصوص نیابت تو عطا کی لیکن اس کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ اصلاحات کے

---

[1] رپورٹ کمیٹی برائے رائے دہندگی و تقسیم امور صفحہ ۳۷۲

نفاذ کے اعلان کے ساتھ ہی اینگلو انڈینس میں اس لئے ہیجان پیدا ہوا کہ حکومت کے اکثر محکموں خصوصاً ریلوے تار۔ ٹپہ وغیرہ میں اُنھوں نے اجارہ حاصل کر رکھا تھا اور اصلاحات سے ان کے حقوق تلف ہونے کا خدشہ پیدا ہوا۔ حکومت نے ان کے مطالبات کو اس لئے قبول کیا کہ اس طبقے نے ایک تو غدر ۱۸۵۷ء میں حکومت کا ساتھ دیا تھا اور دوسرے یہ اکثر و بیشتر حکومت کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس فرقے کے مطالبات نظر انداز کر دئیے جاتے تو اس کی وفاداری سے بھی حکومت کو ہاتھ دھو بیٹھنا پڑتا۔ مدراس کے غیر برہمنوں کے مطالبات قبول کئے جانے کے دو وجوہات تھے۔ ایک تو ان کا اشتراک عمل حاصل کرنا اور دوسرے ان کے مطالبات کی تکمیل سے برہمنوں کے غیر معمولی اثرات زائل کرنا۔ پنجاب میں سکھوں کے مطالبات قبول کر کے ہندو اور مسلمان فرقے کے خلاف کھڑا کیا گیا[۱]۔ ایک طرف تو مختلف فرقوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے ان فرقوں کی ہمدردی اور وفاداری حکومت کے ساتھ شامل حال ہو گئی اور دوسرے حکومت کو اصول توازن سے کام لینے کا زرین موقع ہاتھ لگا۔ مختلف فرقوں کے مطالبات قبول کرنے سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے لگی۔ ہر فرقہ اپنے مفادات کا تحفظ دوسرے فرقوں کی مسابقت سے نجات حاصل کرنے کے لئے کرتا تھا۔ اس کے بعد فرقہ واریت تاجر دل صناع مالکان کارخانہ جات۔ زمیندار۔ جاگیردار اور دیگر مفادات میں سرایت

---

[۱] گرشنا۔ مسئلہ اقلیت صفحہ ۱۶۳

کرگئی اپنے فرقے کے حقوق کے تحفظ کے پس پردہ مفادات کا تحفظ ہونے لگا۔ ہر فرقے نے اپنی اپنی ٹریڈ یونینیں بنانا شروع کیا جس کے بعد فرقہ واریت صنعتوں میں داخل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سرمایہ دارانہ نظام تقویت پانے لگا۔ فرقہ واری مطالبات میں شاذ و نادر ہی متعلقہ فرقے کے عوام کی بہبودی کے لئے مطالبات پیش کئے جاتے ہیں۔ فرقہ واری مطالبات میں اس فرقے کے سرمایہ دار طبقات مثلاً زمیندار۔ اجر۔ صناع۔ جاگیردار وغیرہ کے مطالبات پیش ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ایک قسم کا فرقہ وارانہ نظام سرمایہ داری پیدا ہو چکا ہے۔ جس کو حکومت برطانیہ نے پیدا کیا ہے۔ ان مفادات کے تحفظ کی خاطر حکومت کی ضرورت ہے اور حکومت کو سامراج کی بقا کے لئے ان کے تعاون کی ضرورت ہے مسئلہ اقلیت فرقہ وارانہ نظام سرمایہ داری کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ انہیں حالات کے تحت ۱۹۱۹ء کے قانون کے بعد جس میں مختلف فرقوں کے مطالبات قبول کئے گئے ہندوستان کی سیاست میں اس قدر زیادہ انتشاری رجحان پیدا ہو چکا ہے کہ باوجود متعدد کوششوں کے سیاست میں شیرازہ بندی نہ ہو سکی۔

فرقہ وارانہ اتحاد کی جدوجہد

سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۸ء

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں قومی مفاد کے تحت ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور سیاسی اتحاد کی میثاق لکھنؤ کی صورت میں تکمیل ہو گئی۔ جب حکومت برطانیہ پر اعتماد باقی نہ رہا تو فرقہ واری اتحاد کے لئے راستہ صاف ہونے لگا۔ رولٹ ایکٹ نے بھی قومی اتحاد کی اہمیت کو واضح کر دیا۔ اب متحدہ طور پر حکومت برطانیہ کے سامنے مطالبات پیش ہونے لگے۔ یہ کہا جانے لگا کہ جب انگلستان نے چھوٹی اقوام کی آزادی کی خاطر جنگ کی ہے تو پھر ہندوستان کو اس حق سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے[1] جب امریکی اور برطانوی

---

[1] مانٹیگو چیمسفرڈ رپورٹ صفحہ ۱۲

مدبرین نے حق خود ارادیت کی تائید کی تو ہندوستانی سیاست دان حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہ مطالبات متحدہ طور پر پیش کئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۱ء مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ہی مقام پر ہوتے رہے کل ہند کانگریس کمیٹی اور کل ہند مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس جولائی ۱۹۱۷ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حکومت بنگال و مدراس کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ کانگریس لیگ اسکیم کی ایک یادداشت پارلیمنٹ کو روانہ کردی جائے۔ مسز انی بسنٹ کو قید کرنے پر کانگریس اور لیگ نے احتجاجی بیان وزیر ہند کے پاس روانہ کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ کانگریس اور لیگ دستوری اور قانونی حد کے اندر رہتے ہوئے تعلیم کا پروپگنڈہ کریں۔ اسی ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے ملک معظم کی حکومت نے ۲۰ راگست ۱۹۱۶ء کا اعلان کیا جس سے سیاسی حلقوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن مانٹیگو چیمز فورڈ رپورٹ کی اشاعت کے بعد غلط فہمی رفع ہوگئی۔ صرف اعتدال پسند طبقہ اس سے خوش تھا۔

اسی زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کو روز افزوں استحکام پہنچ رہا تھا امرتسر میں رام نومی کے جلسوں میں مسلمانوں نے شرکت کی۔ حکومت کے تشدد نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کردیا تھا۔ ہندو مسجدوں میں اور مسلمان مندروں میں جاتے تھے۔[۲] ۱۹۱۹ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام امرتسر حکیم اجمل خاں کے صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ قرارداد منظور

---

[۲] خطبات کانگریس۔ خطبہ موتی لال نہرو ۱۹۱۹ء صفحہ ۲۲۲

ہوئی کہ جہاں تک ہو سکے گائے کی قربانی سے احتراز کیا جائے اور دوسرے جانوروں کو ترجیح دی جائے۔[۱] ہر جلوس کا نعرہ ہندو مسلم اتحاد تھا جس کا مظاہرہ جھنڈوں اور نعروں سے کیا جاتا تھا۔ ۱۹۱۸ء کے لیگ کے سالانہ اجلاس میں ذمہ دارانہ حکومت کی بابتہ ایک اہم قرار داد منظور کی گئی۔[۲] بعض مسلمان اس قرار داد کی مخالفت کر رہے تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ ذمہ دارانہ حکومت کے حصول سے قبل ہندوؤں کے رویہ کا اندازہ لگا لینا چاہیئے جو اقلیتوں کے ساتھ اختیار کیا جائے گا۔ اس قرار داد کی تائید کرنے والوں کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں باعزت زندگی ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل پر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کو ہمت سے کام لینا چاہیئے۔ بہر کیف یہ قرار داد منظور ہو گئی۔ اسی قرار داد میں یہ امر طے پایا کہ کانگریس کے مشورے سے ایک کمیٹی بنائی جائے تاکہ صوبوں میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے لئے تصفیہ ہو جائے۔ ڈسمبر ۱۹۱۹ء کو بمقام امرتسر مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ہوئے جہاں صدر پنڈت مدن موہن مالویہ اور حکیم اجمل خاں کے لئے مشترکہ جلوس نکالا گیا۔ لیگ کے اجلاس میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نیابت اور مذہبی رسوم و رواج پر بحث ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری نے یہ قرار داد پیش کی کہ چونکہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے لہذا بقر عید کے موقع پر

---

[۱] تاریخ مسلم لیگ مرزا اختر حسن بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ صفحہ ۱۲۶

[۲] بحوالہ سیاست ملیہ صفحات ۱۲۸ تا ۱۲۹

گائے کی قربانی کم کی جائے۔

اسی زمانے میں ہندوستانی مسلمان حکومت برطانیہ کی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ بدسلوکی سے بدظن تھے۔ چنانچہ خلافت کا مسئلہ اہمیت اختیار کرنے لگا۔ جب صلحنامہ سیورے کی رو سے سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے پارچے کردئے گئے تو مسلمانانِ ہند مشتعل ہو گئے۔ خلافت کے مسئلہ نے ہندوستانی مسلمانوں میں بے چینی پیدا کردی تھی چنانچہ مسلمانوں نے گاندھی جی کی ترک موالات کی تحریک میں شرکت کی۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو خلافت کانفرنس نے ترک موالات کی مہم کا آغاز کرنے کا تہیہ کرلیا ۱۹۲۰ء کے لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو ڈاکٹر انصاری کے زیر صدارت منعقد ہوا ترکِ موالات کا مفصل پروگرام پیش ہوا ترک موالات کی مہم سے ہندوستان کے طول و عرض میں بے چینی پھیل گئی ہندو مسلمان متحد تھے۔ حکومت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ترکِ موالات کی مہم سے شہنشاہی مفاد متاثر ہونے لگے تو حکومت نے ہندوستان کے اکثر قائدین کو نظر بند کردیا۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے تقریباً ۵۔ ۵ سال تک تو ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر رہی ترک موالات اور خلافت کی تحریک نے کچھ عرصے کے لئے ہندو مسلم اتحاد تو پیدا کردیا لیکن ۱۹۲۳ء میں جب خلافت کا مسئلہ ہی ختم ہوگیا تو یہ تحریکیں کمزور پڑنے لگیں اور ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھرنے لگا۔[ش] دراصل اس زمانے میں جو اتحاد پیدا ہوگیا تھا

ش ہندوستان ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۲ء اسرکاری رپورٹ جو ۱۹۱۹ء کے قانون کے بموجب پارلیمنٹ میں

اس سے ان دونوں فرقوں کے پیش نظر کوئی واضح اور مشترک مقصد نہ تھا ہندو پیشہ ور طبقات کو سہارے کی ضرورت تھی چنانچہ انھوں نے کانگریس کی تائید کی۔[۵۶] قلیل عرصے کے اندر پھر سے قدیم دشمنی اور منافرت کا جذبہ جو دبا ہوا تھا عود کر آیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ واری کشمکش اپنی بھیانک صورت میں پھر سے نظر آنے لگی۔ یہ زمانہ بجا طور پر ہندوستان میں "خانہ[۵۷] جنگی" کا عہد قرار دیا گیا ہے۔ اس عرصے میں ہندو مسلم اتحاد کی متعدد کوششیں کی گئیں لیکن سب نقش بر آب ثابت ہوئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس میں ہندوستانی قائدین آپس میں ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔

تحریک خلافت اور ترک موالات سے ہندوستان کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی عمل میں آئی۔ قومی محاذ جس کی دیرینہ تمنا تھی قائم ہونے لگا۔ خلافت کی تحریک کو گاندھی جی کی تائید حاصل ہونے سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے راستہ صاف ہو رہا تھا۔ مسٹر گاندھی کے اثرات سے کانگریس نے بھی اس کی تائید کی۔[۵۸] خلافت کی تحریک کی تائید سے مسٹر گاندھی کو دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک تو مسلمان کانگریس میں داخل ہوئے دوسرے کانگریس کو وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے ناممکن تھی۔[۵۹] اس موقع پر مسٹر گاندھی

(بقیہ فٹ نوٹ[۵۵] از صفحہ ۱۵۴) ہر سال پیش کی جاتی تھی) صفحہ ۲۵۹

[۵۶] کرشنا مسئلہ اقلیت صفحہ ۱۳۹

[۵۷] تقسیم ہند از ابیڈکر صفحہ ۱۷۵

[۵۸] " " " ۱۴۰

[۵۹] " " " ۱۴۲

ایثار سے کام لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا "میں نے لوگوں کو کہا کہ بجائے گاندھی کی جئے اور محمد علی شوکت علی کی جئے کے ہندو مسلمان کی جئے مناسب ہے۔ ..... ہندو مسلمان مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ لگائیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ صرف خدا ہی بڑا ہے اور کوئی نہیں۔ دوسرا بندہ ماترم اور بھارت ماتا کی جئے اور تیسرے ہندو مسلمان کی جئے جس کے بغیر ہندوستان کی فتح نہیں ہو سکتی ..... ہندو مسلمانوں کی جئے ایسا نعرہ ہے جو ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔"[1] موپلا بغاوت کے موقع پر گاندھی جی خاموش رہے اور مسلمانوں کو برہم نہیں ہونے دیا۔ ان کے اثرات کی وجہ سے کانگریس نے اس واقعے پر اظہار افسوس کیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ قرار داد منظور کی۔ اس وقت بعض مسلمان لیڈر اس واقعہ کی تائید کر رہے تھے[2] مولانا محمد علی نے اپنے کانگریس کے خطبہ صدارت میں کوکناڈا میں گاندھی جی کی نسبت کہا "جہاتما گاندھی جی کی آمد سے قبل کئی چھوٹی بڑی ندیاں کم و بیش ایک دوسرے کے متوازی بہہ رہی تھیں اور ان میں چھوٹی کشتیاں چلائی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ لیکن ان کی آمد کے بعد تقریباً سب ایک رو میں بہنے لگے اور ایک زبردست دریا کے معاون بن گئے جو سرعت کے ساتھ سمندر سے جا ملنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ گنگا کے اس کشادہ سینہ پر ایک طاقتور جہاز چل رہا تھا

---

[1] ینگ انڈیا ۸ ستمبر ۱۹۲۰ء

[2] تقسیم ہند از امبیڈکر صفحہ ۱۴۹

...... اس کے کپتان مہاتما گاندھی تھے جن کے ہاتھ میں قومی جھنڈا تھا۔[۳۱] اس کے بعد مولانا محمد علی ہندو مسلم اختلافات پیدا کرنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ پھر چھوٹی کشتیاں چلانا چاہتے ہیں لیکن یہ چھوٹی کشتیاں اس زبردست دریا میں محفوظ طریقے پر نہیں چل سکتی وہ قدرت میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے اور بڑی دریا کو الٹا بہاؤ نوں میں بہا کر لے جانا چاہتے ہیں[۳۲]

افسوس کہ جس وقت بعض نیک نیت لیڈروں کی وجہ سے قومی محاذ کے لئے فضا سازگار ہو رہی تھی خود غرض اشخاص ہندو مسلم اختلافات کے لئے میدان صاف کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ہندوؤں میں شدھی اور سنگٹھن اور مسلمانوں میں تنظیم اور تبلیغ کی تحریک چل رہی تھی جس سے فرقہ داری کشیدگی بڑھ گئی۔ موپلا بغاوت کے بعد مسلسل فسادات رونما ہوتے رہے۔ یہ بغاوت ابتدا میں انگریزوں کے خلاف تھی۔ یہ اعلان کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان دارالحرب ہے۔ یا تو اس حالت کو انگریزوں سے مقابلہ کر کے بدلنا ہوگا یا ہندوستان سے اسلامی ممالک کو ہجرت کرنا ہوگا۔ بغاوت کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ سوراج قائم ہو گیا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہندوؤں پر حملہ کیوں کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے مسئلہ پر تصادم ہو گیا۔ ہندوؤں کو زبردست نقصانات ہوئے اور

---

[۳۱] خطبات کانگریس صفحات ۲۶۶ تا ۲۷۰

[۳۲] ،، ،، صفحہ ۲۷۸

سارے ہندوستان کے ہندوؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے بعد کئی سال تک برابر شدید فسادات ہوتے رہے۔ کوہاٹ کے فسادمیں ہندوؤں کو شدید جانی و مالی نقصانات لاحق ہوئے حتیٰ کہ بالآخر ان کو کوہاٹ کا تخلیہ کرنا پڑا۔

فسادات کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ قوم پرست اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کو مایوسی ہوتی رہی۔ قوم پرست لیڈروں نے بارہا اعلان کیا کہ بغیر اتحاد کے سوراج کا حصول ممکن نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے دہلی میں اپنی تقریر میں اتحاد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا "اگر آج ایک فرشتہ بادلوں سے نیچے اترے اور دہلی کے مینار سے یہ اعلان کرے کہ "آپ کو ۲۴ گھنٹوں کے اندر سوراج مل جائے گا اگر آپ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کر دیں گے"، لیکن میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے سوراج کو قربان کر سکتا ہوں اس لئے کہ سوراج کی تاخیر سے صرف ہندوستان کو نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد غائب ہو جائے تو انسانیت کو نقصان ہوگا۔[۱۱] "مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا تھا" غیر ملکیوں سے عدم تعاون اور پڑوسیوں کے ساتھ تعاون کے ماسوا تمھارے لئے کوئی اور متبادل صورت نہیں[۱۲]۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس نے بھی واضح کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج حاصل کرنا

---

[۱۱] انڈین ریویو اکتوبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۰۲

[۱۲] خطبات کانگریس خطبہ مولانا محمد علی صفحہ ۶۶۲

ممکن نہیں[۱۶۱] ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے میں فرقہ واری مسئلہ کے حل کے بغیر استقامت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ درحقیقت اختلافات اس وقت بہت کچھ رفع ہو چکے تھے لیکن ایک دوسرے سے خوف عدم اعتماد اور شبہ برقرار تھا جو پھوٹ کے بیج بو رہا تھا۔[۱۶۲] بہر کیف ہر سیاسی پلیٹ فارم سے فرقہ وارانہ اتحاد اور مفاہمت کی اہمیت کو محسوس کروایا جانے لگا۔

مسلم لیگ کے پندرھویں اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کے مطالبات کی بابت جو قرار دادیں منظور ہوئیں تھیں ان کا لب لباب یہ تھا۔[۱۶۳] اب محسوس کر لیا گیا کہ سوراج کے تخیل کو عملی سیاست میں جگہ دی جائے۔ ایسی سرحدی تبدیلی جس سے مسلم اکثریت کے صوبے مثلاً پنجاب۔ بنگال اور صوبہ سرحد متاثر ہوتے ہوں عمل میں نہ لائی جائے۔ مجالس مقننہ اور بنیایتی جماعتوں میں اقلیتوں کی مناسب نمایندگی ہو۔ کسی اکثریت کو نہ اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ مساوی کر دیا جائے۔ ہر فرقہ کو عقیدہ اور عبادت کی آزادی حاصل ہو نیز پروپگنڈہ اجتماع اور تعلیم کی آزادی عطا کی جائے۔ مخلوط انتخابات نشستوں کی تخصیص کے ساتھ مسلمان پسند نہیں کرتے اس لئے کہ اس سے اتحاد متاثر ہو گا۔ اقلیتوں کے جداگانہ حلقہ ہائے

---

[۱۶۱] خطبات کانگریس خطبہ مولانا محمد علی صفحہ ۶۹۴

[۱۶۲] ،، ،، خطبہ ۱۹۲۳ء از جواہر لال نہرو صفحہ ۸۸۷

[۱۶۳] ماڈرن ریویو جولائی ۱۹۲۴ء صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۴

انتخاب کا طریقہ برقرار رکھا جائے۔ تاوقتیکہ کوئی اقلیت بذات خود اس کو ترک کردینے کا ارادہ ظاہر نہ کرے۔ ہندو مسلم فرقوں میں کشیدگی پر اظہار افسوس کیا گیا جو لوگ فسادات میں ہاتھ بٹاتے ہیں قومی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بغیر ہندو مسلم اتحاد کے کوئی سیاسی ترقی ممکن نہیں ملک کا مفاد باہمی اتحاد کا متقاضی ہے۔ ملک کی پبلک جماعتوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی کوششیں صرف کردیں چونکہ سوراج کے حصول کے لئے فرقہ وارانہ اتحاد کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے فرقہ وارانہ اختلافات ہر سال پیدا ہوتے ہیں۔ مسلم لیگ نے یہ مشورہ دیا کہ مصالحتی انجمنیں بنائی جائیں جس میں ہر فرقے کے نمائندے ہوں ہر ضلع میں ایسی انجمنیں ہوں اور ہر صوبے میں اس کا مرکز ہو۔ اس کے مقاصد ایسے معاملات کا تصفیہ کرنا ہو جس سے فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔

مولانا محمد علی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے یہ مشورہ دیا[۹۱] کہ ہر ضلع کے مرکز پر صوبہ واری کانگریس کمیٹی خلافت کمیٹی۔ ہندو مہاسبھا اور دیگر مقامی جماعتوں کے مشورے سے مشترک کمیٹیاں بنائی جائیں تاکہ ضلع میں امن و امان قائم رکھنے میں ان سے مدد ملے مستقل طور پر صوبہ واری اور قومی مصالحتی انجمنیں تشکیل دی جائیں۔ ان جماعتوں کے سپرد فسادات کی تحقیق اور ان کا سدباب ہوگا۔ اس سے قبل کانگریس نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ کانگریس کمیٹیوں کی جانب سے شہری محافظ دستے قائم کئے جائیں

---

۹۱ خطبات کانگریس۔ خطبہ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحات ۵۹۹ تا ۶۰۰

جن میں ہر فرقے کی نیابت ہو اور جو ملک کا امن و امان برقرار رکھتے ہوئے شہری فرائض انجام دیں گائے اور باجے کی وجہ سے جو ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں اُن کی روک تھام کے لئے مولانا نے کہا کہ اس کا تدارک فرقوں میں صحیح اسپرٹ پیدا کر کے کیا جاسکتا ہے

مئی ۱۹۲۴ء کے لیگ کے غیر معمولی اجلاس بمقام لاہور میں مسٹر جناح نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا "اگر ہندو مسلمان دلی اور ایمانداراانہ کوشش کریں تو ہم ضرور اس کا حل دریافت کرلیں گے جیسا کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کیا تھا اور صرف اس وقت جبکہ ہندوستان متحد اور مضبوط ہوگا تو وہ برٹش پارلیمنٹ اور برٹش قوم کو . . . . مجبور کر دیں گے کہ وہ ذمہ دارانہ حکومت گورنمنٹ ہندوستان کو دے"[۲۰] اس کے بعد انھوں نے کہا . . . . . . ہموطنوں میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ متحد ہو جائیں اور ایسے وسائل معلوم کریں جس سے ہم اپنے نصب العین یعنی ہندوستان کی آزادی حاصل کر سکیں"[۲۱] مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ . . . . . میں فرقہ وارانہ نیابت کا مخالف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجالس قانون میں ملک کے بہترین اور قابل ترین افراد نمائندگی کریں . . . . اکثر مسلمان مجالس قانون اور ملازمتوں میں علٰحدہ نیابت چاہتے ہیں اور اسی جذبے کی وجہ سے جماعتی اختلاف پیدا ہوئے ہیں"[۲۲]

---

۲۰ بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۱۸۱

۲۱ " " " ۱۸۲

۲۲ " " " ۱۸۳

مئی ۱۹۲۳ء کو بمقام لاہور ایک جلسہ صلح منعقد کیا گیا۔ اس میں مسیح الملک ڈاکٹر انصاری، علی برادران اور پنڈت مدن موہن مالویہ بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے میں فرقہ وارانہ مسائل زیر بحث رہے۔ اسی زمانہ میں لالہ لاجپت رائے نے اپنی (۱۳) شرائط کو پیش کیا۔[۲۳]

۱۔ اپنے دلوں کو قطعی حقوق کے عقیدہ فاسد سے پاک رکھو۔

۲۔ سیاست کو مذہب سے پاک رکھو۔

۳۔ جہاں تک ممکن ہو مذہب کو معقولیت پر مبنی بناؤ اور صرف لوازم و فرائض پر زور دو۔

۴۔ تمام مجلسی رکاوٹوں کو جو ایک قوم کو دوسری قوم سے جدا کرتی ہیں دور کرو۔

۵۔ دنیا بھر کے ہر ایک ملک کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ محبت کرو اور اول تا آخر ہندوستانی رہو۔

۶۔ تمام کوششیں اپنے وطن میں خیالات بہتر بنانے پر مبذول کرو۔ جو بات اپنے بیرون ملک کے ہم مذہبوں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور گاہے گاہے مدد کرنے سے نہیں روکتی بشرطیکہ اپنے ہم وطنوں کے متعلق آپ کا فرض اس کی اجازت دیتا ہو۔

۷۔ تحریک شدھی سے تنظیم قائم رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔

۸۔ آپ سنگھٹن اور تنظیم کی کوشش کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اس کا

---

[۲۳] بحوالہ سیاست ملیہ صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۱

ہندوؤں مسلمانوں کے خلاف جذبات سے پاک رکھیں لیکن میری رائے میں یہ مشکل ہے۔

۹۔ اگر آپ چاہیں تو مقننہ میں مناسب نیابت حاصل کر سکتے ہیں مگر علیحدہ رائے دہندگی پر اصرار نہ کریں۔

۱۰۔ اکثریت کی حکومت موثر بنانے کے لئے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

۱۱۔ آبادی کو مقامی مجالس میں نیابت کی بنیاد بنانے پر اصرار نہ کیا جائے۔ اگر آپ کے لئے ایسا کرنا لازم ہے تو خیر کر لیجئے۔ مگر یہاں بھی علیحدہ رائے دہندگی پر اصرار نہ کیا جائے۔

۱۲۔ چند عام وسیع اصولوں کی بنا پر سرکاری عہدوں کے پر کرنے کے کام کو باقاعدہ بنانے کے لئے پبلک سروس کمیشن مقرر کیا جائے۔

۱۳۔ یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں کوئی فرقہ وارانہ نیابت نہ ہو لیکن پسماندہ جماعتوں کے لئے خاص سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور سرکاری محاصل میں ان کے فائدے کے لئے خاص مالی امداد دی جائے۔

اتحاد کانفرنس دہلی سنہ ۱۹۲۴ء[۱]

باوجود دونوں فرقوں کے لیڈروں کی اپیل اور جدوجہد کے اختلافات

---

[۱] مواد اس رسالہ سے لیا گیا (انڈین ریویو اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء صفحات ۶۲۵ تا ۶۲۸)

برابر جاری رہے اور شدید فسادات کی شکل میں رونما ہوتے رہے۔ گاندھی جی ان فسادات سے بہت متاثر ہوئے اور ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ۲۱ دن کے برت رکھنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ "حالیہ واقعات[ثلہ] میرے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئے" ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے لکھا "میں نے دو راتیں تکلیف اور بے چینی میں گزاریں۔ چہارشنبہ کے دن میں نے اس کا علاج معلوم کرلیا۔ مجھے کفارہ دینا چاہئے" حکیم اجمل خاں مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ نے گاندھی جی کو برت سے باز آنے پر مجبور کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ انھوں نے کہا "میرا کفارہ ایسے قلب کی دعا ہے جس سے خون جاری ہے۔ یہ ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے تنبیہ ہے جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اور اگر میں ان کی محبت کا مستحق ہوں تو وہ اپنی غلطی پر جو کہ انھوں نے اپنے دل میں خدا سے انکار کرنے کی ہے میرے ساتھ کفارہ دیں گے۔

گاندھی جی کے برت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء بمقام دہلی اتحاد کانفرنس طلب کی گئی جس میں مختلف صوبوں کے (۳۰۰) نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا انعقاد حکیم اجمل خاں۔ سوامی شردھانند اور مولانا محمد علی کی اپیل کی بناء پر ہوا۔ اپیل میں کہا گیا کہ جو شخص آئندہ نفاق پیدا کرے گا خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ مولانا محمد علی نے کارروائی کی ابتداءً کرتے ہوئے رواداری کی تلقین کی اور کہا کہ بغیر رواداری کے ملک میں امن نہیں قائم ہوسکتا۔ یہ کانفرنس پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد

ثلہ بحوالہ رسالہ انڈین ریویو اکتوبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۶۲۵

ہوئی تھی۔ کانفرنس میں یہ قرارداد میں منظور ہوئی۔ آزادی مذہب و ضمیر ضروری ہے اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی چاہے وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں قابل نفرت عمل ہے۔ تبدیلی عقیدہ پر کسی کو سزا دینا یا تکلیف پہنچانا یا جبراً تبدیلی مذہب کروانا مناسب نہیں۔ اراکین کانفرنس نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ وہ ان اصولوں کو عمل کروانے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

ایک قرارداد میں صدر سے التجا کی گئی کہ وہ گاندھی جی اپنے برت ختم کرنے کی التجا کریں تاکہ ان کے مشورے اور رہبری سے مسائل حل کئے جاسکیں۔ لیکن گاندھی جی برت توڑنے پر راضی نہ ہوئے البتہ انہوں نے کہا اگر ڈاکٹر یہ مشورہ دیں کہ ان کی جان خطرے میں ہے تو برت توڑا جاسکتا ہے ورنہ پورا کیا جائے گا۔ مجلس موضعات میں مولانا شوکت علی نے ایک قرارداد پیش کی جس کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ کانفرنس ہندو مسلم فسادات کو جس کی وجہ سے جانی و مالی نقصانات ہو رہے ہیں اور مندروں کی بے حرمتی ہو رہی ہے افسوس کرتی ہے۔ یہ حرکات مذہب کے خلاف اور بربریت میں شامل ہیں۔ اس کانفرنس کو مصیبت زدوں کے ساتھ ہمدردی ہے جن کو فسادات کی وجہ سے نقصانات لاحق ہوئے۔ کانفرنس کے خیال میں کسی شخص کا بدلہ لینے یا سزا کی خاطر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا غیر مذہبی نیز غیر قانونی ہے۔ کانفرنس کے خیال میں اختلافات چاہے کسی نوعیت کے ہوں ثالثی کے ذریعہ طے پائیں یا اس سے ممکن نہ ہو تو عدالت میں پیش کئے جائیں۔

مجلس موضوعات میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ مختلف فرقوں کے

جھگڑے طے کرنے کے لئے قومی مجالس پنچائت قائم ہوں جس میں (۱۵)
اراکین ہوں اور اس پنچائت کو چھوٹے علاقوں میں چھوٹی چھوٹی پنچایتوں
کے قیام کا اختیار ہو۔ مجلس موضوعات نے گاؤکشی کی نسبت یہ قرارداد
متفقہ طور پر منظور کی۔ ہندو یہ نہ سمجھیں کہ کسی مجلس مقننہ کے قانون یا مقامی
جماعتوں کے قانون سے مسلمانوں کو گاؤکشی سے روکا جا سکتا ہے۔
یہ معاملہ صرف صلح و آشتی ہی کے ذریعہ طے ہو سکتا ہے۔ گاؤکشی ایسے
مقام پر نہ ہو جس سے ہندوؤں کو اعتراض ہو۔ کانفرنس کے مسلم
اراکین نے مسلمانوں سے التجا کی کہ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے ہاتھ
بٹائیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ دیگر چھوٹی اقلیتیں مثلاً
سکھ۔ عیسائی۔ پارسی وغیرہ سے رواداری برتیں۔ ایک قرارداد کے
ذریعہ فرقہ وارانہ بائیکاٹ جو جاری تھا اس کی مخالفت کی گئی۔

۱۹۲۳ء کے آخری تین ماہ کانگریسی لیڈر پھر سے اتحاد پیدا
کرنے کی جدوجہد میں برسرِ عمل تھے۔ دہلی کانگریس میں ایک کمیٹی اس لئے
مقرر کی گئی کہ قومی میثاق کا مسودہ تیار کیا جائے۔ اس اتحادی کمیٹی کا
کام ڈاکٹر انصاری اور لالہ لاج پت رائے کے سپرد کیا گیا۔ اس کمیٹی نے
"سولن پیکٹ" کے نام سے اپنی رپورٹ پیش کی جس کو کانگریس کمیٹی نے
بھی منظور کیا اس میں صرف مذہبی آزادی پر زور دیا گیا اور مذہبی جھگڑوں
کا تصفیہ کرنے کے لئے سفارشات پیش کی گئیں۔ لیکن فرقہ وارانہ نیابت
ملازمت اور اقتدار کے مسائل کو حل نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد مسٹر
سی۔ آر داس اور ان کے رفقائے کار نے بنگال کے لئے ہندو مسلم

میثاق مرتب کیا۔ اکثریت کے لئے (۶۰) فی صد نشستیں معین کی گئی اور اقلیتوں کے لئے (۴۰) فی صد۔ یہ بھی طے پایا کہ مسلمانوں کو (۵۵) فی صد ملازمتیں دی جائیں۔[۲۳] اس میثاق کی ہندوؤں نے سخت مخالفت کی۔

آل پارٹیز کانفرنس ۱۹۲۴ء بمبئی

اکتوبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی سوراجسٹ منی فسٹو[۲۴] پنڈت موتی لال نہرو سی۔ آر۔ داس اور مسٹر گاندھی کی دستخط سے جاری ہوا۔ یہ کلکتہ کانفرنس کا نتیجہ تھا اس میں کہا گیا کہ سوراج ہر جماعت کا نصب العین ہے لہٰذا ان سب جماعتوں کو کانگریس کے اندر ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی جائے۔ کانگریس فرقہ وارانہ اتحاد و مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس اعلان کے بعد نومبر کو کل جماعتی کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی۔

۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء کو کل جماعتی کانفرنس کا اجلاس بمقام بمبئی منعقد ہوا اس اجلاس میں منجملہ اور قومی مسائل کے ایک اتحاد کمیٹی تشکیل دی گئی۔ مسٹر گاندھی نے کل جماعتوں کے اتحاد کے لئے ایک قرارداد پیش کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ یہ کمیٹی جملہ سیاسی جماعتوں کے اتحاد پر غور کرے گی اور سوراج کی ایک اسکیم بنائے گی۔ یہ کمیٹی ہندو مسلم اتحاد پر بھی غور کرے گی۔

---

۲۳ ہندوستان ۱۹۲۲ء ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۶۰

۲۴ انڈین ریویو نومبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۹۴

آل پارٹیز کانفرنس اجلاس دہلی ۱۹۲۵ء

۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء کو کل جماعتی کانفرنس کی ایک کمیٹی کا اجلاس مسٹر گاندھی کی صدارت میں بمقام دہلی منعقد ہوا۔ یہ کل جماعتی کانفرنس درحقیقت نمائندہ جماعت تھی[۲۸]۔ اس کانفرنس میں تقریباً ہر سیاسی جماعت کے نمائندے موجود تھے۔ مسٹر جناح نے فرقہ داری مسئلہ پر اشارہ کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا[۲۹] "ہندو مسلمانوں میں جو اختلافات مجلس آئین ساز اور دوسری انتخابی مجالس میں ان کی نمائندگی اور ملازمت میں ان کے حصے کے متعلق ہیں وہ ملک کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اس سوال کا حل تلاش کرے۔ جس وقت تک یہ رکاوٹ راستے سے دور نہیں ہوگی اس وقت تک ہم کسی طرح بھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ جو اپنے طبقوں میں ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں آج یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ سمجھ دار انسانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ طریقہ پر تبادلہ خیال کریں" سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا "میں مسلمانوں کی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کی کثرت قلت سے نہ بدلنی چاہئے اور دوسرے صوبوں میں قلیل التعداد قوم کے حقوق کی حفاظت کے جو دو اصول معاہدہ لکھنؤ میں طے کئے گئے ہیں وہ قائم رکھے

---

[۲۸] تقسیم ہند از اعیڈکر صفحہ ۳۰۰

[۲۹] بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۱۸۶

جائیں۔[۱۳۰] دہلی کے اس اجلاس میں لالہ لاجپت رائے نے فرقہ وارانہ نیابت کو ہندوستان کے قومی مفاد کے خلاف قرار دیا۔

مختلف نمائندوں کی تقاریر کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۲۴ء کو ایک ذیلی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جس کے (۴۰) اراکین تھے اس کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ ایسی سفارشات پیش کی جائیں جس سے جملہ جماعتیں کانگریس میں شریک ہو سکیں مختلف فرقہ جات کے لئے نیابتی ادارات اور مجالس مقننہ نشستوں کا تعین کرنا تاکہ سوراج کے حصول کے بعد مسئلہ پیچیدہ نہ ہو جائے۔ سوراج کا ایک ایسا دستور بنانا جو ملکی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔ ایسی سفارشات پیش کی جائیں جس میں خوبی کارکردگی کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف فرقوں کی نیابت کا مناسب حل ہو جائے۔ سوراج کے اسکیم کو پیش کرنے کی نسبت جو کمیٹی مسز انی بسنٹ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اس نے تو اپنی رپورٹ کو پیش کر دیا لیکن فرقہ وارانہ نیابت کی نسبت جس کمیٹی نے اپنا اجلاس دہلی میں منعقد کیا کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں لالہ لاجپت رائے اور دیگر ممتاز ہندو قائدین نے شرکت نہیں کی تھی۔[۱۳۱]

فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کرنے میں مسٹر سرینواس آئینگار کی جدوجہد

مسٹر سرینواس آئینگار نے اپنے خطبہ صدارت کانگریس بمقام گوہاٹی

---

۱۳۰ بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۱۸۸

۱۳۱ ایضاً کرتقسیم ہند ،، ۲۰۱

۱۹۲۶ء میں کہا کہ[۱] فرقہ واریت سوراج کے حصول میں ایک روڑا ہے یہ بات عام طور پر تسلیم کی جارہی ہے کہ اگر دو فرقوں میں لڑائی ہوتی رہیگی تو فیصلہ کرنے والا تیسرا ہوگا جو باہر والا ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ اول تا آخر ہم ہندوستانی ہیں۔ قومی نیابت اور قومی قیادت ہمارا فرض ہونا چاہیئے نہ کہ فرقہ وارانہ نیابت اور فرقہ وارانہ قیادت۔ محب وطن ہندو اور مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کی بھی رہبری کرنی چاہیئے۔ برطانیہ عظمیٰ میں انگریز اسکاچ تانی اور ویلز کے باشندوں کے نسلی لسانی اختلافات اور عادات و اطوار حکومت خود اختیاری کے قیام میں مزاحم نہیں ہوئے اور نہ فرانس انگلستان کنیڈا میں پراٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک جھگڑے حکومت خود اختیاری کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئے۔ ہندو مسلمان۔ برہمن اور غیر برہمن کے اختلافات ایسے نہیں جو ان کو ایک قوم بننے سے روک سکیں۔ عام بہبودی کے معاملات میں کہیں بھی تصادم نہیں۔ چونکہ مذہبی اصول اور ادارات ہر فرقے کے مخصوص ہیں۔ لہٰذا سوراج کے دستور میں ان کا تحفظ ضروری ہے۔ مثلاً آزادی ضمیر و عقیدہ و حق اجتماع وغیرہ۔ کانگریس نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ مقننہ میں اگر فرقہ متعلقہ کے (۳/۴) اراکین کسی مسودے کی مخالفت کریں تو اس کو منظور نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی ترقی کے لئے جملہ فرقوں کی ترقی ضروری ہے اگر ایک فرقہ ترقی کرے تو دوسرے فرقے اس کے خلاف ہو جاتے ہیں فرقہ واریت سے ایک فرقے کو اتنا فائدہ نہیں

---

[۱] خطبات کانگریس صفحات ۷۱۶ تا ۷۲۲

پہنچایا جاتا کہ دوسرے فرقوں کے خلاف فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی ہندو اور مسلمان رکن مجلس مقننہ میں اپنے مذہب کی نیابت نہیں کرسکتا سوائے اس کے کہ کوئی مذہبی معاملہ ہو۔

کل ہند کانگریس کمیٹی نے گوہاٹی میں اتحاد کی نسبت خاص مساعی اختیار کرنے کی تجویز منظور کی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ ہندو مسلمان لیڈروں سے مشورے کرکے اپنی تجاویز پیش کریں جملہ جماعتوں کے مشورے کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل تجاویز[۳۳] مرتب کیں جس کی کانگریس کمیٹی نے تائید کی۔

۱۔ ہندوستان کے آئندہ دستور میں صوبہ واری اور مرکزی مجلس مقننہ میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کی بنیادوں پہ نیابت ہو۔

دونوں فرقوں کے لئے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے ساتھ صوبہ واری اور مرکزی مجلس مقننہ میں نشستوں کا تعین کردیا جائے۔ نشستوں کا تعین آبادی کے تناسب پر ہوگا۔

۲۔ مسلمان لیڈروں کا یہ مطالبہ کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد شمال مغربی میں دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات عمل میں لائی جائیں مناسب اور حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ صوبوں کی لسانی بنیادوں پہ از سرنو تقسیم ہو۔ اس کی ابتدأ اندھرا سندھ اور کرناٹک کو علیحدہ صوبہ بنا کر کی جا سکتی ہے

---

[۳۳] خطبات کانگریس خطبہ ۱۹۲۷ء صفحات ۸۳۳ تا ۸۳۴

- آیندہ دستور میں آزادیٔ ضمیر حاصل ہو اور کوئی مجلس مقننہ چاہے صوبہ واری ہو یا مرکزی آزادیٔ ضمیر کو متاثر کرنیوالا قانون نافذ نہ کرے۔ آزادی ضمیر سے آزادی عقیدہ و مذہب۔ مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی نیز آزادی پروپیگنڈہ مراد ہے جس سے دوسروں کے احساسات متاثر نہوں۔

۵۔ کوئی مسودہ یا قرار داد ترمیم فرقہ واری معاملات میں منظور نہ کی جائے جب تک کہ فرقہ متعلقہ کے (۳/۴) اراکین اس کی تائید نہ کریں۔

اتحاد کانفرنس ۱۹۲۷ء

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو بمقام کلکتہ اتحاد کانفرنس مسٹر سرنیواس آئینگار کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ بڑے بحث و مباحثے کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی دور کرنے کے لئے دو قرار دادیں منظور کی گئیں[۳۴]

۱۔ ہر فرقہ کو تبلیغ کے ذریعہ دوسرے فرقوں سے تبدیلیٔ مذہب کروا کر اپنے مذہب میں شریک کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ عمل دھوکہ۔ جبر اور مادی ترقیات کے ذریعہ نہ ہو۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے شخص کا مذہب تبدیل نہ کیا جائے تاوقتیکہ ان کے والدین یا سرپرست اس کی اجازت نہ دیں تبدیلی مذہب کے معاملہ کو نہ راز میں

---

[۳۴] خطبات کانگریس خطبہ ۱۹۲۷ء صفحات ۸۳۵ تا ۸۳۷ اور تاریخ کانگریس صفحات ۵۴۲ تا ۵۴۳

رکھا جائے اور نہ اس خصوص میں خوشی کا مظاہرہ کیا جائے جب کبھی تبدیلی مذہب سے متعلق شکایت کا موقع پیش آئے یا گاؤکشی کا قضیہ درپیش ہو تو اس کا فیصلہ ایک خاص جماعت کے سپرد ہوگا جس کو ورکنگ کمیٹی مقرر کرے گی۔

۲۔ ہندوؤں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ اپنے سماجی اور مذہبی فرائض کے تحت کسی وقت بھی مسجد کے سامنے سے مذہبی یا غیر مذہبی جلوس لے جا سکتے ہیں اور باجا بجا سکتے ہیں۔ لیکن جلوس کو مسجد کے سامنے ٹھیرایا نہ جائے اور ایسا باجا یا گانا نہ گایا جائے جس سے عبادت میں حرج ہو یا جس سے دوسرا فریق مشتعل ہو جائے اسی طرح مسلمان کسی گاؤں یا شہر میں گاؤکشی کر سکتے ہیں لیکن کسی شاہ راہ پر یا کسی مندر کے قرب و جوار یا ہندوؤں کی عام نگاہ کے سامنے گاؤکشی نہ کی جائے۔ گائے کو ذبح کرنے کی غرض سے جلوس اور مظاہرے نہ کئے جائیں۔ مسلم فرقے سے اپیل کی گئی کہ وہ گاؤکشی کے معاملہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کریں جس سے ہندو فرقہ کو شکایت کا موقع ملے۔

لیکن یہ اتحاد کانفرنس بھی دیگر کانفرنسوں کی طرح ناکام رہی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کو نہ لیگ اور نہ مہا سبھا کی تائید حاصل تھی[۳۵]

ہندو مسلم اتحاد کی ایک اور کوشش ۱۹۲۷ء کو کی گئی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ جس طرح سے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل میثاق لکھنو کے ذریعہ ہندو مسلم مسئلہ کو حل کیا گیا اسی طرح سائمن کمیشن کی آمد سے قبل ہندو مسلم

---

[۳۵] امبیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۰۶

اتحاد کا ایک فارمولا تیار ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ بعض ممتاز مسلمان ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں جمع ہوئے اور مسلمانوں کے مطالبات کو ملک کے سامنے پیش کیا گیا یہ اعلان مسلم تجاویز کے نام سے مشہور ہے انھوں نے اعلان کیا کہ مسلمان مجالس قانون ساز کے انتخابات کے لئے مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب قبول کرنے تیار ہیں بشرطیکہ ان کے حسب ذیل مطالبات قبول کئے جائیں[۲۳]

۱۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

۲۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے ساتھ دیگر صوبوں کی طرح برتاؤ کیا جائے۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے نیابت ہو

۴۔ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت (۱/۳) سے کم نہ ہو۔

ان تجاویز کے اعلان کے بعد ہندو مسلم مفاہمت کی امید بندھ گئی۔ چنانچہ ان تجاویز پر مدراس کانگریس ۱۹۲۷ء غور کیا گیا۔ کانگریس کے اس اجلاس میں ہندو مسلم مسئلہ پر کافی غور و خوض رہا اور سیاسی مذہبی اور فرقہ واری حقوق پہ ایک طویل قرارداد منظور کی گئی۔ سوراج کے متعلق یہ قرارداد منظور کی گئی کہ "ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کی اس عام خواہش کو مد نظر رکھ کر کہ وہ سوراج کے دستور کی ترکیب میں متفق ہو جائیں اور ان مختلف مسودوں پر جو پیش کئے گئے اور ان مختلف تجاویز

---

[۲۳] بحوالہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس ۱۹۲۸ء (ترجمہ جامعہ ملیہ دہلی صفحہ ۲۵)

جو جماعت عاملہ کی گشتی چٹھی کے جواب میں موصول ہوئیں غور کرنے کے بعد
کانگریس مجلس عاملہ کو (جسے مزید اراکین کے شامل کرنے کا حق ہوگا)
تجویز کرتی ہے کہ وہ اس قسم کی ان دوسری کمیٹیوں سے مشورہ کرے
جن میں ملک کی سیاسی۔ تجارتی۔ فرقہ وارانہ اور مزدوروں کی انجمنیں
مقرر کریں اور ہندوستان کے لئے سوراج کا ایک ایسا دستور مرتب
کرے جو اعلان حقوق پر مبنی ہو۔ اور اس دستور کو بحث اور منظوری کیلئے
اس خاص اجتماع میں پیش کرے جو آئندہ مارچ سے پہلے دہلی میں منعقد
ہوگا اور جس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان اور متذکرہ بالا انجمنوں
کے رہنما اور نمائندے اور مرکزی صوبوں کی مجالس قانون ساز کے منتخب
شدہ اراکین شامل ہوں گے[۲۵]۔ کانگریس نے اپنی ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار
دیا تھا کہ دیگر جماعتوں کے مشورے کے بعد سوراج کی نسبت ایک مناسب
دستور مرتب کیا جائے۔ اس کے چند دن بعد مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ
میں منعقد ہوا۔ ایک قرارداد میں لیگ کونسل کو ایک ذیلی کمیٹی کے
تقرر کا اختیار دیا گیا جو "انڈین نیشنل کانگریس اور ایسی دوسری جماعتوں
سے مشورہ کرے جنھیں کونسل ہندوستان کا ایسا آئین بنانے کے لئے
موزوں تصور کرے جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری نگہداشت ہو
۱۹۲۷ء کی متذکرہ بالا دہلی والی تجاویز کے مطابق کی گئی ہو"[۲۶]
کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حسب قرارداد مدراس کانگریس ۱۲ر فروری

---

[۲۵] بحوالہ رپورٹ نہرو کمیٹی صفحہ ۲۰

[۲۶] بحوالہ رپورٹ " " ۲۴

۱۹۲۸ء کو بمقام دہلی آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس طلب کیا۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی مختلف سیاسی سماجی اور معاشی انجمنوں نے شرکت کی۔ جو پہلا سوال اس کانفرنس میں اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ آیا ہندوستان کا دستور قلمروی درجہ کا ہو یا مکمل خود مختار دستور ہو بعض اراکین نے کہا کہ کانگریس ۱۹۲۷ء کو اپنا نصب العین مکمل حکومت خود اختیاری قرار دیا ہے لہذا اس پر قائم رہنا چاہیئے۔ بالآخر کامل ذمہ دارانہ حکومت پر اتفاق کیا گیا اس کانفرنس میں صوبوں کی جدید تقسیم حلقہ ہائے انتخاب اور نشستوں کے تحفظ پر بھی قرار دادیں منظور کی گئیں اس کانفرنس میں ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جس کو مجالس مقننہ حق رائے دہندگی اور دیگر قومی امور کی بابتہ تجاویز پیش کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد دوبارہ اس کانفرنس کا اجلاس ۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو بمقام دہلی منعقد ہوا۔ اسی دوران میں لیگ کی کونسل کا بھی اجلاس ہوا .... لیکن لیگ کی کونسل نے آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اس زمانے میں مسلم لیگ اور ہندو سبھا میں سندھ کی علحدگی اور نشستوں کی تقسیم میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

۱۱ مارچ ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس نے دو ذیلی کمیٹیوں کا تقرر کیا۔ ایک کمیٹی کے تفویض سندھ کی علحدگی کے مالی پہلو کی چھان بین تھی اور دوسری کمیٹی کو نیابت کے مسائل کا حل پیش کرنا سپرد کیا گیا۔ اس کے بعد آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمقام بمبئی منعقد ہوا

لیکن فرقہ وارانہ کشمکش بڑھ چکی تھی اور دہلی میں جن دو کمیٹیوں کا تقرر کیا گیا انھوں نے کوئی رپورٹ پیش نہیں کی۔ اب یہ طے کیا گیا کہ ایک مختصر کمیٹی کا تقرر کیا جائے تاکہ ہندوستان کے دستوری مسئلہ کو باتفاق آرا حل کیا جائے۔ چنانچہ آل پارٹیز کانفرنس نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ارکان سر علی امام۔ مسٹر شعیب قریشی مسٹر انے۔ مسٹر جیکر۔ مسٹر پردھان مسٹر جوشی۔ سر تیج بہادر سپرو اور سردار منگل سنگھ تھے[۲۸] اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ ۱۰ر اگست ۱۹۲۸ء کو پیش کی۔ اس رپورٹ کو کلکتہ کے اجلاس مورخہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۸ء پیش کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔

نہرو کمیٹی کی سفارشات ۱۹۲۸ء[۲۹]

نہرو کمیٹی نے ہندوستان کے لئے نو آبادیوں کی سی حکومت جیسے قلمروی درجے کی سفارش کی۔ چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کی تمہید میں درج ہے کہ ہندوستان کی حیثیت کسی حال میں خود مختار نو آبادیوں مثلاً کنیڈا۔ اسٹریلیا۔ جنوبی افریقہ اور دولت آزاد آئرلینڈ سے کم ہونی چاہئے[۳۰]۔ نہرو کمیٹی نے ذمہ دارانہ حکومت اور قلمروی درجہ میں فرق نہیں کیا ہے۔ کمیٹی نے بتایا کہ قلمروی درجے سے کم ہندوستانیوں کیلئے

---

[۲۹] رپورٹ نہرو کمیٹی صفحات ۲۶ تا ۲۷

[۳۰] ،، ،، ،، ۲۷

قابل قبول نہ ہوگا۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کی بابت کمیٹی نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں :

اقلیتوں کا مسئلہ ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں یہ مسئلہ حل نہ ہونے کی صورت میں حکومت خود اختیاری دینے کے خلاف بطور دلیل کے استعمال نہیں کیا گیا۔ ہر فرقہ با قتدار حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اور تعین نشست کے ذریعہ یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اس لئے ان کو خدشہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے اُن کو نقصان پہنچایا جائے گا چنانچہ اس مسئلہ سے دو چار ہونے کے لئے مسلمان بعض صوبوں میں غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندو باوجود اکثریت میں ہونے کے ان صوبوں میں جہاں کہ وہ اقلیت میں ہیں مسلمانوں سے خائف ہیں ایک فرقے کو دوسرے فرقے پر اقتدار حاصل نہ ہونا چاہئے۔ ہر فرد اور ہر جماعت کو دوسرے فرد اور دوسری جماعت کی زیادتی سے بچایا جائے۔ یہ امر اب تسلیم کر لیا جا چکا ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب بری چیز ہے اور اس کو ختم کر دینا چاہئے اس سے قومی روح کی نشو و نما کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس طریقے سے ایک فرقہ دوسرے فرقے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ فرقہ پرستوں کو اس اصول سے فائدہ پہنچتا ہے۔ نیابت کے مناسب نظام کی ترویج کی اولین شرط یہ ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ختم کر دئے جائیں۔ بنگال اور پنجاب کے مسلمان تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن یہ غیر ضروری ہے۔ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نیابت ساری مشکلات کا حل ہو سکتا ہے

لیکن کمیٹی کے بعض اراکین نے اس سے اختلاف کیا نشستوں کے تحفظ کا طریقہ اتنا ہی برا ہے جتنا کہ فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کا طریقہ اس سے فرقہ داریت کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور ان دونوں اصولوں میں بہت تھوڑا فرق رہ جاتا ہے۔ صوبہ پنجاب اور بنگال کے مسلمان باوجود اکثریت میں ہونے کے تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں ان کو خوف ہے کہ جو تھوڑی سی اکثریت مسلمانوں کو ان صوبوں میں حاصل ہے وہ تحفظ کا طریقہ ختم ہو جانے سے ان کی تعلیمی اور معاشی پستی کی وجہ سے باقی رہے گی۔ لیکن مسلمانوں کے خطرات بے بنیاد ہیں۔ حقیقت میں ان کو تحفظ کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے اعداد کے ذریعہ اس خوف کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ نظری حیثیت سے اکثریت کے لئے نشستوں کے تعین کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو اس سے اکثریت اور اقلیت دونوں کو نقصان ہوگا۔ دوسرے ان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اگر اس اصول پر زیادہ دن تک عمل کیا گیا تو جماعتیں اپنی خود اعتمادی اور وہ اوصاف کھو دیں گی جن سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے اکثریتوں کے لئے نشستوں کا تحفظ ذمہ دارانہ حکومت کے منافی ہے رائے دہندے جس کو پسند کریں اس کو منتخب نہیں کر سکتے اور حقیقی جماعت بندی نہیں پیدا ہو سکتی جو اصول جمہوریت کی روح ہے۔ کامل ذمہ دارانہ حکومت اور نشستوں کا تحفظ یہ دو متضاد مطالبات ہیں جس جماعت کو نشستوں کے تحفظ کا حق عطا کیا جاتا ہے اس کو

قانوناً یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اکثر رائے و ہندوں کی خواہشات سے بے نیاز ہو کر حکومت کرے۔ یہ جمہوری تصورات کے منافی ہے اس سے اقلیتوں کی ترقی محدود ہو جاتی ہے وہ چار دیواری میں محصور ہو جاتے ہیں اور ان کی ترقی اور نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو جو خوف ہندوؤں اور سکھوں کے اعلیٰ معاشی اور علمی معیار سے پیدا ہوا ہے وہ محض خیالی ہے۔ بنگال اور پنجاب میں مسلمان اتنے زیادہ قوی ہیں کہ بلا تحفظ اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہندو اور سکھ اقلیتیں اپنی آبادی سے کم نشستیں حاصل کریں۔ سردار منگل سنگھ جو نہرو کمیٹی کے رکن تھے انھوں نے مجالس مقننہ میں اکثریت اور اقلیتوں کے نشستوں کے تحفظ سے اختلاف کیا۔ مسلمان یہ خوف ظاہر کرتے ہیں کہ اگر دستوری تحفظ نہ ہو تو مرکزی مجلس مقننہ میں ان کو ۱/۴ حصے سے زیادہ نشستیں نہیں مل سکیں گی حالانکہ کل برطانوی ہند میں ان کی آبادی (۱/۴) ہے۔ ان مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہرو کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ صرف جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں مرکزی اور صوبجاتی مجالس مقننہ میں ان کے لئے آبادی کے تناسب سے نشستوں کا تحفظ کرنا ہوگا اس طرح کچھ عرصہ تک فرقہ وارانہ نیابت برقرار رہے گی لیکن یہ ایک ناگزیر برائی ہے۔

میثاق لکھنؤ اور سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ذریعہ مسلمانوں کو جو زیادہ نمائندگی دی گئی اس کو ختم کر دیا جائے۔ اس سے دوسرے فرقوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مسلمانوں کے لئے آبادی کے تناسب

پورا پورا حق محفوظ کر دیا گیا ہے اگر وہ چاہیں تو مقابلہ اور کوشش سے زیادہ نشستیں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حق پر کسی قسم کے قیود عاید نہیں کیے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ دیگر فرقوں کی ترقی کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا جائے تاکہ ان کی پرواز ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ آبادی سے زیادہ نشستیں عطا کی جائیں حق بجانب نہیں نشستوں کے تحفظ سے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے جو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے ختم ہو جائے گا مسلمانوں کو مرکزی مجلس مقننہ میں ایک تہائی نشستوں کا اصرار ہے حالانکہ ان کی آبادی کل برطانوی ہند کی آبادی کا (۱/۴) حصہ ہے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر تو یہ ہے کہ نشستوں کے تعین کی بہ نسبت آزادانہ مقابلہ ہو۔ البتہ اگر مسلمان نشستوں کے تحفظ پر اصرار کرتے ہوں تو صرف دس سال کے لئے ان کو یہ حق عطا کیا جا سکتا ہے لیکن نشستیں آبادی کے تناسب سے کسی طرح زیادہ نہ ہوں۔

بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کی غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ وہی رعایت کی جائے جو مسلمانوں کو اقلیتوں کے صوبوں میں حاصل ہے۔ ان کے لئے تحفظ نشست کی نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی خاص فائدہ۔ البتہ پنجاب میں سکھ صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے لئے ایک مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کا بنانا بہت مشکل ہے۔ پنجاب میں اگر سکھ صوبجاتی مجلس مقننہ اور مرکزی مجلس مقننہ میں تحفظ نشست کا مطالبہ کریں تو نامناسب نہیں اگر تمام اقلیتوں کے لئے تحفظ نشست کی سفارش کی جائے تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ علاوہ ازیں پارسی

عیسائی وغیرہ اور خود ہندوؤں کی مختلف ذاتیں اپنے لئے حقوق طلب کریں گی۔ دراصل فرقہ وارانہ مسئلہ ہندوؤں مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور اسی بنیادوں پر اس کا حل ہونا چاہئے۔ برہمن اور غیر برہمن مسئلہ صرف جنوبی ہند کی پیداوار ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس کا نام ونشان نہیں۔ لیکن جنوبی ہند میں بھی غیر برہمنوں کو کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت نہیں۔ برہمنوں کے خلاف جو شکایت پیدا ہوئی ہے وہ ان کے سیاسی اور سماجی غلبہ کے خلاف رد عمل ہے۔ پست طبقات کے لئے اتزاجی کا اصول اختیار کیا جائے یا مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کا۔

صوبوں کی از سر نو تقسیم :۔ صوبوں کی از سر نو تقسیم عمل میں لانی چاہئے اس وقت جو تقسیم برقرار ہے وہ کسی عقلی بنیاد پر نہیں۔ یہ محض ان واقعات کا نتیجہ ہے جس کے تحت ہندوستان میں برطانوی حکومت کی توسیع عمل میں آئی۔ موجودہ صوبوں کا تاریخی معاشی' لسانی اسباب سے بہت کم تعلق ہے دوبارہ تقسیم میں جغرافی معاشی اور مالی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہوگا نیز باشندوں کی رضامندی اور لسانی وحدت کا خیال پیش نظر رہے۔ اگر زبان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو اس صوبے کے تعلیمی نظام میں خرابیاں نیز مشکلات پیدا ہوں گی۔ زبان کا تعلق تمدن۔ روایات اور ادب سے ہوتا ہے۔ ایک لسانی منطقے میں یہ عناصر اس صوبے کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ کرناٹک کو علیحدہ صوبہ بنانے کا جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ حق بجانب ہے۔ بڑی اکثریت اس کی تائید کرتی ہے علاوہ ازیں کرناٹک کا مالی پہلو مستحکم ہے۔ اسی طرح ایک بڑی اکثریت سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ کرتی ہے لیکن سندھ کے ہندو اس کے مخالف

ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم مناسب نہیں اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو یہ خدشہ ہے کہ علیحدگی سے صوبہ مسلم اکثریت کے تفویض ہو جائے گا جس سے ان کی اقتصادی حیثیت کو نقصان پہنچیگا۔ لیکن ہندوؤں کے یہ خطرات بے بنیاد ہیں اس لئے کہ سندھ کے ہندو ہندوستان کی تمام آبادی میں بلند ہمت اور عالی حوصلہ ہیں۔ چونکہ سندھ ایک لسانی وحدت ہے اور وہاں کے باشندوں کی اکثریت علیحدگی کی تائید کرتی ہے۔ اس لئے تقسیم کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ البتہ تقسیم سے پیشتر سندھ کے مالی پہلو کی چھان بین کرلینی چاہئے سندھ کی علیحدگی کی تائید میں دلائل مستحکم ہیں۔

اعلان حقوق:۔ چونکہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات موجود ہیں اور ایک فرقہ دوسرے فرقے کو بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتا ہے لہذا بعض ضمانتوں کی ضرورت ہے۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اعلان حقوق کی صراحت دستور اساسی کے ساتھ کردی جائے بنیادی حقوق میں حسب ذیل چیزوں کو درج کیا جائے[۱۲۲]

۱۔ حکومت کا سارا اقتدار اور وضع قوانین۔ تنقید اور عدالت کے تمام اختیارات قوم سے حاصل ہوئے ہیں

اور دولت مشترکہ ہند میں ان پر اس دستور کے مطابق اور ان نظاموں کے ذریعہ عمل درآمد ہوگا جو اس دستور کی رو سے یا اس کے ماتحت وجود میں آئیں۔

---

[۱۲۲] رپورٹ نہرو کمیٹی صفحات ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱

۲۔ کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ نہ اس کی جائے سکونت یا املاک میں کوئی داخل ہو سکے گا نہ انھیں قرق کر سکے گا نہ ضبط الا یہ کہ قانون کے تحت۔

۳۔ اس دستور کی رو سے ہر شخص کو ضمیر کی آزادی اور مذہب کے اقرار اور اس پر عمل کی آزادی حاصل ہوگی بشرطیکہ ان سے امن عامہ یا اخلاق میں خلل نہ پڑے۔

۴۔ اس دستور کی رو سے ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی نیز پر امن طریقے سے اور بلا اسلحہ جمع کئے انجمن یا اتحاد قائم کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ بشرطیکہ ایسے وسائل استعمال کئے گئے ہوں جن سے امن عامہ یا اخلاق میں خلل نہ پڑے

۵۔ دولت مشترک ہند کے تمام شہریوں کو بلا معاوضہ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہوگا اور جو تعلیم گاہیں ریاست کی طرف سے قائم ہوں گی یا اس سے مدد پاتی ہوں گی ان میں داخلے کے بارے میں ذات یا مذہب کی کوئی تمیز نہ کی جائے گی۔ جوں ہی جماعت با اختیار مناسب انتظامات کرلے یہ حق نافذ ہو جائے گا۔

۶۔ قانون کے سامنے سب شہری برابر ہیں اور سب مساوی حقوق رکھتے ہیں۔

۷۔ کوئی تعزیری قانون (نہ اصول قانون نہ ضابطہ) ایسا نہ ہوگا جس میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھا جائے۔

۸۔ کسی شخص کو ایسے فعل پر سزا نہ دی جائے گی جو ارتکاب کے

وقت قانون رائج کی رو سے قابل سزا نہ تھا۔

۹۔ کوئی جسمانی سزا یا ایسی سزا جس میں سخت اذیت ہو قانوناً جائز نہ ہوگی۔

۱۰۔ ہر شہری کو گرفتاری کی صورت میں تحقیقات عدالتی کے مطالبے کا حق ہوگا۔ جنگ یا بغاوت کے زمانے میں مرکزی مجلس قانون ساز اپنے کسی قانون سے اس حق کو کچھ عرصہ کے لئے روک سکتی ہے۔ یا اگر مجلس قانون ساز کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ایسا کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ جلد سے جلد مناسب کارروائی کے لئے اس کی اطلاع جماعت قانون ساز کو دے گا۔

۱۱۔ دولت مشترکہ ہند کا کوئی سرکاری مذہب نہ ہوگا۔ نہ دولت مشترکہ کے کسی صوبے کا اور نہ ریاست براہ راست یا بالواسطہ کسی مذہب کی مالی امداد کرے گی نہ مذہبی عقیدہ یا مذہبی حیثیت کی وجہ سے کسی شخص کو ترجیح دے گی نہ کسی کے استحقاق میں کمی کرے گی۔

۱۲۔ کوئی شخص جو ایسے کسی مدرسے میں تعلیم پاتا ہو جسے سرکاری مدد یا کسی عام فنڈ سے مدد ملتی ہو اس مذہبی درس میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جو اس مدرسہ میں دیا جاتا ہو۔

۱۳۔ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے ...... اعزاز پر متمکن ہونے اور کسی پیشہ یا کاروبار کرنے کے استحقاق میں کسی شخص کے

مذہب یا ذات کی وجہ سے کوئی کمی نہ ہو گی۔

۱۴۔ عام گزرگاہوں کنوؤں اور دوسری عام اجتماع کی جگہوں پر جانے اور انھیں استعمال کرنے کا حق ہر شہری کو برابر حاصل رہے گا۔

۱۵۔ مزدوروں کی حالت اور معاشی حالات کے برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے ہر شخص اور ہر پیشہ کے لوگوں کو ملنے اور انجمن بنانے کی آزادی ہو گی۔ تمام معاہدے اور کارروائی جن سے آزادی کے محدود ہونے یا رکھنے کا احتمال ہو خلاف قانون سمجھی جائیں گی۔

۱۶۔ خدمت کے معاہدے کو توڑنا یا اس کی ترغیب دینا فوجداری جرم نہ سمجھا جائے گا۔

۱۷۔ صحت کو قائم رکھنے تمام شہریوں کو کام کے لائق رکھنے ہر کام کرنے والے کے لئے قوت لایموت کی ضمانت کرنے ماؤں کی حفاظت۔ بچوں کی بہبود اور بڑھاپے ضعیف و ناتوانی اور بیکاری کے معاشی نتائج سے مامون کرنے کے لئے پارلیمنٹ مناسب قانون بنائے گی۔

۱۸۔ ہر شہری کو ان ضوابط کے مطابق جو اس باب میں بنائے جائیں اسلحہ رکھنے کا حق ہو گا۔

۱۹۔ مردوں اور عورتوں کو بہ حیثیت شہری مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

ان سفارشات کے علاوہ عاملہ اور مقننہ کی نسبت سفارشات پیش کی گئیں۔ مرکزی مجلس قانون ساز جماعت دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی ایک سادات دوسرے دارالنائبین۔ دولت مشترکہ کی عاملانہ قوت بادشاہ میں مرکوز ہوگی۔ ہندوستان میں گورنر جنرل نمائندہ شاہی ہوگا۔ گورنر جنرل وزیر اعظم کے مشورے سے گورنر جنرل وزراء کا تقرر کرے گا۔[۱۲۳]

۲۲ر ڈسمبر ۱۹۲۸ء کو رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے کلکتہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی۔ کنونشن کا اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوا۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی زبردست تائید کی لیکن مسلم لیگ کے نمائندوں نے رپورٹ سے سخت اختلاف کیا۔ ہندو مہا سبھا اس رپورٹ کی پرزور تائید کر رہی تھی۔ مسٹر جناح نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے کہا صوبہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی قوت رائے دہی آبادی کے لحاظ سے کم ہے لہذا نشستیں محفوظ کردی جائیں نہرو کمیٹی کی سفارشات کے بموجب مابقی اختیارات مرکز کے سپرد کئے گئے لیکن مسٹر جناح نے مابقی اختیارات کو صوبوں کے تفویض کرنے کی سفارش کی۔ ان کا خیال تھا کہ مرکز کو جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی مابقی اختیارات عطا کرنے سے ہندو راج قائم ہو جائے گا۔ سندھ کی علحدگی میں جو تجدیدات عائد کئے گئے اس سے بھی مسٹر جناح کو اختلاف تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے رپورٹ کی عام مخالفت کی گئی۔ یہ اعتراض کیا گیا کہ نہرو رپورٹ کے بموجب جملہ نو مجالس مقننہ میں سے صرف سات مقننات میں مسلمانوں کا تناسب

---

۱۲۳ مزید تفصیلات ملاحظہ ہو باحثہ مقننہ وعاملہ صفحات ۱۲۱ تا ۱۲۳

کم ہو جاتا ہے بلکہ ۱۹۱۹ء کے قانون سے مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں[34] جب دس سال کے بعد مسلمانوں کے لئے تحفظ نشست ختم ہو جائے تو وہ نہ صرف ہر مجلس مقننہ بلکہ خود اختیاری ادارے سے ختم ہو جائیں گے[35] پست اقوام کا ایک جزبن جائیں گے مسلمانوں کو استثناآت حکومت کے حصے کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی اور ان کی زبان تعلیم تمدن اور مذہبی حقوق نظر انداز کر دئیے گئے[36] یورپینس انگلو انڈینس عیسائی اور پست اقوام کی نیابت مجالس مقننہ میں نہیں ہو سکے گی اس لئے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قبول نہیں کیا گیا ہے[37] اس زمانے میں مسلمان پنجاب اور بنگال میں نشستوں کا تحفظ کروانا چاہتے تھے لیکن نہرو کمیٹی نے اس سے اختلاف کیا مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان دو اکثریت والے صوبوں میں اگر ان کے لئے نشستوں کا تحفظ نہ کیا گیا تو ہندو جن کی معاشی حالت بہتر ہے مجالس مقننہ میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ تمام صوبوں میں مسلمانوں نے نہرو کمیٹی کی سفارشات کے خلاف جلسے کئے۔ مسلمانوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی اور رپورٹ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ خود مسلم کانفرنس کے انعقاد کی بڑی وجہ نہرو رپورٹ سے

---

[34] رپورٹ سیمن کمیشن جلد سوم توضیحی نوٹ از ڈاکٹر شفاعت احمد خان صفحہ ۳۰۲

[35] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

[36] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

[37] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

مایوسی تھی مرکزی مجلس مقننہ کے مسلم اراکین نے محسوس کیا کہ اگر نہرو رپورٹ کو عملی جامہ پہنایا گیا تو مسلم فرقے کے سیاسی وجود کو خطرہ لاحق ہو گا۔[۳۸]
چنانچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ء ممتاز مسلم اراکین نے اعلان شائع کیا کہ "..... رپورٹ کے مصنفین اور لکھنؤ کی کانفرنس ہندوستان میں اقلیتوں کے مسئلہ کو سمجھنے میں ناکام رہی اور ان کے مفادات کے تحفظ سے گریز کیا ..... ہم صاف طور پر بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے کوئی دستور قابل قبول نہ ہو گا جب تک ان کے مفادات کا مناسب تحفظ نہ ہو جائے۔[۴۹]
سر ابراہیم رحمت اللہ نے کہا کہ "جس طرح کہ سائمن کمیشن نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں اتحاد پیدا کیا اسی طرح نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال میں اتحاد پیدا کر دیا۔[۵۰] حکیم اجمل خان نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان مخلوط انتخابات کے لئے تیار نہیں[۵۱] نہرو رپورٹ نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی عطاء کیا ہے ظاہر ہے کہ مسلمان عورتیں پردے کے باہر نہیں آسکتیں ایسی صورت میں صرف ہندو عورتیں رائے دے سکیں گی چنانچہ اس طرح ہندو عورت مرد کے ووٹ اور بڑھ جائیں گے۔[۵۲] مدراس کی

---

[۴۸] رپورٹ کل ہند مسلم کانفرنس مرتب کردہ حفیظ الرحمن صفحہ ؛
[۴۹] " " " " " " "
[۵۰] " " " " " " ۲
[۵۱] " " " " " " ۱۱
[۵۲] " " " " " " "

کانگریس نے مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی (۳۳) فیصد نیابت کو قبول کیا لیکن نہرو رپورٹ نے (۲۵) فی صد کر دیا۔ مسلمان (۲۵) فی صد سے اپنے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے۔[۵۲] حکیم صاحب نے کہا کہ نہرو رپورٹ پر اگر عمل کیا گیا تو مسلمان اپنی موجودہ حالت سے بھی گر جائیں گے۔[۵۳] نہرو رپورٹ نے اردو کے تحفظ کے لئے کوئی سفارش نہیں پیش کی مسلمانوں کے تمدن سے انکار کیا گیا۔[۵۴] سندھ کی علیحدگی میں اتنے شرائط رکھے گئے ہیں کہ علیحدگی ناممکن بنا دی گئی ہے۔[۵۵] مسلم خواتین نے اپنے ایک پیام بنام مسلم کانفرنس نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی۔[۵۶] مسلمانوں نے اس لئے بھی نہرو رپورٹ سے اختلاف کیا کہ اس میں بجائے وفاقی دستور کے وحدانی دستور کی تائید کی گئی۔[۵۷]

اس زمانے میں مسلمانوں کے جو مطالبات تھے ان کا اندازہ مسٹر جناح کے (۱۴) نکات اور کل ہند مسلم کانفرنس کی قرار دادوں سے ہو سکتا ہے مسٹر جناح کے چودہ نکات یہ تھے جو مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع ہوئے۔[۵۸]

---

۵۲ رپورٹ کل ہند مسلم کانفرنس صفحہ ۱۲
۵۳ " " " " " ۱۳
۵۴ " " " " " ۱۲
۵۵ " " " " " ۱۲
۵۶ " " " " " ۲۹
۵۷ " اجیلکر تقسیم ہند " ۲۸۱
۵۸ " " " " ۲۳۵

۱۔ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی ہو اور صوبوں کو ما بقی اختیارات حاصل ہوں۔

۲۔ جملہ صوبوں کو مساوی حکومت خود اختیاری عطا ہو۔

۳۔ ملک کی جملہ مجالس مقننہ اور انتخابی جماعتوں میں اقلیتوں کی مناسب اور موثر نیابت ہو۔ کسی صوبے کی اکثریت کو نہ اقلیت کر دیا جائے اور نہ دوسرے فرقوں کے مساوی

۴۔ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت (⅓) سے کم نہ ہو

۵۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب برقرار رہیں تاوقتیکہ کوئی جماعت خود اپنی مرضی سے اس کو ترک نہ کر دے۔

۶۔ ایسی سرحدی تبدیلی جس سے مسلمانوں کے اکثریت والے صوبے پنجاب صوبہ سرحد و بنگال متاثر ہوتے ہوں عمل میں نہ لائی جائے۔

۷۔ ہر فرقہ کو آزادئ مذہب۔ عقیدہ۔ عبادت۔ پروپگنڈہ اور حق اجتماع عطا کیا جائے۔

۸۔ اگر کسی اقلیت کے (¾) اراکین کسی ایسے قانون کو جس سے ان کا فرقہ متاثر ہوتا ہو مخالفت کریں تو اس کو منظور نہ کیا جائے۔

۹۔ سندھ کو صوبہ بمبئی سے علٰحدہ کر دیا جائے۔

۱۰۔ بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ ملازمتوں اور خود اختیاری جماعتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا

تحفظ دستور کے ذریعہ کیا جائے۔

۱۲۔ دستور میں مذہب اسلام۔ تمدن۔ شخصی قانون مسلمانوں کی تعلیم۔ زبان۔ ان کے خیراتی ادارات اور حکومتی امداد کا تحفظ ہو۔

۱۳۔ مرکزی یا صوبہ جاتی کابینہ میں (۱/۳) مسلم اراکین سے کم نہ ہوں۔

۱۴۔ مرکزی مجلس مقننہ کے ذریعہ بغیر ان ریاستوں کی رائے کے جو وفاق میں شریک ہیں دستور میں تبدیلی نہ کی جائے۔

۱۵۔ اس وقت مجالس مقننات اور انتخابی اداروں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقۂ انتخاب ضروری ہے۔ ان کی رضامندی کے بغیر اس کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

کل ہند مسلم کانفرنس نے بھی یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو کم و بیش یہی قرار دادیں منظور کیں: لـه

۱۔ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے ایک وفاقی حکومت جس میں مکمل حکومت خود اختیاری ہو اور باقی اختیارات صوبوں کو حاصل رہیں مرکزی حکومت کو مشترکہ امور تفویض کئے جائیں جو دستور عطا کرے گا۔

۲۔ فرقہ وارانہ معاملات کی نسبت کوئی مسودہ۔ قرار داد۔ تحریک یا ترمیم صوبہ واری یا مرکزی مجلس مقننہ میں منظور نہ ہوگی تاکہ

لـه رپورٹ کل ہند کانفرنس صفحات ۲۰ تا ۲۲

ہندوؤں یا مسلمانوں کی (۳/۴) اکثریت جس کو کہ یہ متاثر کرتی ہے منظور نہ کردے۔

۳۔ ہندوستانی مجالس مقننہ کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا طریقہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ بغیر مسلمانوں کی رضامندی کے اس حق سے ان کو محروم نہیں کیا جا سکتا

۴۔ جب تک کہ ہندوستان کے موجودہ حالات برقرار ہیں اور رہیں گے مسلمانوں کے لئے مجالس مقننہ اور آئینی خود اختیاری جماعتوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ضروری ہے تاکہ حقیقی نیابتی جمہوری حکومت کا وجود عمل میں آئے۔

۵۔ جب تک کہ مسلمانوں کو اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور کے ذریعہ ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہیں ہو رہا ہے اس وقت تک مسلمان مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے رضامند نہیں ہوں گے

۶۔ مرکزی یا صوبہ واری کابینہ میں مسلمانوں کا مناسب حصہ ہو

۷۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود اختیاری ادارات میں مسلم اکثریت متاثر نہ ہو اور جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی نیابت مروجہ قانون سے کم نہ کی جائے۔

۸۔ ہندوستان کے صوبوں کی نمائندہ مسلم اجتماعات نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر یہ اتفاق آرا یہ طے کیا کہ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت (۳۳) فی صد ہو

اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کو بالکلیہ منظور کرتی ہے۔

۹۔ انتظامی اور جغرافیائی اعتبار سے صوبہ سندھ کی پریسیڈنسی بمبئی سے کوئی مناسبت نہیں۔ اس کو علیحدہ صوبہ بنانا چاہیئے جس میں اپنی علاحدہ مجلس مقننہ اور انتظامی مشنری بالکل اسی اساس پر ہو جو دوسرے صوبوں میں ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کو جو اقلیت میں رہ جاتے ہیں آبادی کے تناسب سے بڑھ کر مناسب اور موثر نیابت عطاء کی جائے۔ جیسا کہ مسلمانوں کو اقلیت والے صوبوں میں حاصل ہے۔

۱۰۔ شمال مغربی صوبے اور بلوچستان میں دیگر صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات مروج کرنا نہ صرف ان صوبوں کے عوام کے مفاد کے لئے ضروری بلکہ کل ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ ان صوبوں میں ہندو اقلیت جو آبادی سے بڑھ کر مناسب اور موثر نیابت عطا کی جائے جیسا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو حاصل ہے

۱۱۔ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور آئینی خود اختیاری کے ادارات میں مناسب گنجائش رکھی جائے۔

۱۲۔ ہندوستانی دستور میں مسلمانوں کی تعلیم زبان۔ مذہب شخصی قانون اور مسلم خیراتی اداروں کی ترقی اور تحفظ کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۳۔ ہندوستان کے دستور میں اس وقت تک تبدیلی نہ ہو جب تک کہ

وفاق کے جملہ اجزاء اس سے اتفاق نہ کرلیں۔

۱۴۔ یہ کانفرنس پر زور اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کوئی دستور قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ ان قراردادوں کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

فرقہ وارانہ مسائل در قانون حکومت ہند

۱۹۳۵ء

فرقہ وارانہ مسئلہ کی بابتہ سائمن کمیشن کی سفارشات

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی ہندوستان میں عام مخالفت کی گئی۔ صرف اعتدال پسند قائدین نے ان اصلاحات کی تائید کی لیکن آخرکار اعتدال پسند لیڈرین بھی اصلاحات سے مایوس ہو چکے تھے۔ سوراج پارٹی نے بنگال اور صوبہ متوسط میں نظام دوعملی کو ناکام کر دیا سوراج پارٹی نے مروجہ دستور پر نظرثانی کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ حکومت نے ۱۹۲۳ء کو سر الگزنڈر مڈیمن کی صدارت میں ایک کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ نافذ شدہ اصلاحات کی چھان بین کر کے رپورٹ پیش کی جائے۔ اس کمیٹی کے چھ اراکین میں وہ ہندوستانی تھے ہندوستانی اراکین نے مڈی مین کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کیا۔ جب لارڈ

ریڈنگ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان آئے تو بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں یہ درج تھا کہ قانون کے نفاذ کے دس سال بعد سرکاری طور سے تحقیقات کروائی جائیں گی چنانچہ تحقیقات کی غرض سے ہندوستان ایک کمیشن بصدارت سر جان سائمن آیا۔ اس کمیشن کے سات اراکین تھے جس میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ جس کی وجہ سے سائمن کمیشن کا عام مقاطعہ کیا گیا اور تقریباً ہر جگہ مخالفت کی گئی۔ اس کمیشن نے جہاں دستوری مسائل پر نکتہ چینی کی اور اپنے سفارشات پیش کیں وہاں فرقہ وارانہ مسائل اور فرقہ وارانہ نیابت کی نسبت بھی اظہار خیال کیا[1]۔ کمیشن نے یہ سفارشات پیش کیں

کسی صوبہ داری حکومت نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی مخالفت میں تجاویز نہیں پیش کی ہیں باوجود اس کے کہ اس اصول کی نظری اعتبار سے برابر مخالفت کی گئی ہے حکومت بمبئی نے بتایا کہ اس کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے اختلاف ہے اگر دونوں جماعتیں اپنی رضامندی سے اس کو ترک کر دیں تو اس اصول کو منسوخ کیا جا سکتا ہے بعض لوگ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب مع مخصوص نشستوں کے اصول پر زور دیتے ہیں۔ پنجاب میں ہندو وزرا نے فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کی سخت مخالفت کی۔ حکومت بنگال کی یہ تجویز ہے کہ مسلمانوں کی نیابت ان کے تناسب کے مطابق ہو۔ اکثر صوبہ داری کمیٹیوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی تائید کی۔ البتہ یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ اگر

---

[1] رپورٹ سیمن کمیشن جلد دوم پیراگراف ۸۰ تا ۹۰

مسلمان رضامند ہو جائیں تو ان کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کمیٹی نے ہندو اور سکھ اقلیت کو "پاسنگ"[1] دیا لیکن اس حد تک کہ مسلم اکثریت میں تبدیل نہ ہو جائے۔ بنگال کمیٹی نے نشستوں کے تعین میں آبادی کے تناسب پر زور دیا۔ بہار اور اڑیسہ کمیٹی نے جداگانہ نیابت کو تسلیم کرتے ہوئے تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستوں کے تعین کی سفارش کی اس کے علاوہ عام حلقہ ہائے انتخاب میں بھی مسلمانوں کو رائے دہی کی سفارش کی۔

مرکزی کمیٹی کے اراکین نے نہرو رپورٹ سے اتفاق کیا۔[2] انھوں نے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب اور مسلمانوں کے لئے تحفظ نشست کے اصول کی تائید کی مسلمانوں کو عام حلقہ ہائے انتخاب میں رائے دینے کی اجازت ہوگی۔ اسی اصول کا اطلاق ہندو اور سکھ اقلیتی صوبوں پر بھی ہوگا۔ مرکزی کمیٹی نے سفارش کی کہ بنگال میں بلا تحفظ نشست مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہوں۔ مرکزی کمیٹی کے دو اراکین نے ان سفارشات سے اختلاف کیا اور کل ہند مسلم کانفرنس کے مطالبات کی تائید کی۔ جملہ مسلم جماعتوں کا مطالبہ ہے کہ جداگانہ نیابت برقرار رکھی جائے اور تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ سب کل ہند مسلم کانفرنس کی سفارشات کی تائید کرتے ہیں۔ اعتدال پسند ہندو اراکین جو صوبہ واری کمیٹیوں میں تھے انھوں نے مسلمانوں کے حق جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو تسلیم کیا لیکن اکثر ہندوؤں کی

---

[1] ویٹج

[2] رپورٹ سمن کمیٹی جلد دوم پیراگراف ۷۰

اس اصول سے اختلاف ہے ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کمیشن نے سفارش کی کہ مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ نیابت برقرار رہے تاوقتیکہ وہ خود اپنی خوشی سے اس کو ترک کرنے پر رضامند نہو جائیں۔ اگرچہ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب معہ مخصوص نشستوں کے اصول سے بھی یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے لیکن مسلمان اس کے لئے تیار نہیں! ان کا اعتراض یہ ہے کہ مخلوط انتخاب سے ہندو ایسے مسلمانوں کا انتخاب کریں گے جو ہندو پرست ہوں۔ اگرچہ مخلوط انتخاب سے فرقہ داری کشیدگی دور ہوسکتی ہے لیکن مسلمان اس اصول کو پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی حالات کے لحاظ سے نیابت متناسبہ کا طریقہ مناسب نہیں کمیشن نے کہا کہ صرف عدم مفاہمت کی وجہ سے جداگانہ نیابت کی تائید کی جاتی ہے
سکھوں کی نیابت۔[عہ] سکھ بھی جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرتے ہیں جداگانہ نیابت برقرار رہنے کی صورت میں سکھوں کو پاسنگ دینا ہوگا اس لئے کہ سکھ ایک ہی صوبے میں زیادہ ہیں اگر ان کو پاسنگ نہیں دیا گیا تو وہ مرکز میں بے اثر ہوکر رہ جائیں گے۔ اس وقت سکھوں کو جو نشستیں حاصل ہیں وہ مناسب معلوم ہوتی ہیں۔
پست اقوام کی نیابت[شہ]۔ پست اقوام کے لئے اب تک نامزدگی کا طریقہ رائج رہا ہے۔ صوبہ متوسط میں چار اراکین بمبئی میں دو صوبہ متحدہ اور بہار اور اڑیسہ میں ایک ایک۔ بنگال میں ایک بنگال اور آسام کی مجلس

عہ رپورٹ سیمن کمیٹی پیراگراف ۹۰
شہ ،، ،، جلد دوم پیراگراف ۹۷ تا ۱۰۰

حقیقت میں پست اقوام کا کوئی رکن بھی نہیں ہے۔ مدراس میں ذیل اراکین نامزد ہوتے ہیں۔ غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب میں پست اقوام کے افراد کو حق رائے دہی حاصل ہے۔ لیکن ان کی اقتصادی اور تعلیمی پستی کی وجہ سے وہ بہت کم شرائط رائے دہندگی پر اترتے ہیں۔ مدراس میں پست اقوام آبادی کا ۱۵ فیصد ہیں۔ اگر شرائط رائے دہندگی کے معیار کو گھٹا بھی دیا جائے تو پست اقوام کی مناسب نیابت نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ ان کے لئے خاص انتظام نہ کیا جائے۔ اگر نامزدگی کا طریقہ برقرار رکھا جائے تو ان کی سیاسی تربیت نہیں ہو سکتی۔ کمیشن نے سفارش کی کہ ان کے لئے رائے دہی میں اضافہ ہونا چاہیے پست اقوام کی انجمنوں نے آبادی کے تناسب سے جداگانہ حلقہ انتخاب کا مطالبہ کیا اگرچہ بعض نامزدگی کی بھی تائید کرتے ہیں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اچھا ضرور ہے لیکن اس اصول سے ہندوؤں اور پست اقوام میں اختلافات برقرار رہیں گے ہندوؤں کی سیاسی ترقی میں یہ یقیناً روڑا ہوگا۔ جب جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ختم کرنا مقصود ہو تو نئی جماعتوں کے لئے اس کی توسیع کرنا مناسب نہیں خصوصاً اس وقت جبکہ بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہو۔ کمیشن نے سفارش کی کہ غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب میں پست اقوام کے لئے نشستیں محفوظ کردی جائیں۔ چونکہ ان کی تعلیمی حالت گری ہوئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی جماعت سے کوئی موزوں شخص نہ مل سکے۔ ایسی صورت میں گورنر کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ دوسری جماعت سے ایسے شخص کو نامزد کرے جو ان کی فلاح سے دلچسپی رکھتا ہو۔ چند سال بعد جبکہ پست اقوام میں تعلیم پھیل جائے گی اس کی ضرورت برقرار نہ رہے گی۔ بجائے جداگانہ حلقہ ہائے

انتخاب کے ان کے لئے نشستیں محفوظ کر دی جائیں تعلیمی ترقی کے بعد یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

یوروپینس کی نیابت[۱] - ان کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو برقرار رکھا جائے چونکہ اس فرقے کی تعلیمی حالت اچھی ہے اور ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹاتا ہے اس کو آبادی سے زیادہ نشستیں دی جا سکتی ہیں۔

اینگلو انڈینس کی نیابت[۲] - ان کے لئے نامزدگی کے بجائے انتخابات ہوں لیکن جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کئے جائیں اس لئے کہ وہ تعداد میں بہت کم ہیں نشستوں کے تعین میں ان کی تعداد یا سیاسی اثرات کا لحاظ نہ ہو بلکہ ان کو یہ موقع دیا جانا چاہئے کہ وہ مجالس مقننہ میں اپنے مفادات کا آپ تحفظ کر سکیں۔

ہندوستانی عیسائیوں کی نیابت[۳] - اس وقت ان کو مدراس میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب حاصل ہے لیکن دوسرے صوبوں میں ان کی نیابت نامزدگی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ہندوستانی عیسائیوں کے وفد کو عام حلقہ ہائے انتخاب سے اتفاق ہے لیکن مدراس کے ہندوستانی عیسائی جداگانہ نیابت پر زور دیتے ہیں۔ مدراس میں اس وقت ان کی نیابت مناسب ہے لیکن دوسرے صوبوں میں ان کی نیابت دوگنی کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں کی نشستوں کا تعین[۴] - میثاق لکھنؤ کے ذریعہ جو ہندو مسلم

---

[۱] رپورٹ سائمن کمیشن جلد دوم پیراگراف ۸۱

[۲] ,, ,, ,, ,, ۸۳

[۳] ,, ,, ,, ,, ۸۴

[۴] ,, ,, ,, ,, ۸۵

نشستوں کا تعین کیا گیا اب اس کو تائید حاصل نہیں۔ مسلمانوں کی کمزوری اور پستی کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو جو پاسنگ حاصل ہے برقرار رکھا جائے۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نیابت ان آبادی کے تناسب سے نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ان صوبوں کے ہندو اور سکھ پاسنگ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ آبادی کے تناسب پر بنگال اور پنجاب میں اس وقت نیابت ممکن ہے جبکہ ان دو صوبوں میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم ہو جائیں۔

کامرس اور پلانٹرس کی نیابت[۱۰] کامرس اور پلانٹرس کی نیابت ان کے تناسب سے ہونی چاہئے۔

لیبر کی نیابت[۱۱] ہندوستان کے مزدوروں میں نہ شعور ہے اور نہ باقاعدہ تنظیم۔ مزدوروں کے حقیقی نمائندے مشکل سے ملتے ہیں۔ اگر مزدوروں کے نمائندے مل جائیں تو ان کی نیابت وسیع کی جا سکتی ہے مختلف صوبوں کے گورنر مقامی حالات دیکھ کر ان کی نیابت پر غور کریں۔

بڑے زمینداروں کے لیئے خاص نیابت[۱۲] زمیندار ہندوستان کے اچھے اور با اثر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ان کی مناسب نیابت ہو

عورتوں کی نیابت[۱۳] صوبہ داری مجالس مقننہ میں ان کی نیابت ہو

۱۰ رپورٹ سیمن کمیشن جلد دوم پیراگراف ۸۸

۱۱ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۸۹

۱۲ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۹۰

۱۳ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۹۱

مرکزی مجلس مقننہ[۱۴۱]۔ فیڈرل اسمبلی کے لئے صوبوں سے تناسب کے اصول پر اراکین منتخب ہوں تو بہتر ہے۔ اس کے ذریعہ ایک تو اقلیتوں کا تحفظ ہو جائے گا دوسرے فرقہ وارانہ نیابت سے نجات حاصل ہو جائیگی فیڈرل اسمبلی میں ہر فرقے کی نیابت ہو سکتی ہے فیڈرل اسمبلی میں مختلف فرقوں کی نیابت کا تناسب حسب ذیل ہو۔ پست اقوام ۸ فی صد سکھ دو فی صد مسلمان ۲۸ فی صد یورو پینیں دس فی صد۔ ہندوستانی عیسائی اور بینگلو انڈینس تقریبًا ایک فی صد اور غیر مسلمان (باستثنائے پست اقوام) ۵۰ فی صد۔ اس وقت کونسل آف اسٹیٹ میں ۶۰ اراکین ہیں جس میں سے ۳۳ منتخب کردہ اور بقیہ نامزد کردہ منجانب گورنر جنرل۔ اس تناسب کو برقرار رکھا جائے۔

اقلیتوں کے لئے تحفظ[۱۴۲]۔ موجودہ دستور کی طرح کوئی ایسا مسودہ جس سے کسی مذہب .... مذہبی رسوم یا برطانوی ہند کی کسی جماعت کو متاثر کرتا ہو بغیر گورنر جنرل کی اجازت پیش نہ ہو۔ اکثر جماعتوں اور اقلیتوں نے کمیشن سے مل کر کہا کہ مرکزی یا صوبہ واری مجالس مقننہ میں کوئی ایسا قانون منظور ہونے نہ پائے جس سے وہ متاثر ہوں۔ گورنر جنرل اور گورنروں کو جو "شاہی ہدایت نامہ" دیا جاتا ہے تاکہ ایسے قوانین جس سے کوئی اقلیت فرقہ یا جماعت متاثر ہوتی ہو پیش ہونے سے

---

[۱۴۰] رپورٹ سیمن کمشن جلد دوم پیراگراف ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۴۹، ۱۵۰،
[۱۴۱] " " " " " ۱۵۲، ۱۵۷، ۱۸۰،
[۱۴۲] " " " "

رکاوٹیں ہٹ جائیں اس کو برقرار رکھا جائے۔

گول میز کانفرنس اور اقلیتوں کے مسائل

ہندوستانی جماعتیں ایک ایسا دستور بنانے میں ناکام ہوگئیں جو ہر ایک فرقے و طبقے کے لئے قابل قبول ہو۔ نہرو رپورٹ کو ہندوؤں نے تو تسلیم کیا لیکن مسلمانوں نے عام طور پر اس کی سخت مخالفت کی۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کو سائمن کمیشن کی سفارشات قابل قبول نہ تھیں۔ حکومت برطانیہ نے محسوس کیا کہ سائمن کمیشن کی سفارشات پر ہندوستان کے لئے کوئی دستور مدوّن نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے اور ان تینوں اجلاس میں ہندوستانی نمائندے آپس میں کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ نہرو رپورٹ کی سفارشات کے بعد جو اختلافات پیدا ہوئے اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس میں فرقہ داری مسائل حل نہ ہوسکے حتیٰ کہ حکومت برطانیہ نے اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھ میں لیا۔

پہلا اجلاس۔ گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ اس اجلاس میں کانگریس شریک نہ ہوسکی اس لئے کہ حکومت اور کانگریس کے تعلقات اس زمانے میں کشیدہ تھے۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک منظور کی جس کے بعد ملک میں بدامنی پیدا ہوئی۔ گاندھی جی اور اکثر کانگریس کے اراکین گرفتار کر لئے گئے تھے۔ لیکن پہلے اجلاس میں سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری کی شرکت سے

کانگریس کی با لواسطہ نیابت ہو گئی۔[۱] ان دونوں نے انگلستان جانے سے قبل کانگریسی اراکین سے مشورہ کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے آغا خان، سر محمد شفیع۔ سر محمد علی۔ مسٹر فضل حق اور مسٹر جناح نمائندگی کر رہے تھے سکھوں کی جانب سے سردار سمپورن سنگھ۔ مہا سبھا سے ڈاکٹر مونجے پست اقوام سے ڈاکٹر امبیڈکر۔ ہندوستانی عیسائیوں سے مسٹر کے ٹی پال اور اینگلو انڈینس کی نیابت لفٹننٹ کرنل گڈنی کر رہے تھے۔ کانفرنس میں زیادہ تر مباحثہ وفاق سے متعلق تھا لیکن فرقہ وارانہ مسائل بھی زیر بحث رہے۔ اس اجلاس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ گورنر جنرل اور گورنروں کے ذمہ رہے۔ ان کو اس خصوص میں خاص اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ گڈنی۔ پال۔ شفیع سمپورن سنگھ وغیرہ سب نے اپنے اپنے فرقے کے لئے جداگانہ نیابت اور ملازمتوں میں حصے کے تعین کا مطالبہ کیا۔ اس اجلاس میں قلمرو ی درجے کے اصول اور مرکز میں ذمہ دارانہ حکومت کی نسبت سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جناح و مسٹر شفیع میں اتفاق رائے ہو گیا لیکن مسئلہ کا فرقہ وارانہ رخ نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مولانا محمد علی نے وفاقی ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ انھوں نے کہا کہ خوش قسمتی سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بحث و مباحثے کے بعد مختلف فرقوں نے فرقہ وارانہ نیابت اور نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ اقلیتوں کو جو نشستیں حاصل ہوں گی وہ کسی طرح

---

[۱] کرشنا۔ مسئلہ اقلیت صفحہ ۲۰۰

ان کی آبادی سے کم نہوں ۔ نامزدگی کے اصول کی عام مخالفت کی گئی ۔ مخلوط انتخابات اور مقررہ نشستوں کے متعلق بھی بحث ہوئی لیکن اس کو عام تائید حاصل نہ ہو سکی ۔ بالعموم جداگانہ نیابت کی تائید کی گئی ۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اقلیتوں کی جو ذیلی کمیٹی ترتیب دی گئی تھی اس کے (۳۹) اراکین تھے جن میں سے (۳۳) ہندوستانی تھے ۔ وزیر اعظم برطانیہ اس کمیٹی کے صدر نشین تھے ۔ اس کمیٹی نے یہ اصول تسلیم کیا کہ جدید دستور میں اقلیتوں کا مناسب تحفظ کیا جائے گا ۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ اعلیٰ ملازمتوں میں مختلف فرقوں کے مطالبات تسلیم کئے جائیں گے ۔ پست اقوام کی جانب سے ڈاکٹر امیڈکر نے کہا کہ انتخابات میں ان کا شمار بحیثیت ایک علحدہ فرقے کے کیا جائے اور ہندوؤں میں ان کو شمار نہ کیا جائے انھوں نے کہا کہ پست اقوام کے جب تک مطالبات قبول نہیں کئے جائیں گے کوئی دستور ان کے لئے قابل قبول نہ ہوگا ۔ مسلمان اراکین میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے کہا کہ ہم اپنے برادران وطن کا ہر طریقے سے ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق اور مطالبات کا تحفظ ہو جانا چاہئے ۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑے کی نسبت غلط فہمی نہ ہو ۔ ان کی بنیاد ایک دوسرے کی حکومت کے خلاف خوف ہے ۔ مسلمانوں کے وفد نے اعلان کیا کہ صوبوں اور مرکز میں جب تک مسلمانوں کے مطالبات کا تحفظ نہ ہو جائے کوئی دستور ان کے لئے قابل قبول نہ ہوگا ۔ سر سپرو نے کہا کہ ہندوستان میں کوئی دستور بغیر اقلیتوں کو تسکین پہنچائے چل نہیں سکتا ۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں

فرقہ وارانہ مسائل طے ہو سکے۔

دوسرا اجلاس۔ گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں کانگریس شریک نہ رہی حکومت نے محسوس کیا کہ بغیر کانگریس کی تائید کے ہندوستان میں کوئی دستور نہیں چل سکتا۔ وائسرائے ہند لارڈ ارون نے گاندھی جی سے گفت و شنید کے بعد ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ سیول نافرمانی کی تحریک بند کر دی جائے گی۔ کانگریس گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہو گی اور پہلے اجلاس میں جو مسائل طے ہوئے ان پر نظر ثانی کی جائے گی۔ کانگریس کی جانب سے مسٹر گاندھی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہوئے۔ دوسرے اجلاس کو روانہ ہونے سے قبل سر علی امام کی صدارت میں بمقام لکھنؤ مسلم قوم پرست کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں کہ[۱] حقوق کے ذریعہ تمدن۔ زبان۔ رسم الخط۔ تعلیم مذہبی آزادی وغیرہ کی آزادی ہو۔ وفاقی دستور میں باقی اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔ سندھ کو ایک علحدہ صوبہ بنایا جائے صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات عطا کئے جائیں۔ ملازمتوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔

گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ کانگریس جملہ فرقوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس ملک کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے

۱؎ بحوالہ سیاست ملیہ صفحات ۲۰۰ تا ۲۰۱

ہندوستان کے دوسرے مندوبین کو ہندوستان عوام کی تائید حاصل نہیں اس لئے کہ وہ حکومت کے نامزد کردہ ہیں۔ اقلیتوں نے کانگریس کے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کے جملہ فرقوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ نشستوں کے تعین میں اقلیتوں نے کانگریس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ عبوری دور کے لئے مرکز میں دو عملی کا نظام حکومت برقرار رکھا جائے لیکن گاندھی جی کو اس سے اختلاف تھا اور انھوں نے مرکز میں فوری ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا اگرچہ ہندوستانی نمائندے کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے لیکن گاندھی جی نے کہا کہ بغیر فرقہ وارانہ حل کے دستور کی تدوین ہو سکتی ہے اور اس مسئلہ کو بعد میں بھی طے کیا جا سکتا ہے لیکن اقلیتوں کے نمائندوں نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے لئے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل اسکیم منظور کی۔[۹۷] دستور میں "بنیادی حقوق" کے تحت ہر فرقہ کو تمدن۔ زبان۔ رسم الخط۔ تعلیم مذہبی اوقاف اور مذہبی رسوم کی آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔ قانون شخصی کا تحفظ ہوگا۔ جو فرقہ مختلف صوبوں میں اقلیت میں ہیں ان کے حقوق کا تحفظ وفاقی حکومت کرے گی۔ حق رائے دہی بالغ مرد و عورت کے لئے وسیع کر دی جائے گی۔ مشترک حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے جائیں گے۔ سندھ کے ہندو آسام کے مسلمان پنجاب اور صوبہ

---

۹۷ رپورٹ گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء سپلیمنٹ بحوالہ گیلانی تحقیق ماہیت وفاق و مسائل اقلیت جلد سوم صفحات ۱۳۹۱ تا ۱۳۹۲

سرحد کے سکھ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے وفاقی اور صوبجاتی مجالس مقننہ میں آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی جہاں کہ وہ (۲۵) فی صدی سے کم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو مقابلے کے ذریعہ زائد نشستیں حاصل کرنے کا بھی اختیار ہوگا۔ غیر جماعتی پبلک سروسیس کمیشن تقررات کرے گا اور کم از کم قابلیت کا معیار مقرر کرے گا اور ملک کے پبلک سرویس میں مختلف فرقوں کی مناسب نمائندگی پر غور کرے گا۔ وفاقی اور صوبہ داری کابینہ کی تشکیل میں اقلیتوں کو کنونشن کے ذریعہ تسلیم کیا جائے گا۔ صوبہ شمال مغربی سرحدی اور بلوچستان میں دیگر صوبجات کی طرح اصلاحات کی جائیں۔ اگر سندھ کے لوگ اپنے علیحدہ کئے ہوئے صوبے کی مالیاتی بار کو برداشت کرنے کو تیار رہیں تو اس کو علیحدہ صوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ ملک کا مستقبل کا دستور وفاقی ہو۔ مابقی اختیارات وفاقی اجزاء کو حاصل ہوں تاوقتیکہ بعد میں آزمائش پر یہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ کانگریس نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ مستقبل میں کسی ایسے دستور پر رضامند نہیں ہو سکتی جس سے اقلیتوں کو اختلاف ہو۔

ڈاکٹر مونجے نے ہندو مہا سبھا کی جانب سے پہلے اجلاس میں حسب ذیل یادداشت پیش کی[ٹ۱] ہندو مہا سبھا کی رائے میں فرقہ وارانہ نیابت قومیت کے خلاف اور ذمہ دارانہ حکومت کے منافی ہے۔ جداگانہ

[ٹ۱] رپورٹ گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء رپورٹ ہائے کمیٹی برائے تحقیق ماہیت دستور وفاقی و مسائل اقلیت جلد دوم [illegible]

فرقوں کے لئے مخلوط انتخابات ہوں۔ ہر صوبے میں جملہ فرقوں کے لئے مساوی اور یکساں شرائط رائے دہندگی ہوں۔ تعلیمی اور انتخابی اداروں میں فرقہ وارانہ نیابت نہ ہو۔ تحفظ نشست کا مطالبہ صرف ایک قلیل مدت کے لئے پورا کیا جائے۔ کسی صورت میں کسی صوبے میں فرقہ اکثریت کے لئے نشستوں کا تعین نہ کیا جائے۔ کسی فرقے کی اکثریت وجود میں لانے کے لئے صوبوں کی تقسیم عمل میں نہ آئے بلکہ صوبوں کی از سر نو تقسیم میں انتظامی اور مالیاتی پہلو مضمر ہوں۔ صوبوں کی از سر نو تقسیم میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی رضامندی شامل حال ہونی چاہئے۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے۔ اس سے ملک کے حب الوطنی کے جذبے کو دھکا لگے گا۔ سندھ کی علیحدگی پر ہندو رضامند نہیں۔ اس تقسیم سے مالیاتی مشکلات پیدا ہوں گے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دی جا سکتی ہیں لیکن یہ عمل بتدریج ہو۔ ملازمتوں میں فرقہ واریت کا تعین نہ ہو بلکہ قابلیت اور اہلیت دیکھی جائے اور مقابلہ کا اصول رکھا جائے۔ مسلمانوں کے اس مطالبے سے کہ صوبہ واری یا مرکزی کابینہ بغیر مسلمانوں کے خاص تناسب کے تشکیل نہ دی جائے اس پر مہا سبھا کو اعتراض ہے۔ اس لئے کہ اس سے کابینہ کی مشترک ذمہ داری قائم نہیں ہو سکتی وزیر اعظم کو آزادی ہونی چاہئے کہ وہ جس فرقے سے چاہئے وزراء کا انتخاب کرے۔ مہا سبھا مستحکم مرکزی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اس لئے صوبوں کو باقی اختیارات دینے پر اعتراض ہے۔ کامل مذہبی آزادی اور شہری آزادی عطا ہونی چاہئیں مگر یہ آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ اگر مسلمان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر

مصر رہیں تو بادلِ ناخواستہ انکا یہ مطالبہ پورا کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں مسلمان میثاق لکھنؤ کے پابند ہوں گے مہا سبھا ہندوستان کے ٹکڑے پارچے کرنا پسند نہیں کرتی۔ ہر اقلیت اور فرقے کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کو مجلس اقوام جیسی جماعت کے سامنے بغرض حل پیش کرنا چاہیئے۔ اگر اقلیتوں کی آزاد اکائیوں پر زور دیا جائے تو مملکت میں انتشاری عناصر پیدا ہوں گے۔

پست اقوام کی جانب سے ایک یادداشت ڈاکٹر امبیڈکر راؤ بہادر اور آر سرینواس نے پیش کی[۱] بنگال صوبہ متوسط۔ آسام۔ بہار اور اڑیسہ۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں پست اقوام کو ان کی آبادی کے تناسب پر نیابت کا مطالبہ کیا گیا۔ مدراس میں (۲۲) فی صد نیابت طلب کی گئی۔ سندھ کے صوبہ بمبئی میں شامل رہنے پر پست اقوام کی (۱۶) فی صد نیابت کا مطالبہ کیا گیا۔ اگر سندھ علیحدہ کر دیا جائے تو صوبہ بمبئی میں ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کی بنا پر ہو۔ مرکزی مجلس مقننہ میں ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونی چاہیئے پست اقوام کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کرنے کی اجازت ہو۔ بغیر ان کی رضامندی کے ان کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب میں شامل نہ کیا جائے۔ پست اقوام کے لئے نامزدگی کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کے بجائے اُن کو انتخاب کا حق ہو۔ آئندہ پست اقوام کے لئے اصطلاح نان کاسٹ ہندو یا پراٹسٹنٹ ہندو یا کوئی

---

[۱] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۱

دوسری اصطلاح استعمال کی جائے۔

ہندوستانی عیسائیوں کی جانب سے مسٹر سلوام نے یادداشت پیش کی۔[۲۲] اس یادداشت میں عام شہری اور مذہبی حقوق کے مطالبے کے ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا کہ عیسائیوں کا علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب ہونا چاہیے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب یا مخصوص نشستوں کے ذریعہ ان کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔

اینگلو انڈینس اور مستقل مقیم یورپینس فرقے کی جانب سے سر ہنری گڈنی نے یادداشت پیش کی[۲۳] جیثیت فرقے کے ان کے سیاسی حقوق تسلیم کئے جائیں اور مرکزی اور صوبہ واری مجالس مقننہ میں ان کی مناسب نیابت ہو۔ ان کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ حکومت کی عاملہ اور دیگر عہدوں میں ان کی مناسب نیابت ہو۔ یوروپینس کی تعلیم کا خاص انتظام رہے اور اس وقت ان کو جو وظائف اور امداد حاصل ہے وہ برقرار رکھی جائے۔ جیوری کے مقدمات میں نسلی امتیازات ختم کردئے جائیں دوسرے فرقوں کی طرح انھیں بھی حقوق جیوری عطا کئے جائیں۔ اگر کوئی فرقہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ کرے تو اس کو منظور کر لیا جائے تاوقتیکہ اس فرقے کے (۵۰) فی صد اشخاص اس کو مسترد کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ صوبہ واری کمیشنوں اور حکومت ہند کے کمیشن میں اقلیتوں کا کم از کم ایک نمائندہ ہونا چاہیئے

۲۲۔ رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۲۱۲ تا ۱۲۱۳

۲۳۔ ،، ،، ،، ،، ،، ۱۲۱۳ تا ۱۲۱۵

حسب موقع گورنر جنرل یا گورنر نامزد کریں گے۔ پبلک سروس کمیشن کا یہ کام ہوگا کہ وہ دیکھے کہ مختلف فرقوں کی ملازمت میں مناسب شرکت ہو رہی ہے یا نہیں۔ وفاقی کابینہ میں ایک وزیر فرقۂ اقلیت کا بھی ہو صوبہ داری کابینہ میں ایک وزیر اور ڈوانڈر سکریٹری فرقۂ اقلیت سے لئے جائیں۔

مرہٹے اور دیگر ہندو "فرقوں" کی جانب سے بی۔ وی جادھیو نے یادداشت پیش کی[۲۴] مدراس میں غیر برہمنوں کے لئے نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ انھوں نے ہر وقت متعینہ نشستوں سے زیادہ ہی حاصل کیا ہے اور کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب کہ تعین نشست کی رعایت کام میں لائی گئی ہو۔ البتہ بمبئی میں مرہٹوں کی نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء کے انتخابات کے نتائج کی بناء پر شہر بمبئی میں ثابت ہوگیا کہ کوئی مرہٹے بغیر تعین نشست کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بمبئی کے دیگر اضلاع میں انتخابات کے سلسلہ میں مرہٹے امیدوار ناکام رہے مرہٹے ابھی منظم نہیں ہوئے ہیں لہذا ان کی نشستیں محفوظ کر دینا چاہیئے۔

پنجاب کا مسئلہ۔ سردار اُجل سنگھ اور سمپورن سنگھ نے سکھوں کے مطالبات کو پیش کیا۔[۲۵] یہ مطالبہ کیا گیا کہ پنجاب میں سکھ فرقے کی تاریخی۔ سیاسی اور معاشی اہمیت کی بناء پر ان کو صوبہ پنجاب میں (۳۰) فی صد نیابت عطا کی جائے۔ کہا گیا کہ یہ مطالبہ ناجائز بھی نہیں اس لئے کہ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی کہ سکھوں کی پنجاب میں اور مسلمانوں کو

---

[۲۴] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۲۱۵ تا ۱۲۱۶

[۲۵] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۱۳۹۹ تا ۱۴۰۰

صوبۂ متحدہ میں (۱۴) فی صد نیابت حاصل ہے۔ چونکہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو پاسنگ دیا گیا ہے۔ لہذا سکھوں کو بھی دیا جانا چاہیئے۔ اس یادداشت میں راولپنڈی اور ملتان کو جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے صوبہ سرحد سے ملحق کردینے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ بقیہ صوبہ پنجاب میں مختلف فرقوں کی آبادی میں توازن پیدا ہو جائے۔ پنجاب کی کابینہ اور پبلک سروس کمیشن میں سکھوں کی ۱/۳ حصہ نیابت ہو اگر پنجاب کی نسبت کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے تو اس صوبے پر مرکزی حکومت ہی کی نگرانی ہو تاوقتیکہ فرقہ وارانہ فیصلہ نہ ہو جائے۔ پنجابی زبان صوبے کی سرکاری زبان ہو۔ لیکن سکھ اور دوسرے فرقے گرمکھی رسم الخط استعمال کرنا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت ہو۔ مرکزی مجلس مقننہ کے دونوں ایوانوں میں سکھوں کی (۵) فیصد نیابت ہو۔ مرکزی کابینہ میں کم از کم ایک سکھ ہر وقت ضرور رہے۔ سکھوں کا فوج سے خاص تعلق رہا ہے چنانچہ جنگ سے قبل ان کا فوج میں جو تناسب تھا اس کو برقرار رکھا جائے کل ہند سروس میں سکھوں کی موثر نیابت ہو۔ باقی اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مرکزی حکومت کو خاص اختیارات حاصل ہوں گے۔ صوبہ واری اور مرکزی حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کا اعلان کردے۔ اس وقت جو مذہبی اوقاف ہیں ان کو برقرار رکھا جائے لیکن نئے اوقاف پیدا نہ کئے جائیں۔ اگر طالب علموں کی کافی تعداد ہو تو حکومت گرمکھی رسم الخط کی تعلیم کا انتظام کرے۔ دستور کے ذریعہ سکھوں کو جو تحفظ دیا جائے گا بغیر ان کے مشورے کے اس میں تبدیلی نہ ہو۔

راجہ نریندر ناتھ نے پنجاب کی ہندو اقلیت کے لئے یادداشت پیش کی۔[۲۶] انھوں نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے اختلاف کیا۔ صوبہ واری مجلس مقننہ اور وفاقی اسمبلی میں پنجاب کے ہندوؤں کی نیابت ان کی آبادی کے لحاظ سے ہو۔ تقررات کارکردگی کے بنا پر ہوں۔ پنجاب کے ہندوؤں کو یوروپینس۔ اینگلو انڈینس۔ عیسائی اور پست اقوام کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اعتراض نہیں۔ پنجاب میں مسئلہ اقلیت کے حل کے لئے سر جیفری کاربیٹ نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔[۲۷] سکھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب پر راضی ہوسکتے ہیں لیکن مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کرنے پر وہ اپنے فرقے کے لئے بھی اس کا مطالبہ کریں گے۔ ہندوؤں کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے اتفاق ہے لیکن ان کو فرقہ اکثریت کے لئے نشستوں کے تعین میں اختلاف ہے۔ پنجاب میں مختلف فرقے اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے مطالبات کی تکمیل مشکل سے ہوتی ہے۔ جب حل نہیں ہوسکتا تو صوبہ پنجاب کی سرحدوں میں تبدیلی کی جائے۔ اس تقسیم میں انتظامی۔ معاشی۔ جغرافی۔ تاریخی اور لسانی ضروریات کو ملحوظ رکھنا چاہئے چاہئے۔ انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے علحدہ کرکے صوبہ متحدہ میں شامل کردیا جائے۔ کاربیٹ نے تقسیم پنجاب کی جو اسکیم پیش کی اس کی رو سے مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور

---

[۲۶] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۲۰۲ تا ۱۲۰۳

[۲۷] " " " " " " ۱۲۳۱ تا ۱۲۳۶

وقت قانون رائج کی رو سے قابل سزا نہ تھا۔

۹۔ کوئی جسمانی سزا یا ایسی سزا جس میں سخت اذیت ہو قانوناً جائز نہ ہو گی۔

۱۰۔ ہر شہری کو گرفتاری کی صورت میں تحقیقات عدالتی کے مطالبے کا حق ہو گا۔ جنگ یا بغاوت کے زمانے میں مرکزی مجلس قانون ساز اپنے کسی قانون سے اس حق کو کچھ عرصے کے لئے روک سکتی ہے۔ یا اگر مجلس قانون ساز کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ایسا کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ جلد سے جلد مناسب کارروائی کے لئے اس کی اطلاع جماعت قانون ساز کو دے گا۔

۱۱۔ دولت مشترکہ ہند کا کوئی سرکاری مذہب نہ ہو گا۔ نہ دولت مشترکہ کے کسی صوبے کا اور نہ ریاست براہ راست یا بالواسطہ کسی مذہب کی مالی امداد کرے گی نہ مذہبی عقیدہ یا مذہبی حیثیت کی وجہ سے کسی شخص کو ترجیح دے گی نہ کسی کے استحقاق میں کمی کرے گی۔

۱۲۔ کوئی شخص جو ایسے کسی مدرسے میں تعلیم پاتا ہو جسے سرکاری مدد یا کسی عام فنڈ سے مدد ملتی ہو اس مذہبی درس میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جو اس مدرسہ میں دیا جاتا ہو۔

۱۳۔ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے ...... اعزاز پر متمکن ہونے اور کسی پیشہ یا کاروبار کرنے کے استحقاق میں کسی شخص کے

مذہب یا ذات کی وجہ سے کوئی کمی نہ ہوگی۔

۱۴۔ عام گزرگاہوں کنوؤں اور دوسری عام اجتماع کی جگہوں پر جانے اور انھیں استعمال کرنے کا حق ہر شہری کو برابر حاصل رہے گا۔

۱۵۔ مزدوروں کی حالت اور معاشی حالات کے برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے ہر شخص اور ہر پیشہ کے لوگوں کو ملنے اور انجمن بنانے کی آزادی ہوگی۔ تمام معاہدے اور کارروائیاں جن سے آزادی کے محدود ہونے یا رکھنے کا احتمال ہو خلاف قانون سمجھی جائیں گی۔

۱۶۔ خدمت کے معاہدے کو توڑنا یا اس کی ترغیب دینا فوجداری جرم نہ سمجھا جائے گا۔

۱۷۔ صحت کو قائم رکھنے تمام شہریوں کو کام کے لائق رکھنے ہر کام کرنے والے کے لئے قوت لایموت کی ضمانت کرنے ماؤں کی حفاظت۔ بچوں کی بہبود اور بڑھاپے۔ ضعیف و ناتوانی اور بیکاری کے معاشی نتائج سے مامون کرنے کے لئے پارلیمنٹ مناسب قانون بنائے گی۔

۱۸۔ ہر شہری کو ان ضوابط کے مطابق جو اس باب میں بنائے جائیں اسلحہ رکھنے کا حق ہوگا۔

۱۹۔ مردوں اور عورتوں کو بہ حیثیت شہری مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

ان سفارشات کے علاوہ عاملہ اور مقننہ کی نسبت سفارشات پیش کی گئیں۔ مرکزی مجلس قانون ساز جماعت دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی ایک سات دوسرے دارالنا ئبین۔ دولت مشترکہ کی عاملانہ قوت بادشاہ میں مرکوز ہوگی۔ ہندوستان میں گورنر جنرل نمائندہ شاہی ہوگا۔ گورنر جنرل وزیر اعظم کے مشورے سے گورنر جنرل وزراء کا تقرر کرے گا۔[۲۴]

۲۲ دسمبر ۱۹۲۸ء کو رپورٹ پر بحث کرنے کے لئے کلکتہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی۔ کنونشن کا اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہوا۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی زبردست تائید کی لیکن مسلم لیگ کے نمائندوں نے رپورٹ سے سخت اختلاف کیا۔ ہندو مہا سبھا اس رپورٹ کی پرزور تائید کر رہی تھی۔ مسٹر جناح نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے کہا صوبہ بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی قوت رائے دہی آبادی کے لحاظ سے کم ہے لہذا نشستیں محفوظ کردی جائیں نہرو کمیٹی کی سفارشات کے بموجب ما بقی اختیارات مرکز کے سپرد کئے گئے لیکن مسٹر جناح نے ما بقی اختیارات کو صوبوں کے تفویض کرنے کی سفارش کی۔ ان کا خیال تھا کہ مرکز کو جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی ما بقی اختیارات عطا کرنے سے ہندو راج قائم ہو جائے گا۔ سندھ کی علیحدگی میں جو تجدیدات عائد کئے گئے اس سے بھی مسٹر جناح کو اختلاف تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے رپورٹ کی عام مخالفت کی گئی۔ یہ اعتراض کیا گیا کہ نہرو رپورٹ کے بموجب جملہ ۹ مجالس مقننہ میں سے صرف سات مقننات میں مسلمانوں کا تناسب

---

[۲۴] مزید تفصیلات ملاحظہ ہو باب مقننہ و عاملہ صفحات ۱۲۱ تا ۱۳۳

کم ہو جاتا ہے بلکہ ۱۹۱۹ء کے قانون سے مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں[۱۰۴] جب دس سال کے بعد مسلمانوں کے لئے تحفظ نشست ختم ہو جائے تو وہ نہ صرف ہر مجلس مقننہ بلکہ خود اختیاری ادارے سے ختم ہو جائیں گے۔ پست اقوام کا ایک جزبن جائیں گے[۱۰۵] مسلمانوں کو انتظامات حکومت کے حصے کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی اور ان کی زبان تعلیم تمدن اور مذہبی حقوق قطع انداز کر دیئے گئے ہیں[۱۰۶] یوروپینس انگلو انڈینس عیسائی اور پست اقوام کی نیابت مجالس مقننہ میں نہیں ہوسکے گی اس لئے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قبول نہیں کیا گیا ہے[۱۰۷] اس زمانے میں مسلمان پنجاب اور بنگال میں نشستوں کا تحفظ کروانا چاہتے تھے لیکن نہرو کمیٹی نے اس سے اختلاف کیا مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان دو اکثریت والے صوبوں میں اگر ان کے لئے نشستوں کا تحفظ نہ کیا گیا تو ہندو جن کی معاشی حالت بہتر ہے مجالس مقننہ میں اکثریت حاصل کرلیں گے۔ تمام صوبوں میں مسلمانوں نے نہرو کمیٹی کی سفارشات کے خلاف جلسے کئے۔ مسلمانوں نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء اور یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی اور رپورٹ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ خود مسلم کانفرنس کے انعقاد کی بڑی وجہ نہرو رپورٹ سے

---

[۱۰۴] رپورٹ سیمن کمیٹی جلد سوم توضیحی نوٹ از ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صفحہ ۳۰۴

[۱۰۵] " " " " " " " "

[۱۰۶] " " " " " " " "

[۱۰۷] " " " " " " " "

مایوسی تھی مرکزی مجلس مقننہ کے مسلم اراکین نے محسوس کیا کہ اگر نہرو رپورٹ
کو عملی جامہ پہنایا گیا تو مسلم فرقے کے سیاسی وجود کو خطرہ لاحق ہوگا۔[۱۴۸]
چنانچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۸ء ممتاز مسلم اراکین نے اعلان شائع کیا کہ "......
رپورٹ کے مصنفین اور لکھنؤ کی کانفرنس ہندوستان میں اقلیتوں کے
مسئلہ کو سمجھنے میں ناکام رہی اور ان کے مفادات کے تحفظ سے گریز کیا
...... ہم صاف طور پر بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے کوئی دستور
قابل قبول نہ ہوگا جب تک ان کے مفادات کا مناسب تحفظ نہ ہو جائے۔[۱۴۹]
سر ابراہیم رحمت اللہ نے کہا کہ "جس طرح کہ سائمن کمیشن نے ہندوستان کی
مختلف سیاسی جماعتوں میں اتحاد پیدا کیا اسی طرح نہرو رپورٹ نے
مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال میں اتحاد پیدا کر دیا۔[۱۵۰] حکیم اجمل خان نے
اپنے خطبہ استقبالیہ میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ
مسلمان مخلوط انتخابات کے لئے تیار نہیں[۱۵۱] نہرو رپورٹ نے عورتوں کو
بھی حق رائے دہی عطا کیا ہے ظاہر ہے کہ مسلمان عورتیں پردے کے
باہر نہیں آسکتیں۔ ایسی صورت میں صرف ہندو عورتیں رائے دے سکیں گی
چنانچہ اس طرح ہندو عورت مرد کے ووٹ اور بڑھ جائیں گے۔[۱۵۲] مدراس کی

---

۱۴۸ رپورٹ کل ہند مسلم کانفرنس مرتبہ کردہ حفیظ الرحمن صفحہ

۱۴۹ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

۱۵۰ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۲

۱۵۱ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۱۱

۱۵۲ ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،،

کانگریس نے مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی (۳۳) فیصد نیابت کو قبول کیا لیکن نہرو رپورٹ نے (۲۵) فی صد کر دیا۔ مسلمان (۲۵) فی صد سے اپنے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے [۵۳] حکیم صاحب نے کہا کہ نہرو رپورٹ پر اگر عمل کیا گیا تو مسلمان اپنی موجودہ حالت سے بھی گر جائیں گے۔ [۵۴] نہرو رپورٹ نے اردو کے تحفظ کے لئے کوئی سفارش نہیں پیش کی مسلمانوں کے تمدن سے انکار کیا گیا۔ [۵۵] سندھ کی علیحدگی میں اتنے شرائط رکھے گئے ہیں کہ علیحدگی ناممکن بنا دی گئی ہے [۵۶] مسلم خواتین نے اپنے ایک پیام بنام مسلم کانفرنس نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت کی۔ [۵۷] مسلمانوں نے اس لئے بھی نہرو رپورٹ سے اختلاف کیا کہ اس میں بجائے وفاقی دستور کے مرکزی دستور کی تائید کی گئی [۵۸]

اس زمانے میں مسلمانوں کے جو مطالبات تھے ان کا اندازہ مسٹر جناح کے (۱۴) نکات اور کل ہند مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے ہو سکتا ہے مسٹر جناح کے چودہ نکات یہ تھے جو مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع ہوئے [۵۹]

۵۳؎ رپورٹ کل ہند مسلم کانفرنس صفحہ ۱۲
۵۴؎ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۳
۵۵؎ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۲
۵۶؎ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۳
۵۷؎ ″ ″ ″ ″ ″ ۲۹
۵۸؎ ″ اجیڈکر تقسیم ہند ″ ۲۸۱
۵۹؎ ″ ″ ″ ″ ۲۳۷

۱۔ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاقی ہو اور صوبوں کو ما بقی اختیارات حاصل ہوں۔

۲۔ جملہ صوبوں کو مساوی حکومت خود اختیاری عطا ہو۔

۳۔ ملک کی جملہ مجالس مقننہ اور انتخابی جماعتوں میں اقلیتوں کی مناسب اور موثر نیابت ہو۔ کسی صوبے کی اکثریت کو نہ اقلیت کر دیا جائے اور نہ دوسرے فرقوں کے مساوی

۴۔ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت ($\frac{1}{3}$) سے کم نہ ہو

۵۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب برقرار رہیں تاوقتیکہ کوئی جماعت خود اپنی مرضی سے اس کو ترک نہ کرے۔

۶۔ ایسی سرحدی تبدیلی جس سے مسلمانوں کے اکثریت والے صوبے پنجاب، صوبہ سرحد و بنگال متاثر ہوتے ہوں عمل میں نہ لائی جائے۔

۷۔ ہر فرقہ کو آزادئ مذہب۔ عقیدہ۔ عبادت۔ پروپگنڈہ اور حق اجتماع عطا کیا جائے۔

۸۔ اگر کسی اقلیت کے ($\frac{3}{4}$) اراکین کسی ایسے قانون کو جس سے ان کا فرقہ متاثر ہوتا ہو مخالفت کریں تو اس کو منظور نہ کیا جائے۔

۹۔ سندھ کو صوبہ بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

۱۰۔ بلوچستان اور صوبۂ سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ ملازمتوں اور خود اختیاری جماعتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا

تحفظ دستور کے ذریعہ کیا جائے۔

۱۲۔ دستور میں مذہب اسلام۔ تمدن شخصی قانون مسلمانوں کی تعلیم۔ زبان۔ ان کے خیراتی ادارات اور حکومتی امداد کا تحفظ ہو۔

۱۳۔ مرکزی یا صوبجاتی کابینہ میں (⅓) مسلم ارکین سے کم نہ ہوں۔

۱۴۔ مرکزی مجلس مقننہ کے ذریعہ بغیران ریاستوں کی رائے کے جو وفاق میں شریک ہیں دستور میں تبدیلی نہ کی جائے۔

۱۵۔ اس وقت مجالس مقننات اور انتخابی اداروں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقۂ انتخاب ضروری ہے۔ ان کی رضامندی کے بغیر اس کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

کل ہند مسلم کانفرنس نے بھی یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو کم و بیش یہی قرار دادیں منظور کیں: لـه

۱۔ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے ایک وفاقی حکومت جس میں مکمل حکومت خود اختیاری ہو اور باقی اختیارات صوبوں کو حاصل رہیں، مرکزی حکومت کو مشترکہ امور تفویض کئے جائیں جو دستور عطا کرے گا۔

۲۔ فرقہ وارانہ معاملات کی نسبت کوئی مسودہ۔ قرار داد۔ تحریک یا ترمیم صوبہ واری یا مرکزی مجلس مقننہ میں منظور نہ ہوگی تب تک

لـه رپورٹ کل ہند کانفرنس صفحات ۲۹ تا ۲۷

ہندوؤں یا مسلمانوں کی (۳/۴) اکثریت جس کو کہ یہ متاثر کرتی ہے منظور نہ کر دے۔

۳۔ ہندوستانی مجالس مقننہ کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا طریقہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ بغیر مسلمانوں کی رضامندی کے اس حق سے ان کو محروم نہیں کیا جا سکتا

۴۔ جب تک کہ ہندوستان کے موجودہ حالات برقرار ہیں اور رہیں گے مسلمانوں کے لئے مجالس مقننہ اور آئینی خود اختیاری جماعتوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ضروری ہیں تاکہ حقیقی نیابتی جمہوری حکومت کا وجود عمل میں آئے۔

۵۔ جب تک کہ مسلمانوں کو اطمینان نہ ہو جائے کہ دستور کے ذریعہ ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہیں ہو رہا ہے اس وقت تک مسلمان مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے رضامند نہیں ہوں گے

۶۔ مرکزی یا صوبہ واری کابینہ میں مسلمانوں کا مناسب حصہ ہو

۷۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں مجالس مقننہ اور دیگر آئینی خود اختیاری ادارات میں مسلم اکثریت متاثر نہ ہو اور جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کی نیابت مروجہ قانون سے کم نہ کی جائے۔

۸۔ ہندوستان کے صوبوں کی نمائندہ مسلم اجتماعات نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر بہ اتفاق آراء یہ طے کیا کہ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت (۱/۳) فی صد ہو

اور یہ کانفرنس اس مطالبہ کو بالکلیہ منظور کرتی ہے۔

۹۔ انتظامی اور جغرافی اعتبار سے صوبۂ سندھ کی پریسیڈنسی بمبئی سے کوئی مناسبت نہیں۔ اس کو علیحدہ صوبہ بنانا چاہیئے جس میں اپنی علیحدہ مجلس مقننہ اور انتظامی مشنری بالکل اسی اساس پر ہو جو دوسرے صوبوں میں ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کو جو اقلیت میں رہ جاتے ہیں آبادی کے تناسب سے بڑھ کر مناسب اور موثر نیابت عطا کی جائے۔ جیسا کہ مسلمانوں کو اقلیت والے صوبوں میں حاصل ہے۔

۱۰۔ شمال مغربی صوبے اور بلوچستان میں دیگر صوبوں کی طرح دستوری اصلاحات مروج کرنا نہ صرف ان صوبوں کے عوام کے مفاد کے لئے ضروری بلکہ کل ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ ان صوبوں میں ہندو اقلیت کو آبادی سے بڑھ کر مناسب اور موثر نیابت عطا کی جائے جیسا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو حاصل ہے

۱۱۔ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور آئینی خود اختیاری کے ادارات میں مناسب گنجائش رکھی جائے۔

۱۲۔ ہندوستانی دستور میں مسلمانوں کی تعلیم زبان، مذہب شخصی قانون اور مسلم خیراتی اداروں کی ترقی اور تحفظ کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۳۔ ہندوستان کے دستور میں اس وقت تک تبدیلی نہ ہو جب تک کہ

وفاق کے جملہ اجزاء اس سے اتفاق نہ کرلیں۔

۱۴- یہ کانفرنس پر زور اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کوئی دستور قابل قبول نہوگا جب تک کہ ان قراردادوں کا لحاظ نہ رکھا جائے۔

فرقہ وارانہ مسائل در قانون حکومت ہند

۱۹۳۵ء

فرقہ وارانہ مسئلہ کی بابتہ سائمن کمیشن کی سفارشات

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کی ہندوستان میں عام مخالفت کی گئی۔ صرف اعتدال پسند قائدین نے ان اصلاحات کی تائید کی لیکن آخرکار اعتدال پسند لیڈرین بھی اصلاحات سے مایوس ہو چکے تھے۔ سوراج پارٹی نے بنگال اور صوبہ متوسط میں نظام دوعملی کو ناکام کر دیا سوراج پارٹی نے مروجہ دستور پر نظرثانی کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ حکومت نے ۱۹۲۳ء کو سر الگزنڈر مڈیمن کی صدارت میں ایک کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ نافذ شدہ اصلاحات کی چھان بین کرکے رپورٹ پیش کی جائے۔ اس کمیٹی کے چھ اراکین میں دو ہندوستانی تھے ہندوستانی اراکین نے مڈیمن کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کیا۔ جب لارڈ

۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں یہ درج تھا کہ قانون کے نفاذ کے دس سال بعد سرکاری طور سے تحقیقات کروائی جائیں گی چنانچہ تحقیقات کی غرض سے ہندوستان ایک کمیشن بصدارت سر جان سائمن آیا۔ اس کمیشن کے ساتھ اراکین تھے جس میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا جس کی وجہ سے سائمن کمیشن کا عام مقاطعہ کیا گیا اور تقریباً ہر جگہ مخالفت کی گئی۔ اس کمیشن نے جہاں دستوری مسائل پر نکتہ چینی کی اور اپنے سفارشات پیش کیں وہاں فرقہ وارانہ مسائل اور فرقہ وارانہ نیابت کی نسبت بھی اظہار خیال کیا۔[۱] کمیشن نے یہ سفارشات پیش کیں

"کسی صوبہ واری حکومت نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی مخالفت میں تجاویز نہیں پیش کی ہیں باوجود اس کے کہ اس اصول کی نظری اعتبار سے برابر مخالفت کی گئی ہے حکومت بمبئی نے بتایا کہ اس کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے اختلاف ہے اگر دونوں جماعتیں اپنی رضامندی سے اس کو ترک کر دیں تو اس اصول کو منسوخ کیا جا سکتا ہے بعض لوگ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب مع مخصوص نشستوں کے اصول پر زور دیتے ہیں۔ پنجاب میں ہندو وزراء نے فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کی سخت مخالفت کی۔ حکومت بنگال کی یہ تجویز ہے کہ مسلمانوں کی نیابت ان کے تناسب کے مطابق ہو۔ اکثر صوبہ واری کمیٹیوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی تائید کی۔ البتہ یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ اگر

---

[۱] رپورٹ سیمن کمیٹی جلد دوم پیراگراف ۰۰ تا ۹۰

مسلمان رضامند ہو جائیں تو ان کو منسوخ کیا جا سکتا ہے ۔ پنجاب کمیٹی نے ہندو اور سکھ اقلیت کو "پاسنگ"[1] دیا لیکن اس حد تک کہ مسلم اکثریت میں تبدیل نہ ہو جائے ۔ بنگال کمیٹی نے نشستوں کے تعین میں آبادی کے تناسب پر زور دیا ۔ بہار اور اڑیسہ کمیٹی نے جداگانہ نیابت کو تسلیم کرتے ہوئے تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستوں کے تعین کی سفارش کی اس کے علاوہ عام حلقہ ہائے انتخاب میں بھی مسلمانوں کو رائے دہی کی سفارش کی ۔

مرکزی کمیٹی کے اراکین نے نہرو رپورٹ سے اتفاق کیا[2] ۔ انھوں نے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب اور مسلمانوں کے لئے تحفظ نشست کے اصول کی تائید کی مسلمانوں کو عام حلقہ ہائے انتخاب میں رائے دینے کی اجازت ہوگی ۔ اسی اصول کا اطلاق ہندو اور سکھ اقلیتی صوبوں پر بھی ہوگا ۔ مرکزی کمیٹی نے سفارش کی کہ بنگال میں بلا تحفظ نشست مخلوط حلقہ ہائے انتخاب ہوں ۔ مرکزی کمیٹی کے دو اراکین نے ان سفارشات سے اختلاف کیا اور کل ہند مسلم کانفرنس کے مطالبات کی تائید کی ۔ جملہ مسلم جماعتوں کا مطالبہ ہے کہ جداگانہ نیابت برقرار رکھی جائے اور تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ سب کل ہند مسلم کانفرنس کی سفارشات کی تائید کرتے ہیں ۔ اعتدال پسند ہندو اراکین جو صوبہ واری کمیٹیوں میں تھے انھوں نے مسلمانوں کے حق جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو تسلیم کیا لیکن اکثر ہندوؤں نے

---

[1] ویٹج

[2] رپورٹ سیمن کمیٹی جلد دوم پیراگراف ۰۷

اس اصول سے اختلاف ہے ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کمیشن نے سفارش کی کہ مسلمانوں کے لئے فرقہ وارانہ نیابت برقرار رہے تا وقتیکہ وہ خود اپنی خوشی سے اس کو ترک کرنے پر رضامند نہو جائیں۔ اگرچہ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب مع مخصوص نشستوں کے اصول سے بھی یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن مسلمان اس کے لئے تیار نہیں! ان کا اعتراض یہ ہے کہ مخلوط انتخاب سے ہندو ایسے مسلمانوں کا انتخاب کریں گے جو ہندو پرست ہوں۔ اگرچہ مخلوط انتخاب سے فرقہ داری کشیدگی دور ہو سکتی ہے لیکن مسلمان اس اصول کو پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی حالات کے لحاظ سے نیابت متناسبہ کا طریقہ مناسب نہیں کمیشن نے سمجھا کہ صرف عدم مفاہمت کی وجہ سے جداگانہ نیابت کی تائید کی جاتی ہے

سکھوں کی نیابت[1]۔ سکھ بھی جداگانہ نیابت کا مطالبہ کرتے ہیں جداگانہ نیابت برقرار رہنے کی صورت میں سکھوں کو پاسنگ دینا ہوگا اس لئے کہ سکھ ایک ہی صوبے میں زیادہ ہیں اگر ان کو پاسنگ نہیں دیا گیا تو وہ مرکز میں بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ اس وقت سکھوں کو جو نشستیں حاصل ہیں وہ مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

پست اقوام کی نیابت[2]۔ پست اقوام کے لئے اب تک نامزدگی کا طریقہ رائج رہا ہے۔ صوبہ متوسط میں چار اراکین بمبئی میں دو صوبہ متحدہ اور بہار اور اڑیسہ میں ایک ایک۔ بنگال میں ایک بنگال اور آسام کی مجلس

---

[1] رپورٹ سیمن کمیٹی پیراگراف ۹۰

[2] ,, ,, جلد دوم پیراگراف ۸۷ تا ۸۰

حقیقت میں پست اقوام کا کوئی رکن بھی نہیں ہے۔ مدراس میں دس اراکین
نامزد ہوتے ہیں۔ غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب میں پست اقوام کے افراد کو
حق رائے دہی حاصل ہے لیکن ان کی اقتصادی اور تعلیمی پستی کی وجہ سے
وہ بہت کم شرائط رائے دہندگی پر اترتے ہیں۔ مدراس میں پست اقوام
آبادی کا ۱۵ فیصد ہیں۔ اگر شرائط رائے دہندگی کے معیار کو گھٹا
بھی دیا جائے تو پست اقوام کی مناسب نیابت نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ
ان کے لئے خاص انتظام نہ کیا جائے۔ اگر نامزدگی کا طریقہ برقرار رکھا
جائے تو ان کی سیاسی تربیت نہیں ہو سکتی۔ کمیشن نے سفارش کی کہ ان کے
لئے رائے دہی میں اضافہ ہونا چاہئے۔ پست اقوام کی انجمنوں نے
آبادی کے تناسب سے جداگانہ حلقہ انتخاب کا مطالبہ کیا اگرچہ بعض
نامزدگی کی بھی تائید کرتے ہیں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اچھا ضرور ہے لیکن
اس اصول سے ہندوؤں اور پست اقوام میں اختلافات برقرار رہیں گے
ہندوؤں کی سیاسی ترقی میں یہ یقیناً روڑا ہوگا۔ جب جداگانہ حلقہ ہائے
انتخاب ختم کرنا مقصود ہو تو نئی جماعتوں کے لئے اس کی توسیع کرنا مناسب
نہیں خصوصاً اس وقت جبکہ بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہو۔ کمیشن نے
سفارش کی کہ غیر مسلم حلقہ ہائے انتخاب میں پست اقوام کے لئے نشستیں محفوظ
کر دی جائیں چونکہ ان کی تعلیمی حالت گری ہوئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ
ان کی جماعت سے کوئی موزوں شخص نہ مل سکے۔ ایسی صورت میں گورنر کو
یہ اختیار ہوگا کہ وہ دوسری جماعت سے ایسے شخص کو نامزد کرے جو ان کے
مفادات سے دلچسپی رکھتا ہو۔ چند سال بعد جبکہ پست اقوام میں تعلیم
پھیل جائے گی اس کی ضرورت برقرار نہ رہے گی۔ بجائے جداگانہ حلقہ ہائے

انتخاب کے ان کے لئے نشستیں محفوظ کر دی جائیں تعلیمی ترقی کے بعد یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

یوروپینس کی نیابت[۶] ۔ ان کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو برقرار رکھا جائے چونکہ اس فرقے کی تعلیمی حالت اچھی ہے اور ملک کی ترقی میں ہاتھ بٹاتا ہے اس کو آبادی سے زیادہ نشستیں دی جاسکتی ہیں۔

اینگلو انڈینس کی نیابت[۷] ۔ ان کے لئے نامزدگی کے بجائے انتخابات ہوں لیکن جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کئے جائیں اس لئے کہ وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ نشستوں کے تعین میں ان کی تعداد یا سیاسی اثرات کا لحاظ نہ ہو بلکہ ان کو یہ موقع دیا جانا چاہیئے کہ وہ مجالس مقننہ میں اپنے مفادات کا آپ تحفظ کر سکیں۔

ہندوستانی عیسائیوں کی نیابت[۸] ۔ اس وقت ان کو مدراس میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب حاصل ہے لیکن دوسرے صوبوں میں ان کی نیابت نامزدگی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ہندوستانی عیسائیوں کے وفد کو عام حلقہ ہائے انتخاب سے اتفاق ہے لیکن مدراس کے ہندوستانی عیسائی جداگانہ نیابت پر زور دیتے ہیں۔ مدراس میں اس وقت ان کی نیابت مناسب ہے لیکن دوسرے صوبوں میں ان کی نیابت دوگنی کی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کی نشستوں کا تعین[۹] ۔ میثاق لکھنؤ کے ذریعہ جو ہندو مسلم

---

[۶] رپورٹ سیمن کمیٹی جلد دوم پیراگراف ۸۱

[۷] ,, ,, ,, ,, ۸۳

[۸] ,, ,, ,, ,, ۸۴

[۹] ,, ,, ,, ,, ۸۸

نشستوں کا تعین کیا گیا اب اس کو تائید حاصل نہیں مسلمانوں کی کمزوری اور پستی کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو جو پاسنگ حاصل ہے برقرار رکھا جائے۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نیابت ان آبادی کے تناسب سے نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان صوبوں کے ہندو اور سکھ پاسنگ دئے جانے کے مستحق ہیں۔ آبادی کے تناسب پر بنگال اور پنجاب میں اس وقت نیابت ممکن ہے جبکہ ان دو صوبوں میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قائم ہو جائیں۔

کامرس اور پلانٹرس کی نیابت[۱۰] کامرس اور پلانٹرس کی نیابت ان کے تناسب سے ہونی چاہیئے۔

لیبر کی نیابت[۱۱] ہندوستان کے مزدوروں میں نہ شعور ہے اور نہ باقاعدہ تنظیم۔ مزدوروں کے حقیقی نمائندے مشکل سے ملتے ہیں۔ اگر مزدوروں کے نمائندے مل جائیں تو ان کی نیابت وسیع کی جا سکتی ہے مختلف صوبوں کے گورنر مقامی حالات دیکھ کر ان کی نیابت پر غور کریں۔

بڑے زمینداروں کے لیئے خاص نیابت[۱۲] زمیندار ہندوستان کے اچھے اور با اثر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں لہذا ان کی مناسب نیابت ہو۔

عورتوں کی نیابت[۱۳] صوبہ داری مجالس مقننہ میں ان کی نیابت ہو

---

[۱۰] رپورٹ سیمن کمیشن جلد دوم پیراگراف ۸۸
[۱۱] " " " " ۸۹
[۱۲] " " " " ۹۰
[۱۳] " " " " ۹۱

مرکزی مجلس مقننہ[۱۴] ۔ فیڈرل اسمبلی کے لئے صوبوں سے تناسب کے اصول پر اراکین منتخب ہوں تو بہتر ہے۔ اس کے ذریعہ ایک تو اقلیتوں کا تحفظ ہو جائے گا دوسرے فرقہ وارانہ نیابت سے نجات حاصل ہو جائیگی فیڈرل اسمبلی میں ہر فرقے کی نیابت ہو سکتی ہے فیڈرل اسمبلی میں مختلف فرقوں کی نیابت کا تناسب حسب ذیل ہو۔ پست اقوام ۸ فی صد سکھ ڈو فی صد مسلمان ۲۸ فی صد یوروپین دس فی صد۔ ہندوستانی عیسائی اور بنگلو انڈین تقریباً ایک فی صد اور غیر مسلمان (باستثنا پست اقوام) ۵۰ فی صد۔ اس وقت کونسل آف اسٹیٹ میں ۶۰ اراکین ہیں جس میں سے ۳۳ منتخب کردہ اور بقیہ نامزد کردہ منجانب گورنر جنرل۔ اس تناسب کو برقرار رکھا جائے۔

اقلیتوں کے لئے تحفظ[۱۵] ۔ موجودہ دستور کی طرح کوئی ایسا مسودہ جس سے کس مذہب .... مذہبی رسوم یا برطانوی ہند کی کسی جماعت کو متاثر کرتا ہو بغیر گورنر جنرل کی اجازت پیش نہ ہو۔ اکثر جماعتوں اور اقلیتوں نے کمیشن سے مل کر کہا کہ مرکزی یا صوبہ واری مجالس مقننہ میں کوئی ایسا قانون منظور ہونے نہ پائے جس سے وہ متاثر ہوں۔ گورنر جنرل اور گورنروں کو جو "شاہی ہدایت نامہ"[۱۶] دیا جاتا ہے تاکہ ایسے قوانین جس سے کوئی اقلیت فرقہ یا جماعت متاثر ہوتی ہو پیش ہونے سے

---

۱۴ رپورٹ سیمن کمشن جلد دوم پیراگراف ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۴۹، ۱۵۰۔

۱۵ " " " " ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۰

۱۶ " " " " "

رکوادٹے جائیں اس کو برقرار رکھا جائے۔

گول میز کانفرنس اور اقلیتوں کے مسائل

ہندوستانی جماعتیں ایک ایسا دستور بنانے میں ناکام ہوگئیں جو ہر ایک فرقے و طبقے کے لئے قابل قبول ہو۔ نہرو رپورٹ کو ہندوؤں نے تو تسلیم کیا لیکن مسلمانوں نے عام طور پر اس کی سخت مخالفت کی۔ دوسری طرف ہندوستانیوں کو سائمن کمیشن کی سفارشات قابل قبول نہ تھیں۔ حکومت برطانیہ نے محسوس کیا کہ سائمن کمیشن کی سفارشات پر ہندوستان کے لیے کوئی دستور مدوّن نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے اور ان تینوں اجلاس میں ہندوستانی نمائندے آپس میں کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ نہرو رپورٹ کی سفارشات کے بعد جو اختلافات پیدا ہوئے اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس میں فرقہ واری مسائل حل نہ ہو سکے حتیٰ کہ حکومت برطانیہ نے اس معاملہ کو خود اپنے ہاتھ میں لیا۔

پہلا اجلاس۔ گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ اس اجلاس میں کانگریس شریک نہ ہو سکی اس لئے کہ حکومت اور کانگریس کے تعلقات اس زمانے میں کشیدہ تھے۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک منظور کی جس کے بعد ملک میں بدامنی پیدا ہوئی۔ گاندھی جی اور اکثر کانگریس کے اراکین گرفتار کر لئے گئے تھے۔ لیکن پہلے اجلاس میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری کی شرکت سے

کانگریس کی بالواسطہ نیابت ہوگئی[۱] ان دونوں نے انگلستان جانے سے قبل کانگریسی اراکین سے مشورہ کرلیا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے آغاخاں، سر محمد شفیع۔ سر محمد علی۔ مسٹر فضل حق اور مسٹر جناح نمائندگی کررہے تھے سکھوں کی جانب سے سردار سمپورن سنگھ۔ مہا سبھا سے ڈاکٹر مونجے پست اقوام سے ڈاکٹر امبیڈکر۔ ہندوستانی عیسائیوں سے مسٹر کے ٹی پال اور اینگلو انڈینس کی نیابت لفٹنٹ کرنل گڈنی کررہے تھے۔ کانفرنس میں زیادہ تر مباحثہ وفاق سے متعلق تھا لیکن فرقہ وارانہ مسائل بھی زیربحث رہے۔ اس اجلاس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ گورنر جنرل اور گورنروں کے ذمہ رہے۔ ان کو اس خصوص میں خاص اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ گڈنی۔ پال۔ شفیع سمپورن سنگھ وغیرہ سب نے اپنے فرقے کے لئے جداگانہ نیابت اور ملازمتوں میں حصے کے تعین کا مطالبہ کیا۔ اس اجلاس میں قلمرو کی درجے کے اصول اور مرکز میں ذمہ دارانہ حکومت کی نسبت سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جناح و مسٹر شفیع میں اتفاق رائے ہوگیا لیکن مسئلہ کا فرقہ وارانہ رخ نظرانداز نہیں کیا گیا۔ مولانا محمد علی نے وفاقی ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کے اصول کو تسلیم کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ خوش قسمتی سے بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بحث و مباحثے کے بعد مختلف فرقوں نے فرقہ وارانہ نیابت اور نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ اقلیتوں کو جو نشستیں حاصل ہوں گی وہ کسی طرح

---

[۱] کرشنا۔ مسئلہ اقلیت صفحہ ۲۰۰

ان کی آبادی سے کم نہوں۔ نامزدگی کے اصول کی عام مخالفت کی گئی۔ مخلوط انتخابات اور مقررہ نشستوں کے متعلق بھی بحث ہوئی لیکن اس کو عام تائید حاصل نہ ہو سکی۔ بالعموم جداگانہ نیابت کی تائید کی گئی۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں اقلیتوں کی جو ذیلی کمیٹی ترتیب دی گئی تھی اس کے (۴۹) اراکین تھے جن میں سے (۴۴) ہندوستانی تھے۔ وزیر اعظم برطانیہ اس کمیٹی کے صدر نشین تھے۔ اس کمیٹی نے یہ اصول تسلیم کیا کہ جدید دستور میں اقلیتوں کا مناسب تحفظ کیا جائے گا۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ اعلیٰ ملازمتوں میں مختلف فرقوں کے مطالبات تسلیم کیے جائیں گے۔ پست اقوام کی جانب سے ڈاکٹر امیڈکر نے کہا کہ انتخابات میں ان کا شمار بحیثیت ایک علحدہ فرقے کے کیا جائے اور ہندوؤں میں ان کو شمار نہ کیا جائے انھوں نے کہا کہ پست اقوام کے جب تک مطالبات قبول نہیں کئے جائیں گے کوئی دستور ان کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ مسلمان اراکین میں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے کہا کہ ہم اپنے برادران وطن کا ہر طریقے سے ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے حقوق اور مطالبات کا تحفظ ہو جانا چاہیئے۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑے کی نسبت غلط فہمی نہ ہو۔ ان کی بنیاد ایک دوسرے کی حکومت کے خلاف خوف پر ہے۔ مسلمانوں کے وفد نے اعلان کیا کہ صوبوں اور مرکز میں جب تک مسلمانوں کے مطالبات کا تحفظ نہ ہو جائے کوئی دستور ان کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ سر سپرو نے کہا کہ ہندوستان میں کوئی دستور بغیر اقلیتوں کو تسکین پہنچائے چل نہیں سکتا۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں

فرقہ وارانہ مسائل طے ہو سکے۔

دوسرا اجلاس۔ گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں کانگریس شریک نہ رہی حکومت نے محسوس کیا کہ بغیر کانگریس کی تائید کے ہندوستان میں کوئی دستور نہیں چل سکتا۔ وائسرائے ہند لارڈ اروِن نے گاندھی جی سے گفت وشنید کے بعد ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ سیول نافرمانی کی تحریک بند کر دی جائے گی۔ کانگریس گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہوگی اور پہلے اجلاس میں جو مسائل طے ہوئے ان پر نظر ثانی کی جائے گی۔ کانگریس کی جانب سے مسٹر گاندھی کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں شریک ہوئے۔ دوسرے اجلاس کو روانہ ہونے سے قبل سر علی امام کی صدارت میں بمقام لکھنؤ مسلم قوم پرست کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں[15] حقوق کے ذریعہ تمدن۔ زبان۔ رسم الخط، تعلیم مذہبی آزادی وغیرہ کی آزادی ہو۔ وفاقی دستور میں مابقی اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔ سندھ کو ایک علحدہ صوبہ بنایا جائے صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات عطا کیے جائیں۔ ملازمتوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔

گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے انھوں نے دعویٰ کیا کہ کانگریس جملہ فرقوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس ملک کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے

---

[15] بحوالہ سیاست ملیہ صفحات ۲۵۰ تا ۲۵۱

ہندوستان کے دوسرے مندوبین کو ہندوستان عوام کی تائید حاصل نہیں اس لئے کہ وہ حکومت کے نامزد کردہ ہیں۔ اقلیتوں نے کانگریس کے اس دعوی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ملک کے جملہ فرقوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ نشستوں کے تعین میں اقلیتوں نے کانگریس کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ عبوری دور کے لئے مرکز میں دو عملی کا نظام حکومت برقرار رکھا جائے لیکن گاندھی جی کو اس سے اختلاف تھا اور انھوں نے مرکز میں فوری ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا اگرچہ ہندوستانی نمائندے کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے لیکن گاندھی جی نے کہا کہ بغیر فرقہ وارانہ حل کے دستور کی تدوین ہو سکتی ہے اور اس مسئلہ کو بعد میں بھی طے کیا جا سکتا ہے لیکن اقلیتوں کے نمائندوں نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے لئے کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل اسکیم منظور کی۔[۹۱] دستور میں "بنیادی حقوق" کے تحت ہر فرقہ کو تمدن۔ زبان۔ رسم الخط۔ تعلیم مذہبی اوقاف اور مذہبی رسوم کی آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔ قانون شخصی کا تحفظ ہوگا۔ جو فرقہ مختلف صوبوں میں اقلیت میں ہیں ان کے حقوق کا تحفظ وفاقی حکومت کرے گی۔ حق رائے دہی بالغ مرد و عورت کے لئے وسیع کر دی جائے گی۔ مشترک حلقہ ہائے انتخاب قائم کئے جائیں گے۔ سندھ کے ہندو آسام کے مسلمان پنجاب اور صوبہ

---

[۹۱] رپورٹ گول میز کانفرنس، ۷ ستمبر ۱۹۳۱ تا یکم دسمبر ۱۹۳۱۔ رپورٹ بابت کمیٹی برائے تحقیق بابت وفاق و مسائل اقلیت جلد سوم صفحات: ۱۲۹ تا ۱۲۹۲

سرحد کے سکھ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے وفاقی اور صوبجاتی مجالس مقننہ میں آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی جہاں کہ وہ (۲۵) فی صدی سے کم ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو مقابلے کے ذریعہ زائد نشستیں حاصل کرنے کا بھی اختیار ہوگا۔ غیر جماعتی پبلک سروسیس کمیشن تقررات کرے گا اور کم از کم قابلیت کا معیار مقرر کرے گا اور ملک کے پبلک سرویس میں مختلف فرقوں کی مناسب نمایندگی پر غور کرے گا۔ وفاقی اور صوبہ واری کابینہ کی تشکیل میں اقلیتوں کو کنونشن کے ذریعہ تسلیم کیا جائے گا۔ صوبہ شمال مغربی سرحدی اور بلوچستان میں دیگر صوبجات کی طرح اصلاحات کی جائیں۔ اگر سندھ کے لوگ اپنے علیحدہ کئے ہوئے صوبے کی مالیاتی بار کو برداشت کرنے کو تیار ہوں تو اس کو علیحدہ صوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ ملک کا مستقبل کا دستور وفاقی ہو۔ مابقی اختیارات وفاقی اجزاء کو حاصل ہوں تاوقتیکہ بعد میں آزمائش پر یہ ہندوستان کے مفاد کے خلاف ثابت نہ ہو جائے۔ کانگریس نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ مستقبل میں کسی ایسے دستور پر رضامند نہیں ہو سکتی جس سے اقلیتوں کو اختلاف ہو۔

ڈاکٹر مونجے نے ہندو مہا سبھا کی جانب سے پہلے اجلاس میں حسب ذیل یادداشت پیش کی[؎۱] ہندو مہا سبھا کی رائے میں فرقہ وارانہ نیابت قومیت کے خلاف اور ذمہ دارانہ حکومت کے منافی ہے۔ جلد

[؎۱] رپورٹ گول میز کانفرنس ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء رپورٹ بابتہ کمیٹی برائے تحقیق ماہیت دستور وفاق و مسائل اقلیت جلد پنجم [illegible]

فرقوں کے لئے مخلوط انتخابات ہوں۔ ہر صوبے میں جملہ فرقوں کے لئے مساوی
اور یکساں شرائط رائے دہندگی ہوں۔ تعلیمی اور انتخابی اداروں میں
فرقہ دارانہ نیابت نہ ہو۔ تحفظ نشست کا مطالبہ صرف ایک قلیل مدت
کے لئے پورا کیا جائے۔ کسی صورت میں کسی صوبے میں فرقہ اکثریت کیلئے
نشستوں کا تعین نہ کیا جائے۔ کسی فرقے کی اکثریت وجود میں لانے کیلئے
صوبوں کی تقسیم عمل میں نہ آئے بلکہ صوبوں کی ازسرنو تقسیم میں انتظامی
اور مالیاتی پہلو مضمر ہوں۔ صوبوں کی ازسرنو تقسیم میں ہندوؤں اور
مسلمانوں دونوں کی رضامندی شامل حال ہونی چاہئے۔ سندھ کو علیحدہ
صوبہ نہ بنایا جائے۔ اس سے ملک کے حب الوطنی کے جذبے کو دھکا
لگے گا۔ سندھ کی علیحدگی پر ہندو رضامند نہیں۔ اس تقسیم سے مالیاتی
مشکلات پیدا ہوں گے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دی جا سکتی
ہیں لیکن یہ عمل بتدریج ہو۔ ملازمتوں میں فرقہ داریت کا تعین نہ ہو بلکہ
قابلیت اور اہلیت دیکھی جائے اور مقابلہ کا اصول رکھا جائے۔
مسلمانوں کے اس مطالبے سے کہ صوبہ واری یا مرکزی کابینہ غیر مسلمانوں
کے خاص تناسب سے تشکیل نہ دی جائے اس پر مہا سبھا کو اعتراض
ہے۔ اس لئے کہ اس سے کابینہ کی مشترک ذمہ داری قائم نہیں ہو سکتی
وزیر اعظم کو آزادی ہونی چاہئے کہ وہ جس فرقے سے چاہے وزراء کا
انتخاب کرے۔ مہا سبھا مستحکم مرکزی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اس لئے
صوبوں کو باقی اختیارات دینے پر اعتراض ہے۔ کامل مذہبی آزادی
اور شہری آزادی عطا ہونی چاہئیں مگر یہ آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے
دوسروں کو نقصان پہنچے۔ اگر مسلمان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر

مصر ہیں تو بادل ناخواستہ انکا یہ مطالبہ پورا کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں مسلمان میثاق لکھنؤ کے پابند ہوں گے مہا سبھا ہندوستان کے ٹکڑے پارچے کرنا پسند نہیں کرتی۔ ہر اقلیت اور فرقے کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کو مجلس اقوام جیسی جماعت کے سامنے بغرض حل پیش کرنا چاہئے۔ اگر اقلیتوں کی آزاد اکائیوں پر زور دیا جائے تو مملکت میں انتشاری عناصر پیدا ہوں گے۔

پست اقوام کی جانب سے ایک یادداشت ڈاکٹر امبیڈکر راؤ بہادر اور آر سرینواس نے پیش کی[لے] بنگال صوبہ متوسط۔ آسام۔ بہار اور اڑیسہ۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں پست اقوام کو ان کی آبادی کے تناسب پر نیابت کا مطالبہ کیا گیا۔ مدراس میں (۲۲) فی صد نیابت طلب کی گئی۔ سندھ کے صوبہ بمبئی میں شامل رہنے پر پست اقوام کی (۱۶) فی صد نیابت کا مطالبہ کیا گیا۔ اگر سندھ علیحدہ کر دیا جائے تو صوبہ بمبئی میں ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کی بناء پر ہو مرکزی مجلس مقننہ میں ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونی چاہئے پست اقوام کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندے منتخب کرنے کی اجازت ہو۔ بغیر ان کی رضامندی کے ان کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب میں شامل نہ کیا جائے۔ پست اقوام کے لئے نامزدگی کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور اس کے بجائے ان کو انتخاب کا حق ہو۔ آئندہ پست اقوام کے لئے اصطلاح نان کاسٹ ہندو یا پراٹسٹنٹ ہندو یا کوئی

لے رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۲۰۹ تا ۲۱۱

دوسری اصطلاح استعمال کی جائے۔

ہندوستانی عیسائیوں کی جانب سے مسٹر سلوام نے یادداشت پیش کی۔[۱۲۱] اس یادداشت میں عام شہری اور مذہبی حقوق کے مطالبے کے ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا کہ عیسائیوں کا علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب ہونا چاہیئے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب یا مخصوص نشستوں کے ذریعہ ان کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔

اینگلو انڈینس اور مستقل مقیم یورپینس فرقے کی جانب سے سر ہنری گڈنی نے یادداشت پیش کی[۱۲۲] بحیثیت فرقے کے ان کے سیاسی حقوق تسلیم کئے جائیں اور مرکزی اور صوبہ داری مجالس مقننہ میں ان کی مناسب نیابت ہو۔ ان کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ حکومت کی عاملہ اور دیگر عہدوں میں ان کی مناسب نیابت ہو۔ یوروپینس کی تعلیم کا خاص انتظام رہے اور اس وقت ان کو جو وظائف اور امداد حاصل ہے وہ برقرار رکھی جائے۔ جیوری کے مقدمات میں نسلی امتیازات ختم کردئے جائیں دوسرے فرقوں کی طرح انھیں بھی حقوق جیوری عطا کئے جائیں۔ اگر کوئی فرقہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ کرے تو اس کو منظور کر لیا جائے تا وقتیکہ اس فرقے کے (۷۵) فی صد اشخاص اس کو مسترد کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ صوبہ داری کمیشنوں اور حکومت ہند کے کمیشن میں اقلیتوں کا کم از کم ایک نمائندہ ہونا چاہیئے

---

[۱۲۱] پورٹ گول میز کانفرنس بابت وفاق و اقلیتیں صفحہ ۱۲۱۲ تا ۱۲۱۳

[۱۲۲] " " " " " " ۱۲۱۴ تا ۱۲۱۵

حسب موقع گورنر جنرل یا گورنر نامزد کریں گے۔ پبلک سروس کمیشن کا یہ کام ہوگا کہ وہ دیکھے کہ مختلف فرقوں کی ملازمت میں مناسب شرکت ہو رہی ہے یا نہیں۔ وفاقی کابینہ میں ایک وزیر فرقۂ اقلیت کا بھی ہو صوبہ داری کابینہ میں ایک وزیر اور دو انڈر سکریٹری فرقۂ اقلیت سے لئے جائیں۔

مرہٹے اور دیگر ہندو "فرقوں" کی جانب سے بی۔ وی جادھیو نے یادداشت پیش کی[۱۲۴] مدراس میں غیر برہمنوں کے لئے نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ انھوں نے ہر وقت متعینہ نشستوں سے زیادہ ہی حاصل کیا ہے اور کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب کہ تعین نشست کی رعایت کام میں لائی گئی ہو۔ البتہ بمبئی میں مرہٹوں کی نشستیں محفوظ کرنے کی ضرورت ہے ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۶ء کے انتخابات کے نتائج کی بنا پر شہر بمبئی میں ثابت ہو گیا کہ کوئی مرہٹے بغیر تعین نشست کے کامیاب نہیں ہو سکتا بمبئی کے دیگر اضلاع میں انتخابات کے سلسلہ میں مرہٹے امیدوار ناکام رہے مرہٹے ابھی منظم نہیں ہوئے ہیں لہٰذا ان کی نشستیں محفوظ کر دینا چاہیئے۔

پنجاب کا مسئلہ۔ سردار اجل سنگھ اور سمپورن سنگھ نے سکھوں کے مطالبات کو پیش کیا[۱۲۵] یہ مطالبہ کیا گیا کہ پنجاب میں سکھ فرقے کی تاریخی۔ سیاسی اور معاشی اہمیت کی بنا، پر ان کو صوبہ پنجاب میں (۳۰) فی صد نیابت عطا کی جائے۔ کہا گیا کہ یہ مطالبہ ناجائز بھی نہیں اس لئے کہ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی کہ سکھوں کی پنجاب میں اور مسلمانوں کو

---

۱۲۴ رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۴۱۵ تا ۱۴۱۶

۱۲۵ " " " " " " ۱۳۹۹ تا ۱۴۰۰

صوبۂ متحدہ میں (۲۱) فی صد نیابت حاصل ہے - چونکہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو پاسنگ دیا گیا ہے - لہذا سکھوں کو بھی دیا جانا چاہئیے - اس یادداشت میں راولپنڈی اور ملتان کو جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے صوبہ سرحد سے ملحق کردینے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ بقیہ صوبہ پنجاب میں مختلف فرقوں کی آبادی میں توازن پیدا ہوجائے - پنجاب کی کابینہ اور پبلک سروس کمیشن میں سکھوں کی ⅓ حصہ نیابت ہو اگر پنجاب کی نسبت کوئی سمجھوتہ نہ ہوجائے تو اس صوبے پر مرکزی حکومت ہی کی نگرانی ہوتا وقتیکہ فرقہ وارانہ فیصلہ نہ ہوجائے - پنجابی زبان صوبے کی سرکاری زبان ہو - لیکن سکھ اور دوسرے فرقے گرمکھی رسم الخط استعمال کرنا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت ہو - مرکزی مجلس مقننہ کے دونوں ایوانوں میں سکھوں کی (۵) فیصد نیابت ہو - مرکزی کابینہ میں کم از کم ایک سکھ ہر وقت ضرور رہے - سکھوں کا فوج سے خاص تعلق رہا ہے چنانچہ جنگ سے قبل ان کا فوج میں جو تناسب تھا اس کو برقرار رکھا جائے کل ہند سرویس میں سکھوں کی موثر نیابت ہو - باقی اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مرکزی حکومت کو خاص اختیارات حاصل ہوں گے - صوبہ واری اور مرکزی حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کا اعلان کردے - اس وقت جو مذہبی اوقاف ہیں ان کو برقرار رکھا جائے لیکن نئے اوقاف پیدا نہ کئے جائیں - اگر طالب علموں کی کافی تعداد ہو تو حکومت گرمکھی رسم الخط کی تعلیم کا انتظام کرے - دستور کے ذریعہ سکھوں کو جو تحفظ دیا جائے گا بغیر ان کے مشورے کے اس میں تبدیلی نہ ہو -

راجہ نریندر ناتھ نے پنجاب کی ہندو اقلیت کے لئے یادداشت پیش کی۔[۲۶] انھوں نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے اختلاف کیا۔ صوبہ داری مجلس مقننہ اور وفاقی اسمبلی میں پنجاب کے ہندوؤں کی نیابت ان کی آبادی کے لحاظ سے ہو۔ تقررات کارکردگی کے بناء پر ہوں۔ پنجاب کے ہندوؤں کو یورپینس۔ اینگلو انڈینس۔ عیسائی اور پست اقوام کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر اعتراض نہیں۔ پنجاب میں مسئلہ اقلیت کے حل لئے سر جعفری کار بیٹ نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔[۲۷] سکھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب پر راضی ہوسکتے ہیں لیکن مسلمانوں کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کرنے پر وہ اپنے فرقے کے لئے بھی اس کا مطالبہ کریں گے۔ ہندوؤں کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب سے اتفاق ہے لیکن ان کو فرقہ اکثریت کے لئے نشستوں کے تعین میں اختلاف ہے۔ پنجاب میں مختلف فرقے اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے مطالبات کی تکمیل مشکل سے ہوتی ہے جب حل نہیں ہوسکتا تو صوبہ پنجاب کی سرحدوں میں تبدیلی کی جائے۔ اس تقسیم میں انتظامی۔ معاشی۔ جغرافی۔ تاریخی اور لسانی ضروریات کو ملحوظ رکھنا چاہئے چاہئے۔ انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے علیحدہ کرکے صوبہ متحدہ میں شامل کردیا جائے۔ کاربیٹ نے تقسیم پنجاب کی جو اسکیم پیش کی اس کی رو سے مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور

---

[۲۶] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۴۰۲ تا ۱۴۰۳

[۲۷] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۱۴۳۱ تا ۱۴۳۶

سکھوں کی اکثریت ہو گی۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی (۶۰) فی صد ہو گی۔ اس کے بعد سکھوں کو جداگانہ نیابت یا پاسنگ کی ضرورت نہ ہو گی۔ اس تقسیم سے سکھوں کی آبادی کا فی صد بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی یہ خواہش کہ کوئی دستوری اکثریت تعین نشست کیساتھ نہ ہو پوری ہو سکتی ہے۔ راجہ نریندر ناتھ نے کاریٹ کی تقسیم پنجاب والی اسکیم سے اختلاف کیا اس لئے کہ ہندوؤں کی آبادی (۲۹) فی صد سے (۲۳) فی صد ہو جاتی تھی[۲۰] سردار اجال سنگھ راولپنڈی اور ملتان ڈویژن کو صوبہ سرحد میں ملحق کرنا چاہتے تھے اس تقسیم سے ان کا خیال تھا کہ ایک تو سکھوں کو پاسنگ کی ضرورت نہ رہے گی دوسرا صوبہ میں مختلف فرقوں کی آبادی میں مناسب تقسیم عمل میں آیگی مثلاً مسلمان (۴۳،۳) فی صد ہندو (۴۲،۳) فی صد اور سکھ (۱۴،۴) فی صد ہو جائیں گے۔ البتہ اس کے بعد صوبہ سرحد اور سندھ میں ہندوؤں اور سکھوں کو پاسنگ دینا ہو گا۔ اس تقسیم کے بعد صوبہ سرحد کا رقبہ و آبادی بڑھنے سے گورنر کا صوبہ بنایا جا سکتا ہے اور معاشی اعتبار سے بھی وہ خود مکتفی ہو سکتا ہے۔ سردار اجال سنگھ نے کہا کہ یا تو پنجاب میں سکھوں کو (۳۰) فی صد کا پاسنگ دیا جائے یا پنجاب کی از سر نو تقسیم عمل میں آئے ورنہ کوئی دوسری صورت نہیں سوائے اس کے کہ حل دریافت نہ ہونے کی صورت میں مرکزی حکومت پنجاب کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے[۲۱]

---

[۲۰] ” ” ” صفحہ ۱۳۵

[۲۱] ” ” ” ” ۱۳۶

صوبہ بنگال کے ہندوؤں کے مطالبات کو سر پرودش چندر مترنے پیش کیا[۳۰] مسلمانوں کو مقننہ میں دستوری اکثریت عطا کرنے کے ہندو مخالف ہیں۔ ہندو مخلوط انتخابات معہ مخصوص نشستوں کے چاہتے ہیں۔ اگر مسلمانوں اور دیگر فرقوں کے مطالبات قبول کئے جائیں تو بنگال کی مجلس مقننہ میں ہندوؤں کو ایک نشست بھی نہیں مل سکتی۔ سی۔ پی مترنے آغا خاں۔ امیڈکر وغیرہ کے مشترک نوٹ سے اختلاف کیا۔ انھوں نے یہ اسکیم پیش کی کہ جس حلقہ ہائے انتخاب میں مسلم یا غیر مسلم رائے دہندے (۱۰) فی صد سے کم ہوں تو اقلیت کا ایک ووٹ (۲) ووٹ میں شمار کیا جائے اور جہاں (۱۰) فی صد تا (۳۰) فی صد ہوں وہاں (۱½) ووٹ شمار کئے جائیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بجائے مسئلہ اقلیت کو کل ہند بنیادوں پر حل کرنے کے صوبہ بصوبہ حل کیا جائے اس لئے کل ہند مجالس مقننہ کی بابتہ دونوں فرقوں کے اختلافات اتنے نہیں جتنے صوبوں میں ہیں۔

سر چمن لال ستلواڈ نے اقلیتوں کی کمیٹی کے لئے جو یادداشت[۳۱] مرتب کی اس میں کہا کہ اقلیتوں کے لئے مذہبی اور شہری آزادی کا تحفظ ہو جائے تو خود اقلیتوں کے لئے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا طریقہ بہتر ہے لیکن اگر مسلمان جداگانہ حلقوں پر مصر ہیں تو ان کو اس کی اجازت دی جائے۔ مختلف فرقوں کے تقسیم ہو جانے سے قومی حکومت اور

---

[۳۰] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۴۲۸ تا ۱۴۳۰

[۳۱] " " " " " " ۱۴۱۹ تا ۱۴۲۱

قومی اتحاد میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے ۔ کابینہ کی مشترکہ ذمہ داری میں دقت پیش آتی ہے ۔ لہذا بجائے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب اور تعین نشست کا اصول رائج کر دیا جائے ۔ اگر کسی مقننہ میں ربع مسلم اراکین مخلوط انتخاب کی تائید کریں تو اس مقننہ کے لئے مخلوط انتخابات مروج کئے جائیں ۔ پست اقوام کے لئے بھی مخلوط حلقہ ہائے انتخاب میں نشستوں کا تعین ہونا چاہئے ۔ پنجاب اور بنگال کی مقننہ میں مسلمانوں کو (۵۱) فی صد نیابت عطا کی جائے ۔[۱۳۱]

گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ایک یادداشت سر آغا خاں (مسلمان) ڈاکٹر امیڈکر (پست اقوام) مسٹر سلوام (ہندوستانی عیسائی) سر ہنری گڈنی (اینگلو انڈین) اور سر ہیوبرٹ کار (یوروپینس) کے دستخط سے جاری کی گئی ۔ اس یادداشت میں عام شہری آزادی مذہبی و سماجی آزادی کے تحفظ کے لئے یہ مطالبہ کیا گیا کہ دستور میں ایسے آئینی تحفظات ہوں جن سے ایسے قوانین جو فرقوں کو متاثر کرتے ہوں نافذ نہ ہو سکیں ۔ صوبہ واری اور مرکزی کابینہ میں جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو کافی تعداد میں شریک کیا جائے مرکزی اور صوبہ واری حکومتوں کے تحت دستوری محکمے ہوں جو اقلیتوں کا تحفظ کریں اور ان کی بہبودی کا سامان فراہم کریں ۔ جن فرقوں کو اس وقت جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا حق حاصل ہے وہ برقرار رہے ۔ تبدیل[۱۳۲]

---

[۱۳۱] رپورٹ گول میز کانفرنس بابتہ وفاق و اقلیتیں صفحات ۱۲۹۴ تا ۱۲۹۷

[۱۳۲] ״ ״ ״ ״ ״ ۱۲۹۷ تا ۱۲۹۸

میں نشستوں کا جو تعین کیا گیا ہے اس کو علیٰ حالہ برقرار رکھا جائے (۱۰) سال بعد اگر پنجاب اور بنگال کے مسلمان چاہیں تو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب یا اس کے ساتھ تعین نشست کے اصول کو قبول کر سکتے ہیں۔ یہ سراسر اقلیت متعلقہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن پست اقوام کے ضمن میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب یا تعین نشست (۲۰) سال کے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے تجربے کے بعد کیا جائے گا یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس فرقے کے لئے راست بالغ رائے دہندگی قائم نہ ہو جائے۔ مرکزی اور صوبہ داری پبلک سروس کمیشن مختلف فرقوں کی ملازمت میں مناسب نیابت کو ملحوظ رکھے گا اس کے علاوہ گورنر جنرل اور گورنروں کو "شاہی ہدایت نامہ" میں اس اصول پر عمل کروانے کا اختیار رہو۔ اگر مجلس مقننہ میں کوئی ایسا مسودہ منظور ہو جائے جس سے کسی فرقے کا مذہب یا مذہبی رسوم متاثر ہوتے ہوں اور اس فرقے کے (۲/۳) اراکین اس کی مخالفت کریں تو گورنر جنرل یا گورنر جیسا کہ موقع ہو اس مسودے کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دے اور ایک سال بعد مقننہ میں پھر سے مباحثہ ہو اور اگر اس مباحثے کے بعد اس مسودے میں تبدیلی یا ترمیمات ہو تو گورنر جنرل۔ گورنر اس کو روک سکتا ہے یا منظور کر سکتا ہے تاوقتیکہ فرقہ متعلقہ کے دو اراکین سپریم کورٹ میں اس مسودے کی بابتہ چیلنج نہ کر دیں اس یادداشت میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ صوبہ سرحد کو گورنر کا صوبہ بنا دیا جائے۔ اور اس کے انتظامات دیگر صوبوں کی طرح انجام پائیں۔ صوبہ واری مجالس مقننہ میں (۱۰) فی صد اراکین سے زائد نامزد نہ ہوں۔ سندھ کو علیحدہ

کرکے انھیں بنیادوں پر گورنر کا صوبہ بنایا جائے جس طرح برطانوی ہند کے دوسرے صوبے ہیں۔ مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نیابت (⅓) ہو۔ کوئی شخص محض اچھوت یا پست اقوام کا فرد ہونے کی وجہ شہری حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ پنجاب یا پست اقوام کے لئے قانون انتقال اراضی کا اطلاق کیا جائے۔ اگر کوئی عاملہ عہدہ دار تعصب برتے یا بے اعتنائی کرے تو گورنر جنرل یا گورنر کو مرافعہ کا اختیار رہے گا۔ فرقہ اینگلو انڈین کا پبلک ملازمت میں خاص لحاظ رہے اور ان کے معیاری زندگی کو ملحوظ رکھا جائے۔ اپنے تعلیمی ادارات کا انتظام خود ان کے سپرد رہے اور ان کو وظائف اور رقمی امداد دی جائے۔ یوروپین فرقے کے لئے جو اصحاب ہندوستان میں پیدا ہوں صنعتی اور تجارتی امور میں ان کے مساوی حقوق ہوں۔

دوسری گول میز کانفرنس میں ہندوستانی لیڈر کسی ایک سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے نشستوں کی تقسیم اور طریقہ انتخاب میں اقلیتوں نے کانگریس سے اختلاف کیا ہندوستان کے دستوری مسئلہ پر بھی ہندوستانی لیڈروں میں سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ مابقی اختیارات صوبوں کے تفویض کئے جائیں لیکن کانگریس کو اس سے اختلاف تھا۔ اقلیتیں تحفظات اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر زور دیتی رہیں اور کانگریس اور مہا سبھا نے اس کی سخت مخالفت کی۔ عمالی لیڈروں نے فرقہ وارانہ نیابت کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ مزدور جماعت ایک منظم معاشی جماعت ہوتی ہے جس میں ہندو مسلمان ملیچھ وغیرہ کا تخیل نہیں۔ فرقہ وارانہ نیابت سے مزدور تحریک کی استقامت ٹوٹ جائے گی۔ انھوں نے پیشو کی

نیابت پر زور دیا۔ عورتیں بھی اقلیت میں شمار کی گئیں اُنھوں نے مردوں کے ساتھ مساوی حقوق کا مطالبہ کیا۔

تیسری گول میز کانفرنس کا اجلاس بمقام لنڈن دسمبر ۱۹۳۲ء کو ہوا۔ اس کانفرنس میں کانگریس نے شرکت نہیں کی۔ اس کانفرنس میں زیادہ سرگرمی نہ تھی اور مسائل حل نہ ہوسکے۔ ان تینوں کانفرنسوں کے بعد قرطاس ابیض شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک پارلیمانی مجلس منتخبہ ترتیب دی گئی جس کی سفارشات پر مسودہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء ترتیب دیا گیا۔

گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں ہندو مسلم نمائندے دستوری مسئلہ پر متفق نہ ہوسکے۔ پنجاب اور بنگال کی مجالس مقننہ میں صرف ایک زاید نشست کے لئے ہندو اور سکھ مندوبین نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مسلمانوں کی مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کی پیش کش کو ٹھکرا دیا[۳۴] اگر یہ پیش کش قبول کرلی جاتی تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی[۳۵] قلمروؤں میں اکثریت کی حکومت کا جو طریقہ رائج ہے اس کو مسلمان اور دیگر اقلیتوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا[۳۶] جملہ ہندوؤں نے بھی متحدہ طور پر جمہوریت کا مطالبہ نہیں کیا۔ پست اقوام کو یہ خوف تھا کہ

---

۳۴ سر سید سلطان احمد سلطنت متحدہ اور ہندوستان کے درمیان ایک معاہدہ صفحہ ۲۰

۳۵ " " " " " " صفحہ ۲۰

۳۶ کیتھ دستوری تاریخ ہند " ۳۰۰

کہیں ایسا نہ ہو کہ جدید دستور میں برہمن اور اعلیٰ ذاتیں اقتدار حاصل کر جائیں اور وہ ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں[۳۷] مسلمان مستحکم مرکزی حکومت کا قیام پسند نہیں کرتے تھے اس لئے کہ مرکز میں ہندو اکثریت ہو گی اور مالی امور اور صوبوں پر عام نگرانی مرکز کے تفویض ہو گی[۳۸] مسلمان صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کی تائید کر رہے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے صوبوں کی از سر نو تقسیم چاہتے تھے جس سے مسلم اکثریت کے صوبے وجود میں آئیں[۳۹] جن دستوری اختلافات کا مظاہرہ گول میز کانفرنس میں ہوا وہ ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھے جب ہندوستان کی خود مختاری کا سوال پیدا ہوا تو فطرتاً اقلیتوں کو تشویش ہوتی کہ آزاد ہندوستان میں ان کا کیا مقام ہوگا۔ اگر جمہوری بنیادوں پر دستور کی تشکیل عمل میں آئے تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں ہی کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ جوں جوں مختلف فرقوں نے آزاد ہندوستان کے تخیل پر قیاس آرائی کی ان کی تشویش بڑھتی گئی۔ اقلیتوں کو خوف اور خطرات محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ اقلیتوں نے حقوق اور تحفظات پر زور دینا شروع کیا۔ کانگریس نے جو کہ قومی تحریک چلا رہی تھی ان مطالبات اور تحفظات کو بالکلیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تقریباً ہر اقلیت نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا مطالبہ پیش کیا۔ جداگانہ

---

[۳۷] کیتھ دستوری تاریخ ہند صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۱

[۳۸] ،، ،، ،، ،، ،، ۲۰۲

[۳۹] ،، ،، ،، ،، ،، ۲۰۱

حلقہ ہائے انتخاب ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں زبردست رخنہ تصور کئے جاتے ہیں چنانچہ کانگریس ان مطالبات کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی لیکن اقلیتیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ان کو ضروری سمجھتی تھیں ان اختلافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے نمایندوں اور کانگریس میں اتفاق نہ ہو سکا۔

ہندو مسلم اختلافات خلافت تحریک ناکام ہونے کے بعد شدید ہو چکے تھے لیکن نہرو رپورٹ پیش ہونے کے بعد مسلمان گھبرا گئے نہرو رپورٹ میں مستحکم مرکزی حکومت کی سفارش کی گئی تھی جس کو مسلمانوں نے پسند نہیں کیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا یہ رجحان تھا کہ حتی الامکان مسلم اکثریت کے صوبے قائم کئے جائیں تاکہ کم از کم چند صوبوں میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے صوبہ سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ اس زمانے میں جو زبردست مسئلہ پیدا ہوا وہ اقتدار کا تھا مسلمان محسوس کر رہے تھے کہ جمہوری نظام کے ذریعہ اقتدار ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا اور بجائے انگریزوں کے آزاد ہندوستان میں ہندوؤں کی غلامی برداشت کرنی ہوگی لیکن مسلمانوں کے حقوق اور تحفظات کے مطالبہ سے ہندوستان کی قومی تحریک کمزور پڑ رہی تھی۔ ہندوؤں کو ڈر تھا کہ صوبوں کی فرقہ وارانہ تقسیم سے ہندوستان میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مسئلہ ان کے علیحدہ وجود اور اقتدار کا تھا اور کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ کل ہندوستان کا مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔ ان دو مسائل میں کوئی ایسا درمیانی راستہ معلوم کرنا جس سے دونوں کو اطمینان ہو جاتا مشکل تھا اور آج بھی یہ مسئلہ پیچیدہ حالت میں

موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے حل تک برطانوی اقتدار کا ہندوستان میں برقرار رہنا یقینی ہے۔ خود بعض فرقے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے برطانوی سامراج کا دامن پکڑ رہے ہیں۔ اقلیتیں جمہوری نظام کی ترویج و توسیع اپنے لئے خودکشی تصور کرتی ہیں۔ کانگریس اصول جمہوریت کی علمبردار ہے ظاہر ہے کہ یہ دو راستے ایک مقام پر نہیں مل سکتے۔ چنانچہ گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ نہ ہو سکا اور پہلے کی طرح برطانوی سامراج کو تقویت حاصل ہو گئی۔

فرقہ وارانہ فیصلہ[*]۔ چونکہ ہندوستانی نمائندے کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے پر نہ پہنچ سکے لہٰذا حکومت برطانیہ نے اپنی جانب سے "فرقہ وارانہ فیصلہ" عطا کیا۔ ملک معظم کی حکومت نے اعلان کیا کہ چونکہ فرقہ واری مفاہمت نہ ہو سکی اس لئے ہندوستان کی آئینی ترقی روکی نہیں جا سکتی۔ اس کے لئے خود حکومت برطانیہ نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ علاوہ ازیں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ قانون منظور ہونے کے بعد بھی اگر اقلیتیں کسی مفاہمت پر پہنچ جائیں تو یہ مسئلہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

مسلمانوں، سکھوں، یوروپینس کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کئے گئے۔ اگر مختلف فرقے باہمی طور پر رضامند ہو جائیں تو دس سال بعد دستور میں نظر ثانی کی جائے گی عام حلقہ ہائے انتخاب میں وہ رائے دہندے رائے دے سکیں گے جو فرقہ واری جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب میں رائے نہ دیتے ہوں۔ مرہٹوں کے لئے بمبئی میں (۷) نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ پست اقوام کے

---

[*] کمیونل آوارڈ

افراد جن کو حق رائے دہی حاصل ہو عام حلقہ ہائے انتخاب میں رائے دے سکتے ہیں۔ چونکہ یہ فرقہ ایک عرصہ تک مناسب نیابت حاصل نہیں کر سکتا۔ لہذا اس کے لئے نشستیں محفوظ ہو جانی چاہئیں۔ پست اقوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق ہوگا۔ بنگال میں پست اقوام کے لئے کم از کم دس نشستیں محفوظ کر دی جائیں گی۔ پست اقوام کے رائے دہندہ کا معیار کمیٹی برائے رائے دہندگی طے کرے گی۔ پست اقوام کے لئے زیادہ سے زیادہ (۲۰) سال تک جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب برقرار رہ سکیں گے۔ ہندوستانی عیسائی اور اینگلو انڈین جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے اپنے اراکین کا انتخاب کریں گے۔ اینگلو انڈین مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان کے لئے پورا صوبہ حلقہ ہائے انتخاب بنایا جائے گا۔ البتہ ان کو ڈاک کے ذریعہ رائے بھیجنے کا اختیار ہو۔ عورتوں کی ہر مجالس قانون ساز میں نیابت ہوگی۔ ان کی نیابت میں یہ بات ملحوظ رہے گی کہ ہر فرقہ کی عورتوں کی نیابت ہو۔ کاروبار، صنعت، کان کنی اور پلانٹرز کے لئے ایوان تجارت اور متعلقہ انجمنیں انتخابات کریں گی۔ زمینداروں کی نشستیں معین کر دی جائیں گی اور ان کے انتخاب میں زمیندار ہی حصہ لے سکیں گے صوبوں کے ایوان بالائی میں مختلف فرقوں کا مناسب توازن ہونا چاہئے سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ مالی اعتبار سے خود مکتفی ہو سکے فرقہ وارانہ فیصلہ میں مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ مرکز میں ان کی (۳۳ ۱/۳) فی صد نیابت ہو اس کا تذکرہ نہ تھا۔ چنانچہ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اعلان کیا گیا کہ ملک معظم کی حکومت وفاقی مرکز میں مسلمانوں کو (۳۳ ۱/۳) فی صد دینے کو تیار ہے۔

میثاق پونا[۱]۔ جب پہلی مرتبہ پست اقوام کو فرقہ وارانہ فیصلے کے بموجب جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کئے گئے تو گاندھی جی اس کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ اس طریقہ سے پست اقوام مستقل طور پر ہندوؤں کی صفوں سے علیحدہ ہو جائیں گے چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف احتجاجاً مرن برت رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پست اقوام اور گاندھی جی میں طریقہ انتخاب کے متعلق مفاہمت ہو گئی جو میثاق پونا کے نام سے موسوم ہے۔ اس میثاق کی ۲۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کو تکمیل ہوئی۔ پست اقوام کے لئے ہر صوبے میں نشستیں معین کر دی گئیں لیکن ان کو عام حلقہ ہائے انتخاب میں رائے دینے کا حق ہوگا۔ صوبہ مدراس میں ۳۰ بمبئی معہ سندھ ۱۵ پنجاب ۸۔ بہار واڑیسہ ۱۸۔ صوبہ متوسط ۲۰۔ آسام ۷۔ بنگال ۳۰۔ صوبہ متحدہ ۲۰ نشستیں محفوظ کی گئیں۔ کل (۱۴۸) نشستیں صوبوں میں پست اقوام کے لئے محفوظ کی گئیں۔

انتخاب کا طریقہ یہ ہوگا کہ ہر ایک نشست کے لئے پست اقوام (۴) امیدوار کا انتخاب کریں گے اور ان امیدواروں کے نام جنرل حلقہ ہائے انتخاب کی فہرست میں شریک کئے جائیں گے۔ اس کے بعد پست اقوام اور ہندو رائے دہندے مل کر ان نتیجہ امیدواروں کا انتخاب کریں گے۔ مرکزی مجلس مقننہ میں بھی پست اقوام کی نیابت کا یہی اصول ہوگا۔ انتخاب کا یہ طریقہ زیادہ سے زیادہ دس سال تک برقرار رہ سکتا ہے تا آنکہ اس کو کوئی فریق باہمی مفاہمت کے ذریعہ نہ توڑ دے کسی شخص کو

---

[۱] امیڈ کر تقسیم ہند صفحات ۲۶۲ تا ۲۶۳

پست اقوام کا فرد ہونے کی وجہ سے ملازمت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں صوبہ داری اور وفاقی مقننہ کی ترکیب "فرقہ وارانہ فیصلہ" پر رکھی گئی ہے۔ یہ فیصلہ حکومت برطانیہ کی جانب سے اس لئے عطا کیا گیا کہ ہندوستانی لیڈر فرقہ واری مسئلہ کا حل پیش نہ کر سکے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ مسلک توازن کی کوشش ہے[۱۴۲]۔ پست اقوام کو جداگانہ نیابت عطا کر کے ان کو مقتدر ہندو طبقے میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی[۱۴۳]۔ ہندو مہا سبھا نے کہا کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے ذریعہ مسلمانوں کی حمایت کی گئی اور ہندوؤں کے ساتھ صریح ناانصافی کی گئی۔ ہندو جن کی تعداد برطانوی ہند میں (۷۵) فی صد تھی ان کو (۴۵) فی صد نیابت دی گئی مختلف فرقوں کو پاسنگ عطا کرنے سے ہندوؤں کی نیابت میں کمی ہو گئی ہندوؤں نے اس فیصلہ کی شدت سے مخالفت کی مسلمانوں کی بعض جماعتوں نے اس سے انکار کیا۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں لیکن مسلمانوں کو پاسنگ حاصل ہو جانے سے ان کو اکثریت حاصل ہوئی اور ہندو اقلیت میں ہو گئے[۱۴۴]۔ بنگال کے ہندوؤں نے میثاق پونا کی مخالفت کی اس لئے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے بموجب پست اقوام کو صرف (۷۱) نشستیں دی گئی تو میثاق پونا کے ذریعہ (۱۴۸) کر دی گئیں۔ میثاق سے بعض

---

۱۴۲ کرشنا مسئلہ اقلیت صفحہ ۲۱۲

۱۴۳ " " " "

۱۴۴ " " " ۲۱۵

ایسے سماجی مسائل منظر عام پر آ گئے جن سے ہندوستان کو کبھی بھی وقت
سامنا کرنا پڑتا[۴۵] جہاں تک کہ فرقہ وارانہ نیابت کا تعلق ہے قرطاس ابیض
میں تسلیم کی تجاویز مسلمانوں کی تائید میں نہیں[۴۶] فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب
کو قرطاس ابیض میں تسلیم کیا گیا۔ فرقہ وارانہ نیابت کی تاریخ برطانیہ کے
مسلک توازن کی تاریخ ہے[۴۷] ہارنے۔ مانٹیگو۔ میکڈانلڈ ہر ایک نے اس
میں ہاتھ بٹایا[۴۸] ایک مرتبہ ہندو پیشہ ور طبقے پر روک تھام کے لئے مسلمانوں
کی تائید کی گئی اور دوسری مرتبہ پست اقوام کی تائید کر کے ہندوؤں کے
خلاف کھڑا کیا گیا[۴۹] ۱۹۰۹ء میں جبکہ ایک مرتبہ فرقہ واریت کی ابتداء
ہوگئی تو وہ طبقات مفادات اور جماعتوں میں آنے لگیں جو حکومت پیدا
کرنا چاہتی تھی۔ حکومت اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کا بہانہ بنا کر فرقہ وارانہ
حلقہ ہائے انتخاب کی تائید کرنے لگی[۵۰]

فرقہ وارانہ فیصلے کے بموجب ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم
اقلیتوں کو پاسنگ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلم اکثریت کے صوبوں میں
ہندو اقلیتوں کو پاسنگ عطا کیا گیا۔ اس لحاظ سے تو فرقہ وارانہ فیصلہ

---

[۴۵] کرشنا مسئلہ اقلیت صفحہ ۲۱۹

[۴۶] 〃 〃 〃 〃

[۴۷] 〃 〃 〃 ۲۲۱

[۴۸] 〃 〃 〃 〃

[۴۹] 〃 〃 〃 〃

[۵۰] 〃 〃 〃 ۲۲۲

حق بجانب تھا۔[۵۱] فرقہ وارانہ فیصلے کے بموجب ہندو صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو حلقہ ہائے انتخاب کے معاملہ میں حق خود ارادیت دیا گیا مگر یہ حق مسلم صوبوں میں ہندو اقلیتوں کو نہیں دیا گیا۔ ہندو صوبوں میں مسلم اقلیت کو یہ حق تھا کہ وہ جس قسم کے انتخابات اپنے لئے پسند کریں منظور کرا سکتے ہیں اور ہندو اکثریت آواز اس معاملہ میں غیر موثر ہوگی۔ لیکن مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم اکثریت کو جس قسم کے حلقہ ہائے انتخاب چاہیں پسند کرنے کا حق دیا گیا اور ہندو اقلیت کو اس معاملہ میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر امیڈکر کا خیال ہے کہ یہاں عدم مساوات نمایاں ہو جاتے ہیں جو ایک بڑی غلطی تھی۔[۵۲]

۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو حکومت ہند نے انڈین سیول سروس اور سنٹرل سبارڈینٹ سرویس کے لئے حسب ذیل قواعد مرتب کئے۔[۵۳]

۱۔ جن جائدادوں پر ہندوستانیوں کے راست تقررات ہوں گے ۲۵ فی صد جائدادیں مسلمانوں کے لئے اور (۸ ۱/۳) فی صد اقلیتوں کے لئے محفوظ رہیں گی۔

۲۔ اگر امتحانی مقابلے یعنی مسابقت کے ذریعہ تقررات ہوں اور مسلمانوں یا دوسری اقلیتوں کو اپنی مقررہ فی صد سے کم جائدادیں حاصل ہوں تو اس کی تلافی بذریعہ نامزدگی کردی جائیگی اگر مقابلے میں مسلمان مقررہ فی صد سے زیادہ حاصل کریں تو

---

۵۱ امیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۹۳

۵۲ ″ ″ ″ ۹۴

۵۳ اقلیتیں اف ایم۔ این دلال صفحات ۱۲۶ تا ۱۲۸

دوسری اقلیتوں کے لئے مقررہ فی صد میں کمی نہیں کی جائے گی
اور اگر دوسری اقلیتیں مقابلے میں زیادہ حاصل کر لیں تو مسلمانوں
کے مقررہ فی صد میں تخفیف عمل میں نہیں آئے گی۔

۳۔ اگر مسابقت یعنی مقابلے کے ذریعہ دیگر اقلیتوں کی مقررہ فی صد
سے کم امیدوار حاصل ہوں اور نامزدگی کے لئے بھی کوئی قابل
اشخاص نہ ملیں تو (۸ ۱/۳) فی صد میں جو بچ جائے گا وہ مسلمانوں
کو دیا جائے گا۔

۴۔ (۸ ۱/۳) فی صد جو دیگر اقلیتوں کے لئے محفوظ کر دیا گیا اس میں
خود اقلیتوں کے لئے کوئی خاص تناسب مقرر نہ ہوگا۔

۵۔ تقررات کے معاملہ میں کم سے کم قابلیت کا لحاظ ہوگا۔

۶۔ پست اقوام کی باقاعدہ نیابت کے لئے ان کے ممتاز امیدواروں
کی پبلک سروسیں پر نامزدگی ہوا کرے گی

ہندو مسلم اختلاف کے حقیقی اسباب

ہندو مسلم اختلافات کی نسبت کئی نظریے پیش کئے گئے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اختلافات حکومت کے پیدا کردہ ہیں خود انگریز تسلیم کرتے ہیں کہ مغل عہد میں فرقہ واری کشیدگی نہ تھی۔[1] حکومت نہ ہندو تھی اور نہ مسلمان[2] مغلوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوؤں کو نظر انداز کر کے ہندوستان میں حکومت نہیں کی جا سکتی اکبر اس حقیقت کو محسوس کر چکا تھا لیکن جب اورنگ زیب نے اس پالیسی سے انحراف کیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو فرقہ اس کا مخالف ہو گیا۔
یہ فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مغل عہد میں بالعموم فرقہ وارانہ

---

[1] آر کوپ لینڈ۔ ہندوستانی مسئلہ جلد اول صفحہ ۳۵

[2] ،، ،، ،، ،، ،، ۳۵

کشیدگی نہ تھی تو اب کیسے پیدا ہوگئی چنانچہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حکومت برطانیہ کی پیدا کردہ ہے ہندوستان سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی یہ ختم نہ ہوگی[۵] در اصل ہندو مسلم اختلافات زیادہ تر ۱۸۵۷ء کے بعد بڑھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک تو وہابی اور آریہ سماج تحریکیں اور دوسرے اردو ہندی اختلافات سے فرقہ واری کشیدگی بڑھنے لگی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ اختلافات کافی بڑھ چکے تھے[۶] صرف ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک بڑی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد رہا۔ لیکن ۱۹۲۳ء کے بعد سے جو اختلافات کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک برابر جاری ہے۔

۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگیا[۷] عدم تعاون کی تحریک کمزور پڑ جانے سے بھی دونوں فرقوں کا اتحاد متاثر ہونے لگا[۸] جن ہندوؤں اور مسلمانوں نے عدم تعاون کی تحریک میں شرکت نہیں کی تھی وہ ملازمتوں کے مسئلہ پر اختلافات پیدا کرنے لگے[۹] موپلا بغاوت کے بعد فرقہ واری کشیدگی بڑھنے لگی جب بلدیہ اور مجالس ضلع میں نشستوں کی از سر نو تقسیم ہونے لگی اور عہدہ داروں کے تقررات ہونے لگے تو اختلافات شدید ہوگئے[۱۰] شدھی اور سنگھٹن، تنظیم اور تبلیغ کی تحریکوں نے فرقہ واری

۶ھ۔ آر۔ کوپ لینڈ۔ ہندوستانی مسئلہ جلد اول صفحہ ۳۵

۷ھ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳۷

۸ھ ہندوستان ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء ؍؍ ۲۵۹

۹ھ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۲۸۸

۱۰ھ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۲۵۸

فضا پیدا کی۔ ہر ایک فرقہ ایک دوسرے کی حرکتوں اور تحریکوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ایک فرقے کی ترقی سے دوسرے فرقوں کو شبہ پیدا ہوتا تھا۔ جو فرقہ پرست تحریک خلافت کے زمانے میں دب گئے تھے وہ پھر سے ابھر آئے مسلمان تجارت میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ذریعہ معاش صرف ملازمت رہ گیا تھا۔ لیکن ملازمت کے معاملہ میں ان کو تعلیم یافتہ ہندو فرقے سے مسابقت کرنی پڑی۔ بیروزگار مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوؤں نے ملازمت کا اجارہ حاصل کر لیا ہے۔ جو خود غرض اشخاص ترک موالات کے زمانے میں طبوس ہو چکے تھے ان کو دونوں فرقوں میں نا چاقی کو بڑھانے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔[۵۸] تعلیم یافتہ طبقہ ذاتی اغراض کے تحت عوام کو گمراہ کرنے لگا۔[۵۹] صرف باجے اور گاؤکشی پر فسادات نہیں بلکہ مقامی اور مرکزی نیابتی ادارات میں نیابت کے مسئلہ پر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی رہی۔ کم از کم اس معاملہ میں عوام کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔[۶۰]

فرقہ وارانہ کشیدگی کا بڑا سبب جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قرار دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ ہر فرقہ ایک دوسرے سے بے نیاز ہو گیا لیکن بعض کو اس سے اختلاف ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے۔ سر عبدالقادر نے

---

۵۸ خطبہ مسٹر گاندھی ۱۹۲۴ء بمقام بلگام

۵۹ خطبات کانگریس خطبہ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۰۴

۶۰ ،، ،، ،، ،، ،، ،،

اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۶ء میں کہا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب پر محمول کرنا" اس سے زیادہ گمراہ کن بات نہیں ہو سکتی[۱۱] مولانا محمد علی نے کہا کہ " مخلوط حلقہ ہائے انتخاب فرقہ وارانہ فسادات کیلئے بہترین میدان کارزار ثابت ہوئے اور دونوں فرقوں میں جو خلیج حائل ہے اس کو اور زیادہ وسیع کر دیتے ایسے انتخاب کے نتائج جس میں دونوں فرقے برابر مقابلے کے ہوں خراب ہوئے اس لئے کہ جو فرقہ اپنے امیدوار کو منتخب کرنے میں ناکام ہوتا وہ اپنے حریف کی کامیابی پر بدظن ہو جاتا[۱۲] ہندو بالعموم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے مخالف رہے۔ یہ اعتراض کیا گیا کہ اس طریقہ نیابت سے انتظاری قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے ہندوؤں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی[۱۳] لیکن مسلمان فرقہ وارانہ نیابت کو اپنے وجود کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اس کو ترک کر دینے سے وہ ایسی حالت میں آجائیں گے جس سے ابھرنا مشکل ہو جائے گا۔[۱۴] ہندوؤں کی قوت رائے دہی بڑھتی ہوئی ہونے سے مسلم امیدواروں کے انتخاب کی امید کم رہتی ہے۔ تجربہ اس کا شاہد ہے[۱۵]۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے وہی

---

[۱۱] بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۲۵۵

[۱۲] خطبات کانگریس خطبہ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۲۲

[۱۳] " " لش نارائن دھر ۱۹۱۱ء صفحات ۲۳ تا ۲۴

[۱۴] سیمن کمیشن جلد سوم توضیحی نوٹ از ڈاکٹر شجاعت احمد خاں صفحہ ۳۲۲

[۱۵] " " " " " " " " "

شخص منتخب ہوتا ہے جو دوسرے فرقوں کے ساتھ عداوت رکھتا ہو[116] مسلمانوں کو یہ خوف دامنگیر تھا کہ چونکہ ہندوؤں کی جانب سے بلدیہ۔ مجالس ضلع یا مجالس مقننہ کے لئے پست اقوام کے نمائندے منتخب نہیں ہوئے تھے لہذا مخلوط انتخابات کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو مقامی مجالس اور مقننات سے مسلمان ختم ہو جاتے اس لئے کہ اس وقت (۹) صوبوں میں یا (۷) صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے[117] جب ہندوؤں کی طرف سے نیابت متناسبہ کی سفارش کی گئی تو یہ جواب دیا گیا کہ اس کے لئے خاص تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اور اقلیتوں کا ایک جگہ ہونا ضروری ہے جس کا ہندوستان میں فقدان ہے۔ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب مخصوص نشستوں کے ساتھ مسلمانوں کو پسند نہ تھے اس لئے کہ ان سے کہا گیا کہ ہندو اپنی اس طرح تنظیم کریں گے کہ مسلمانوں سے بے نیاز ہو جائیں گے اور دوسرے یہ کہ سرمایہ داروں پر ہندوؤں کے اثرات فیصلہ کن ہو جائیں گے[118] مخلوط انتخابات تعین نشست سے ایک طرف ہندو رکن ہندو جماعت کا نمائندہ ہوگا تو مسلمان رکن مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوگا۔[119] اگر مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی مناسب نیابت نہ ہو تو ایک محدود اشرافیہ اقتدار حاصل کر کے اپنے مفاد کے تحت کام کرے گی[120] چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے ہر وقت جداگانہ نیابت کے مطالبے

---

[116] خطبات کانگریس خطبہ مولانا محمد علی ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۲۲

[117] سیمن کمیشن جلد سوم توضیحی نوٹ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صفحہ ۳۲۷

[118] ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ،

[119] ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ،

[120] ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ۳۲۸

ہوتے رہے۔ کل ہند مسلم کانفرنس نے یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو یہ قرارداد منظور
کی تھی کہ جب تک ہندوستان کے موجودہ حالات برقرار ہیں اور رہیں گے۔
مختلف مجالس مقننہ اور آئینی خود اختیاری ادارات میں مسلمانوں کو جداگانہ
حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ اراکین کے انتخاب کا اختیار ہو تاکہ حقیقی نیابتی
جمہوری حکومت کا وجود عمل میں آئے اور اس وقت تک یہ برقرار رہیں جب تک
کہ مسلمانوں کو یقین نہ ہو جائے کہ ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو رہا
ہے[121] فرقہ وارانہ کشیدگی کی تہہ میں طبقاتی کشمکش کام کرتی ہے۔ معاشی مفادات کے
تحفظ کی خاطر مذہب کا دامن پکڑا جاتا ہے۔ ہندو مسلم کشمکش میں معاشی عناصر کام
کرتے ہیں۔ ہندو زمیندار اور مسلمان کسان اور مسلمان زمیندار اور ہندو کسان
ان کے تعلقات میں کشیدگی سے فرقہ پرست لیڈر فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح
ہندو آجر اور مسلمان مزدور اور مسلمان آجر اور ہندو مزدور کی کشمکش بھی فرقہ داری
اختلافات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ہندو مہاجن اور مسلمان کاشتکار اور بعض مرتبہ
مسلمان مہاجن اور ہندو کاشتکار کے تعلقات بھی کشیدگی کا باعث ہوتے ہیں
سودی کاروبار کے سلسلے میں بھی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں بمبئی
میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا اس کے ضمن میں تحقیقاتی کمیٹی نے بتایا کہ یہ پٹھانوں
کے سودی کاروبار کے خلاف ردعمل تھا[122] فسادات کے لئے اندرونی حرکت
معاشی شکایات سے ہوتی ہے[123] ہر مذہب ذات اس لئے سیاسی تنظیم پر مجبور کرے

---

[121] رپورٹ کل ہند مسلم کانفرنس ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۰
[122] ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ از فیڈرلین صفحہ ۵۰
[123] تھامسن اور گیرٹ (ہندوستان میں برطانوی قوت کا عروج اور تکمیل صفحہ ۶۲۳

وہ محسوس کرتے ہیں کہ صرف سورش کے ذریعہ حکومت کو متوجہ کیا جا سکتا ہے[۲۴]۔
اکثر موقعوں پر حکومت سخت قوانین اور نگرانی کے ذریعہ ان کو روک سکتی ہے
لیکن حکومت کی مشاطرانہ خاموشی[۲۵] سے فسادات بڑھ جاتے ہیں۔ کانپور کے
فساد کے سلسلہ میں جو رپورٹ شائع ہوئی اس میں درج ہے کہ ہر طبقے کے گواہ
متفق ہیں کہ فساد کے موقع پر پولیس انجان رہی[۲۶]۔ تھامس اور گیرٹ کا خیال ہے
کہ فرقہ واریت دراصل ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کی اعلیٰ ذاتوں کے معاشی اور
سماجی غلبے کے خلاف بغاوت ہے[۲۷]۔ ہندوستان کے مسلمان انھیں میں سے ہیں
چنانچہ جب اسلام نے ان میں جماعتی شعور اور خودداری پیدا کی جو ہندومت میں
حاصل نہ تھی تو ردعمل پیدا ہونے لگا[۲۸] جس کا اظہار فسادوں کی شکل میں رونما ہوتا
ہے۔ معاشی اور سیاسی اسباب پریشان کن ہوتے ہیں۔ دیہاتوں میں شاید ہی
کوئی ایسا فساد ہوگا جس کی بنیادیں معاشی نہ ہوتی ہوں[۲۹]۔ پنڈت جواہر لال نہرو
کے خیال میں فرقہ وارانہ کشمکش دراصل ملک کے ترقی یافتہ اور پست طبقات
کی کشمکش ہے۔ اس کی وجہ سیاسی نہیں ہوتی لیکن اس کو سیاسی اور مذہبی رنگ
دے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ مذہبی وجوہات نہیں ہوتے لیکن مذہبی جذبات سے فائدہ
اٹھایا جاتا ہے[۳۰]۔ فرقہ داری مسئلہ درحقیقت فی صد۔ مراعات اور نشستوں کا مسئلہ

۲۴۔ تھامس اور گیرٹ (ہندوستان میں برطانوی قوت کا عروج اور تکمیل) صفحہ ۶۲۳
۲۵۔ کرشنا مسئلہ اقلیت " ۲۶۲
۲۶۔ " " " "
۲۷۔ تھامس اور گیرٹ " ۶۲۳
۲۸۔ " " " "
۲۹۔ نشاۃ ثانیہ " ۵۴
۳۰۔ کرشنا مسئلہ اقلیت " ۲۶۲

ہے۔[۳۱] فرقہ واری مسئلہ مختلف مذاہب کے پیشہ ور طبقات کی کشمکش ہے۔[۳۲] فرقہ واری مسئلہ ملازمتوں اور معاشی کا مسئلہ ہے۔ ہندو اور مسلمان ساہوکار میں کشمکش بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہری آبادی میں اس قسم کے اختلافات بہت زیادہ ہیں۔ دیہات میں ابھی یہ کشمکش اتنی شدید نہیں ہوئی۔ شہروں میں سیاسی قوت حاصل کرنے کے لئے مذہب کا نام استعمال کیا جاتا ہے۔[۳۳] ہندوستان میں یہی وجہ ہے کہ سیاسی تبدیلی یا اصلاحات کے نفاذ کے لئے موقع پر شدید فرقہ واری کشمکش شروع ہوتی ہے۔[۳۴] سیاسی تبدیلی سے معاشی مفادات متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے فرقے کے عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب مفادات کو خطرہ لاحق ہو تو پیشہ ور طبقات قدامت پسند لوگوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔[۳۵] اصلاحات اور سیاسی مراعات سے یہ کشمکش شدید ہو گئی۔ علاوہ ازیں مختلف مذاہب کے قدامت پسندوں اور جاہلوں میں مذہبی جذبات کے تحت تنگ نظری ہوتی ہے۔ جاہل ہندو نہ مسلمان کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ جاہل مسلمان ہندو کو سمجھنے کی۔[۳۶] نام نہاد سیاسی لیڈر عوام کو مشتعل کر کے فساد پیدا کرتے ہیں۔ جو مطالبات مختلف فرقوں کی جانب سے پیش ہوتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ اونچے متوسط طبقے

۳۱؎ کرشنا مسئلہ اقلیت صفحہ ۲۷۸

۳۲؎ " " " " "

۳۳؎ " " " ۲۸۶

۳۴؎ تھامس اور گیرٹ " ۶۰۲

۳۵؎ کرشنا مسئلہ اقلیت " ۲۹۲ — ۳۶؎ مشاردہ صفحہ ۳۸

کے لئے ملازمت کے مطالبات ہیں اور یہ اپنے فرقے کے عوام کے نام پر حاصل کئے جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ مال غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ بن گیا ہے۔ تیسری حکمران جماعت اس کی تقسیم سے اختلافات بڑھاتی ہے[۳۷]۔

ہندو مسلم فسادات پست طبقات میں بہت کم ہوتے ہیں۔ سر تھیوڈور ماریسن نے ۱۸۹۹ء میں لکھا کہ ہندو مسلم دشمنی ان طبقات میں بہت زیادہ ہے جو انگریزی راج کی پیداوار ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات ان مقامات پر شاذ ہی ہوتے ہیں جو پست کہلاتے ہیں[۳۸]۔ وکلاء اور مدرس دونوں فرقوں میں اختلافات پیدا کرتے ہیں[۳۹]۔ ماریسن نے لکھا ہے کہ "ہم نے ہندوستان میں کبھی ایک قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہایت تہی کے ساتھ جو ادارات قائم کئے ہیں ان میں انتشاری رجحان پایا جاتا ہے[۴۰]۔" یہ بھی خیال ظاہر کیا گیا کہ عمومی ادارات سے اختلافات بڑھتے ہیں[۴۱]۔ ماریسن نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ انگریزوں کی حالیہ پالیسی سے بالعموم ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی ہے[۴۲]۔ یہی وجہ ہے کہ دیسی ریاستوں کی بہ نسبت برطانوی ہند میں ہندو مسلم اختلافات شدید ہیں[۴۳]۔ چنانچہ آج بھی دیسی ریاستیں اس قسم کے فسادات

---

۳۷ جواہر لال نہرو۔ میری کہانی صفحہ ۱۳۷

۳۸ ہندوستان میں شہنشاہی حکومت صفحہ ۷

۳۹ 〃 〃 〃 〃 ۷

۴۰ 〃 〃 〃 〃 ۷ اور ۸

۴۱ 〃 〃 〃 〃 ۱۴

۴۲ 〃 〃 〃 〃 ۱۶

۴۳ خطبات کانگریس خطبہ ۱۹۲۴ء 〃 ۲۷۰

زیادہ متاثر نہیں۔ یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات فرقہ پرست لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں۔ تقریباً ہر سیاسی جماعت میں اعلیٰ طبقات مثلاً جاگیردار۔ زمیندار اور سرمایہ دار حاوی ہوتے ہیں۔ جب کبھی نفاذ اصطلاحات زمانہ آیا یہ اونچا طبقہ چونک اٹھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہونے والی سیاسی تبدیلی میں نہ معلوم سابقہ مراعات برقرار رہیں گی یا نہیں اور ان کے مفادات کا تحفظ ہوگا یا نہیں چنانچہ اعلیٰ طبقات اپنے فرقوں کے نام سے اپنے مطالبات میں عوام کی بہبودی اور خوش حالی کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے۔ وہ صرف اونچے طبقے کے مفادات کے تحفظات سے لبریز رہتے ہیں۔ ہر فرقہ کا اعلیٰ طبقہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ مجالس مقننہ یا عمومی جماعتوں میں زیادہ نشستیں حاصل کرکے اپنے مفاد کا تحفظ کرسکتا ہے۔ ان طبقات کو اپنے فرقے کے عوام سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہمدردی یہ طبقے محض ان کے نام پر اپنے مفادات کو پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے فرقہ وارانہ کشیدگی مختلف فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کے مفادات کا تصادم ہوتا ہے۔ یہ دراصل فرقہ وارانہ نظام سرمایہ داری کی باہم کشمکش اور مسابقت ہے۔ اس کا مختلف فرقوں کے عوام سے اتنا زیادہ تعلق نہیں۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فرقہ پرست لیڈروں میں سرمایہ دار پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جب سیاسی تبدیلی کا اعلان ہوتا ہے تو ان کو خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے حقوق اور مفادات کو نقصان پہنچے۔ ہر گروپ میں انتہا پسندوں کی ایک جماعت رہتی ہے جو اپنے مطالبات کو دوسروں کے مطالبات پر فوقیت دیکر منوانا چاہتی ہے۔[۴۴]

---

(۴۴) میری کہانی صفحہ ۱۴۰

ہندو مسلم اختلافات کی نسبت ایک اور اہم نظریہ پیش کیا گیا۔
ہے وہ یہ کہ ہندو اور مسلمان علیحدہ علیحدہ قومیت ہیں جن کا نہ صرف مذہب
بلکہ تہذیب و تمدن بھی مختلف ہے۔ مسٹر ساورکر اور مسٹر جناح دونوں یہی
کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے احمد آباد
کے اجلاس میں اور کلکتہ کے اجلاس ۱۹۳۹ء میں مسٹر ساورکر نے کہا کہ
ہندو مسلمان علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے
سالانہ جلسے میں مسٹر جناح نے کہا "ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی فلسفے
سماجی رسوم اور ادب کے حامل ہیں۔ نہ وہ آپس میں شادی کرتے ہیں اور
نہ ایک ساتھ کھاتے ہیں اور حقیقت میں ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں
سے ہے جن کی بنیادیں محض متضاد خیالات اور تخیلات پر ہیں۔ زندگی کے
متعلق ان کے زاویہ نگاہ میں فرق ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہندو
اور مسلمان مختلف تاریخ کے ماخذوں سے جذبات حاصل کرتے ہیں۔ ان کے
روایات مختلف اور ہیرو مختلف ہیں اور اکثر ایک کا ہیرو دوسرے کا
دشمن اور یہی حال ان کی فتوحات اور شکستوں کا ہے[۴۵] مسٹر جناح اکثر یہ
کہا کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں میں تاریخ۔ آرٹ۔ طرز تعمیر۔ موسیقی۔ قانون
عدل گستری اور زندگی کے ہر شعبہ میں اختلاف ہے۔ مسلمانوں کا نقطۂ نظر
بالکل جداگانہ ہے بلکہ اکثر ہندوؤں کے سراسر خلاف ہے۔ زندگی کی کوئی
کڑی آپس میں مربوط نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے نام اور غذا بھی مختلف ہے
مسلمانوں کی معاشی زندگی تعلیمی خیالات عورتوں کے ساتھ سلوک۔ جانوروں

---

۴۵ چند حالیہ تقاریر و تحریرات مسٹر جناح از جمیل الدین احمد صفحہ ۱۵۳

کے ساتھ رجحان ان سب چیزوں میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔ مسلمان گائے کھاتے ہیں اور ہندو اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ایک خیال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگرچہ ایک پنجابی ہندو اور مدراسی ہندو کی ظاہری ہیئت میں کافی فرق ہوگا لیکن، دونوں ہندو ہیں۔ ان دونوں کے تمدن میں حقیقی ربط ہے۔ دونوں نے رامائن اور مہا بھارت کی کہانیوں میں نشو و نما پائی ہے دونوں نے مندروں میں ایک ہی قسم کی مورتیاں دیکھی ہیں[۶۶] نہ صرف ہندو ڈرامہ بلکہ ہندو شاعری طرز تعمیر ناچ وغیرہ میں مذہب حاوی رہتا ہے[۶۷] کسی ملک میں بھی تمدن پر مذہب کا اتنا گہرا اثر نہیں جتنا کہ ہندوستان میں ہے[۶۸] تمدن کا مذہب سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف تمدن اس وقت ایک ہو سکتے ہیں جبکہ مختلف مذاہب ایک ہو جائیں[۶۹] صدیوں سے ہندومت۔ عیسائیت اور اسلام ایک ساتھ رہے لیکن ایک نہ بن سکے اپنے علٰحدہ تمدن کے بموجب وہ علٰحدہ ہی رہے[۷۰] ایک اعتراض اس استدلال پر یہ حقیقت کیا جاتا ہے کہ امریکہ میں کئی اقوام ہیں اور ایک ساتھ پُرامن زندگی بسر کرتی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یورپی تمدن ایک ہے۔ گانا ڈرامہ شاعری، اور تمدن میں مشترک عناصر ملتے ہیں[۷۱]

۶۶؎ اپا سوامی۔ تمدنی مسئلہ صفحات ۳ و ۴

۶۷؎ " " " " ۴

۶۸؎ " " " " "

۶۹؎ " " " " ۵

۷۰؎ " " " " ۶

۷۱؎ " " " " ۶ ، ۷

یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں یوروپ کی کئی قومیں ایک بن سکیں۔ ہندوستان کے حالات مختلف ہیں۔ مختلف تمدن صدیوں سے ہندوستان میں ایک ساتھ رہے لیکن ایک نہ ہو سکے۔[52] ہندوستان میں مختلف تمدنوں کا انضمام نہ ممکن ہے اور نہ اس کی خواہش موجود ہے۔[53] پروفیسر کوپ لینڈ کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اختلاف بنیادی طور پر تمدنی تصادم ہے اور دو ایسے مذاہب میں تصادم ہے جن کے زندگی کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔[54]

مسلمانوں کے اکثر ہیرو ہندوؤں کے دشمن رہے ہیں اور ہندوؤں کے ہیرو مسلمانوں کے دشمن رہے ہیں۔ مسلمان قرآن اور حدیث سے زندگی حاصل کرتے ہیں تو ہندو گیتا رامائن اور مہابھارت سے۔[55] اس لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی میں بڑا زبردست فرق ہے۔ اتحادی عناصر سے زیادہ ان میں اختلافات ملتے ہیں۔[56] ڈاکٹر امبیڈکر کے خیال میں اتحاد اس لیے ناممکن ہے کہ یہاں کی زبان۔ نسل۔ مذہب وغیرہ میں تنوع پایا جاتا ہے انگلستان۔ فرانس۔ اٹلی۔ جرمنی کے مختلف لوگ ایک قوم بن سکے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں نسل۔ مذہب اور زبان ایک تھی اسٹریا۔ ہنگری۔ چیکو سلاواکیہ اور ترکی اس لئے متحد نہ ہو سکے کہ یہاں مختلف نسل زبان اور

---

۵۲ اپا سوامی ۔ تمدنی مسئلہ صفحات ۷، ۸

۵۳ " " " ۸

۵۴ آر کوپ لیڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۱۴

۵۵ امبیڈکر تقسیم ہند " ۱۰

۵۶ " " " " ۱۸

مذاہب تھے۔[۵۶] ہندوستانیوں میں نہ اتحاد کا جذبہ ہے اور نہ ضم ہونے کا ایک لباس پہننے کا اور نہ ایک زبان بولنے کا ایک بنگالی بنگالی ہونے پر ایک مدراسی ہونے پر اور ایک پنجابی پنجابی ہونے پر فخر کرتا ہے قومی مقصد کے لئے ایثار کا جذبہ موجود نہیں[۵۷] اگر ہندو ترقی کرتے ہیں تو مسلمان گھبراتے ہیں۔ یہ بقا اور وجود کی کشمکش ہے[۵۸] ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں[۶۰] اختلافات کی ایک مثال یہ بتائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کی ساری دلچسپی اسلامی ممالک سے ہے۔ مسلمان اپنے آپ کو پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی کہتا ہے۔ سر عبدالرحیم نے کہا تھا کہ جب مسلمان افغانستان۔ ایران۔ عربستان اور ترکوں کے ملک میں سفر کرتا ہے تو اپنے آپ کو وطن میں محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ ہندوستان میں اپنے آپ کو سماجی حالات کے اعتبار سے غیر پاتا ہے۔[۶۱] چنانچہ ڈاکٹر امبیڈکر[۶۲] نے لکھا ہے کہ ہندو مسلم اختلاف مادی ہی نہیں بلکہ روحانی بھی ہے[۶۳] اس کی تہہ میں تاریخی۔ مذہبی۔ تمدنی اور سماجی اختلاف موجود ہیں جن کا سیاسی اختلاف پرتو ہے[۶۴] ایک ہندو۔ عیسائی ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ مسلمان

---

۵۶ امبیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۱۶۸

۵۷ 〃 〃 〃 ۱۶۹

۵۸ 〃 〃 〃 ۲۳۶

۶۰ 〃 〃 〃 ۲۳۰

۶۱ شاد و تمنہ 〃 ۳۷

۶۳ امبیڈکر تقسیم ہند 〃 ۲۲۴

۶۴ 〃 〃 〃 〃

ہو جائے تو فرقہ وارانہ فساد یقینی ہے[۶۴]۔ جب اسلام اور ہندو مت عقائد میں متبائین ہیں تو سماجی اتحاد بھی ناممکن ہے[۶۵]۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی رسوم ایک دوسرے کے لئے نفرت کا باعث ہیں۔ ان کے تمدن ان کے ادب اور ان کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہیرو علیحدہ ہوتے ہیں۔ ہندو اپنے زرین عہد کو یاد کرتے ہیں جبکہ مسلمان ہندوستان نہیں آئے تھے اور مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم نے ان پر حکومت کی ہے[۶۶]۔ ہندوستانی قومیت کے آغاز سے ہندو مسلم اختلافات شروع ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے انگریزوں کے جانے کے بعد ان کی جگہ کون لے گا ہندو مسلم اختلافات کی نسبت ایک اور نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے۔ الحمزا امنا حسب نے اپنی کتاب "پاکستان ایک قوم" میں لکھا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے آب وہوا کے لحاظ سے ان علاقوں سے مختلف ہیں جہاں ہندو اکثریت میں ہیں[۶۷]۔

قوم پرست لیڈروں کو ایک نظریہ سے قطعی اختلاف ہے کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں اور دو علیحدہ علیحدہ تہذیب و تمدن کی علمبردار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی کا مذہب اور تمدن سے کوئی تعلق نہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو کا خیال ہے کہ فرقہ واری مسئلہ کا

۶۴۔ اسیڈ کر تقسیم ہند صفحہ ۳۲۲

۶۵۔ ” ” ” ۳۲۵

۶۶۔ آر کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۱۷

۶۷۔ ” ” ” ” ۱۸

مذہب سے بہت کم تعلق ہے۔ یہ اعلیٰ متوسط طبقات کا بیا ہی مسئلہ ہے
جس کو حکومت برطانیہ نے قومی تحریک کو کمزور کرنے کے لئے پیدا کیا ہے
یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مذہب کی بناء پر دنیا میں قومیں نہیں بنتی ہیں۔
دنیا کی تقریباً ہر بڑی مملکت میں کئی مذاہب اور نسل کے لوگ بستے ہیں
لیکن اس کی بناء پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مملکتوں میں مختلف قومیں بستی
ہیں۔ اس مکتب خیال کا کہنا ہے کہ ایک مدراسی مسلمان کا تمدن اور
عادات و اطوار اور ایک سرحدی مسلمان کے تمدن کے عادات و اطوار
میں بہت بڑا فرق ہے۔ مدراسی ہندو اور مدراسی مسلمانوں میں حقیقی تمدنی
و لسانی ربط پایا جاتا ہے اور اسی طرح ہر صوبے کے ہندوؤں اور مسلمانوں
میں تمدنی اور لسانی ہم آہنگی موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کا
تمدن بڑی حد تک صوبہ واری ہے اور یہ ہندو مسلم علیحدہ علیحدہ تمدن
ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی بندھن نہایت
مستحکم ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں میں ظاہری طور پر تمدنی ہم آہنگی
نہ بھی ہو تو کم از کم مذہب ایک ایسی بندھن ہے جو کبھی ان کو دنیا کے
کسی مسلمان سے جدا نہیں ہونے دے گی۔ نفسیاتی احساس اور جماعتی شعور
ہر مسلمان میں پایا جاتا ہے چاہے وہ دنیا کے کسی گوشہ میں کیوں نہ رہتا ہو
معاشی تمدنی اور مذہبی اختلافات سے زیادہ شدید اختلافات
ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد
فرقہ وارانہ فسادات شدت سے ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں
فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف خوف اور عدم اعتماد پایا جاتا تھا۔
سوال یہ تھا کہ سوراج ملنے کے بعد مسلمانوں کی کیا حیثیت ہوگی۔ ایک شخص

مسلمان اقلیت میں ہیں دوسرا تعلیمی اور معاشی حالت ہندوؤں سے گری ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے گا۔ جمہوری حکومت اکثریت کی حکومت ہوتی ہے تو مسلمانوں نے سوچا کہ اس طرح ہندو راج قائم ہو جائے گا۔ اس چیز کو سرسید بھی محسوس کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندوستان میں نیابتی اداروں کی ترویج کی مخالفت کی مسلمان سوراج کے حصول کے لئے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے تھے جب تک کہ انکا مستقبل محفوظ نہیں ہو جاتا۔[68] مولانا محمد علی نے کوکناڈا کانگریس میں کہا کہ وہ ہم آزادی اور خود مختاری کے راستہ پر بہت کچھ آگے نکل گئے ہوتے اگر اقلیتوں کو جس قافلہ میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے کامل اطمینان ہو جاتا۔[69] چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی تسلیم کیا کہ آزادی کی کشمکش میں واضح نصب العین اور مقاصد نہ ہونے کی وجہ سے فرقہ واریت پھیلنے لگی[70] عوام نے دیکھا کہ ان کی روزمرہ مصیبتوں اور سوراج کی جنگ میں کوئی خاص تعلق نہیں[71] مسلمان اور دیگر اقلیتیں جب یہ سوچتی کہ آزاد جمہوری نظام میں ان کا کیا مقام ہوگا تو ان کو بے اطمینانی اور خوف لاحق ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس خوف کے تحت ہندوؤں نے پنجاب میں جہاں کہ ان کی

---

[68] ہندوستان ۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۰۰

[69] خطبات کانگریس ،، ۶۸۵

[70] نہرو۔ میری کہانی ،، ۱۳۷

[71] ،، ،، ،، ،،

اقلیت اور مسلمانوں کی اکثریت ہے سنگھٹن کی تحریک شروع کی اور جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے انھوں نے تنظیم کی تحریک شروع کی۔[32] مسٹر سی آر۔ داس نے کانگریس کے اجلاس ۱۹۲۲ء میں کہا کہ مختلف فرقوں کے حقوق کا اعلان کر دینا چاہیئے جو ان کو آزاد ہندوستان میں حاصل ہوں گے کانگریس کو مختلف فرقوں میں مفاہمت کرانا چاہیئے اور ہر اقلیت کے حقوق کو واضح طور پر تسلیم کرنا چاہیئے تاکہ خوف اور شبہات رفع ہو جائیں۔[33]

مسٹر گاندھی کا خیال ہے کہ بعض مسلمان کلیتاً اسلامی حکومت اور بعض ہندو کلیتاً ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ناکامی کی صورت حکومت برطانیہ کے تحت رہنا پسند کرتے ہیں[34] پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے کہ فرقہ پرست گروہ بیرونی حکومت کو اپنے مخصوص فائدے کی خاطر برقرار رکھنا چاہتا ہے[35] بیرونی حکومت اور فرقہ پرست سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے بلکہ وہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ملک کے معاشی مسائل کو حل نہ کر سکے اس لئے کہ انکے حل ہو جانے سے سارا سماجی ڈھانچہ بدل جائے گا جس سے ان کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔[36]

---

[31] ہندوستان ۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء صفحہ ۲۲۳

[32] خطبات کانگریس ،، ۵۲۸

[33] خطبہ ۱۹۲۲ء از مسٹر گاندھی

[34] نہرو کا چیلنج صفحات ۲۳ تا ۲۴

[35] ،، ،، ،، ،، ،,

ہندو مسلم اختلافات ہندوستان کے دستوری مسئلہ کے متعلق بہت زیادہ شدید رہا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے قریب مسلمانوں کا یہ مطالبہ تھا کہ مابقی اختیارات صوبوں کو تفویض کئے جائیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر یہ اختیارات مرکز کو حاصل ہو جاتے تو ہندو اقتدار کو استحکام پہنچتا چنانچہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ کم از کم جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں اپنے اقتدار کا استعمال کریں۔ مرکز کو مابقی اختیارات سونپ دئیے جانے سے مسلم اکثریت کے صوبے مکمل طور پر آزاد نہیں رہ سکتے تھے۔ صوبوں پر مرکز کی نگرانی ہوتی اور جمہوری اصول کے تحت ہندوؤں کو مرکز میں غلبہ حاصل ہو جاتا اسی وجہ سے مسلمان مابقی اختیارات صوبوں کے تفویض کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ نہرو رپورٹ میں اس وجہ سے بھی مخالفت کی گئی کہ اس میں مرکزیت پر زور دیا گیا تھا۔ در اصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اور دستوری مسئلہ پر اختلافات بہت زیادہ ہیں اس وقت صورت حال یہ ہے کہ انگریزی حکومت ہاتھ سے اقتدار منتقل ہو جانے کی صورت میں نہ ہندو مسلمانوں کی حکومت تسلیم کریں گے اور نہ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کریں گے اور نہ مسلمان ہندوؤں کی حکومت کے تحت رہنا پسند کریں گے۔ ہندوؤں کو یہ خدشہ ہے کہ اگر باہر کے مسلمان ہندوستان پر حملہ کر دیں تو ہندوستانی مسلمان ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔ چنانچہ لالہ جپت رائے نے اپنے ایک مکتوب بنام مسٹر سی۔ آر۔ داس کو لکھا "پچھلے چھ ماہ کے دوران میں میں نے اپنا بیشتر وقت مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی شریعت کے مطالعہ پر صرف کیا اور میں یہ خیال کرنے پر مائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہے نہ قابل عمل ہے مسلمانوں کے جو لیڈر عدم تعاون میں شریک ہیں

ان کے خلوص کو مانتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب ہندو مسلم اتحاد کی قسم ہر چیز کے لئے موثر رکاوٹ پیش کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ہندوستان میں حکیم صاحب (حکیم اجمل خاں) سے زیادہ عمدہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ یا کوئی اور مسلمان لیڈر قرآن کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگرچہ ہم برطانیہ کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں لیکن ہم جمہوری اصولوں پر ہندوستان کی حکومت کے لئے متحد نہیں ہو سکتے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ میں سات کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان کے ساتھ افغانستان۔ وسط ایشیا۔ عرب۔ عراق۔ اور ترکی کی مسلح غول ایسے ہوں گے جن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس کا قائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے نیز ہندو مسلم اتحاد مناسب ہے۔ میں مسلم لیڈروں پر بھروسہ کرنے کے لئے بھی پورے طور پر تیار ہوں لیکن قرآن اور حدیث کے احکام کا کیا ہوگا؟ مسلم لیڈر ان قوم احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تو کیا ہمارا انجام تاریک ہے؟ میں امید کرتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا فاضلانہ ذہین اور عالمانہ دماغ اس دشواری سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ تلاش کرے گا۔[۱]

اس مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے کتنا خوف تھا

---

[۱] بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۱۹۰

لالہ پت رائے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور نیک نیتی کے ساتھ اس کے متمنی تھے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنے شرعی احکام کی بنا پر ہندوؤں سے اتحاد نہیں کرے گا۔ دوسرے ان کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ مسلمان ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر جہاد کر دیں گے اور پھر اسلامی ممالک ہندوستان پر حملے کریں گے۔ ان کو خوف تھا کہ جمہوری حکومت کی مسلمان شدومد سے مخالفت کریں گے اور اگر یہ قائم بھی ہو جائے تو مسلمانوں کی وفاداری حکومت کے ساتھ نہیں ہوگی۔ چنانچہ اسی قسم کا خطرہ لالہ ہردیال نے بھی ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء کو اپنے ایک مضمون پرتاب میں ہندوؤں کو ہدایت[1] کی تھی کہ اگر ہندو اپنا تحفظ چاہتے ہیں تو ان کو سرحد اور افغانستان فتح کرنا ہوگا اور قبائل کو ہندومت میں شریک کرنا ہوگا۔ پہاڑی قبائل جنگجو اور بھوکے ہیں اگر وہ ہندوؤں کے دشمن ہو جائیں تو نادرشاہ اور زمان شاہ کا عہد پھر سے شروع ہو جائے گا۔ اگر احتیاط نہ برتی جائے تو سوراج حاصل کرنا بیکار ہو جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حالات کے تحت ہندو لیڈر ہندوستان کی مکمل آزادی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء کو مولانا حسرت موہانی نے کانگریس کے اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی لیکن مسٹر گاندھی کی مخالفت سے یہ منظور نہ ہو سکی۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس نے بھی ۱۹۲۵ء کو صوبہ واری کانفرنس بنگال میں مکمل آزادی سے اختلاف کیا اور ہندوستان کے لئے قلمروی درجہ مناسب قرار دیا۔ خود نہرو رپورٹ

---

[1] امیدکر تقسیم ہند صفحہ ۱۷۰

میں قلمروی درجے کی تائید کی گئی۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ ہے کہ آزاد ہندوستان مسلمانوں کے حملہ کا شکار ہو جائے گا۔ ایک طرف تو ہندوؤں کو مسلمانوں سے خوف ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو ہندو راج کا خوف ہے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۳۹ء کو مولانا آزاد سبحانی نے سلہٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا[۵۷] کہ ہماری زبردست لڑائی ۲۲ کروڑ ہندوؤں سے ہے جو ہمارے دشمن ہیں (۴½) کروڑ انگریز طاقت حاصل کر کے تقریباً ساری دنیا نگل چکے ہیں۔ (۲۲) کروڑ ہندو جو تعلیم میں آگے ہیں عقلمند اور دولت مند ہیں اگر طاقتور ہو گئے تو یاجوج ماجوج کی طرح مسلم ہندوستان۔ مصر۔ ترکی۔ کابل۔ مکہ۔ مدینہ اور دوسرے اسلامی ممالک کو نگل جائیں گے۔ اگر ہندو جو اسلام کے دشمن ہیں ان سے ہم مقابلہ نہ کریں تو نہ صرف رام راج قائم کردیں گے بلکہ ساری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ ہم کو انگریزوں سے زیادہ ہندوؤں کا مقابلہ کرنا ہے ۲۲ کروڑ ہندوؤں کے ہاتھ میں عالم اسلام محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں معاشی۔ مذہبی و سماجی اختلافات سے زیادہ شدید سیاسی اختلافات ہیں۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو خطرہ سمجھتے ہیں مسلمانوں کو ہندو راج کا خوف تو ہندوؤں کو اسلامی ممالک کے حملوں کا خدشہ لاحق ہے۔ ڈاکٹر مونجے نے ۱۹۳۶ء میں مہا سبھا کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا "ہندو مہا سبھا کا مقصد یہ ہے کہ تمام ہندوؤں کو متحد کردے اور ہندو دھرم کو اتنی ترقی دے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں ہندوستان کہلا یا جا سکے یعنے

---

[۵۷] اسپیدکر تقسیم ہند صفحہ ۲۶۵

ہندوؤں کا ملک ہے"[۲۹] دوسری طرف دسمبر ۱۹۳۶ء کو جمعیت العلماء کے سرگرم رکن مولینا احمد سعید نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہندو اکثریت موجودہ ذہنیت کے ساتھ اس قابل نہیں کہ اقلیت کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے"[۳۰]

ان حالات کے تحت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ایڈ کر نے لکھا ہے کہ "ہندو مسلم اتحاد اب تک کم از کم نظر آ رہا تھا اگرچہ وہ ایک سراب سے زیادہ نہیں تھا۔ آج وہ نہ صرف نظر سے بلکہ دماغ سے غائب ہے"[۳۱] اس کے باوجود بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو سکتا ہے اگر دونوں فرقوں کی جانب سے ایثار کیا جائے ان کا کہنا ہے کہ جب انگریزوں کے ہندوستان آنے سے قبل اتحاد موجود تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اب اتحاد نہ ہو سکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صورت حالات اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر اتحاد ناممکن نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا آسان مسئلہ نہیں رہا جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا مطلب سماجی اتحاد نہیں رہا بلکہ سیاسی اتحاد ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اکثر دیہاتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر صوبوں میں لسانی اور تمدنی اعتبار سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشکل سے تمیز ہو سکتی ہے لیکن بڑا اختلاف سیاسی اور آئینی مسائل پر پیدا ہوتا ہے۔ ہندو

---

[۲۹] بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۲۰۱

[۳۰] " " " ۲۰۲

[۳۱] ایڈ کر تقسیم ہند " ۱۲۰

اس وقت مسلمانوں کی حکومت تسلیم نہیں کر سکتے اور نہ مسلمان ہندوؤں کی حکومت تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اصل مسئلہ اقتدار حاصل کرنے کا ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں فرقے ٹکرا رہے ہیں۔ مملکت کا اقتدار تقسیم نہیں ہو سکتا ہر ایک فرقہ اقتدار اعلیٰ پر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ واحد اور غیر منقسم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کو پورا پورا نہیں مل سکتا۔ مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ شمال مغربی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان میں ان کی آزاد مملکتیں قائم ہو جائیں اور بقیہ ہندوستان ہندوؤں کے سپرد کر دیا جائے۔ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ سماجی نہیں رہا۔ اب اقتدار کا مسئلہ بن گیا ہے اور ہر فرقہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔ در اصل ہندو مسلم مسئلہ ہندوستان میں حالیہ جمہوری حکومت کے پیدا کردہ مسائل میں سے ایک ہے۔

مسئلہ اقلیت کی موجودہ صورت حال

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اپنی اپنی وجوہ کی بناء پر ناکافی اور غیر تشفی بخش قرار دیا۔ ان دونوں جماعتوں نے مجوزہ اصلاحات میں وفاق کا جو خاکہ پیش کیا گیا تھا اس سے سخت اختلاف کیا۔ حکومت نے شہنشاہی مقاصد سے عہدہ برا ہوتے کے لئے اہم امور مثلاً دفاع۔ امور خارجہ مالیات وغیرہ کے محکمے اپنے تحت رکھ لئے تھے چنانچہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اعتراض کیا کہ مرکزی حکومت کو مکمل اختیارات نہیں دئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں جب مسودہ قانون حکومت ہند دارالعلوم میں پیش ہوا تو اس میں ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کی طرح کوئی علیحدہ "تمہید" نہ تھی۔

ہندوستانیوں کو شبہ پیدا ہوا کہ ایک اہم مسئلہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن برطانوی مدبرین نے اطمینان دلایا کہ چونکہ کسی جدید پالیسی کی ابتدا مقصود نہیں تھی لہذا ۱۹۱۹ء کی تمہید برقرار رکھی گئی۔ بڑی حد تک مسلم لیگ اور کانگریس نے دستور کے صوبائی جزسے اتفاق کر لیا۔ البتہ گورنروں کو خصوصی ذمہ داری سے عہدہ براہونے کے لئے انفرادی فیصلے اور اختیار تمیزی کا جو حق دیا گیا کانگریس نے اس سے اختلاف کیا۔ کانگریس کی جانب سے یہ اعتراض ہوا کہ جب وزرار کو انصرام نظم ونسق میں مکمل عاملانہ اختیارات دئے جا رہے ہیں تو گورنروں کے خصوصی اختیارات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ علاوہ ازیں کانگریس کو "فرقہ وارانہ فیصلے" سے بھی اختلاف تھا۔ اقلیتوں کو گورنروں کے خصوصی اختیارات سے اختلاف نہیں تھا اس لئے کہ گورنروں کے خصوصی اختیارات کے تحت اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ بھی شامل تھا۔ اقلیتیں تحفظات اور حقوق پر زور دیتی تھیں لیکن ان کے مطالبات سے ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے صحت مند ارتقاء میں زبردست رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ نشستوں کا تعین جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب" گورنروں کے خصوصی اختیارات وغیرہ مندرانہ حکومت کے قیام میں مشکلات پیدا کر رہے تھے اقلیتیں کسی ایسے دستور کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھیں جس میں ان کے مفادات کا تحفظ اور حقوق کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ خود مسلم لیگ تحفظات کی خواہاں تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء کے لکھنؤ والے اجلاس میں مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی کہ گورنروں نے مسلمان اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے حاصل شدہ اختیارات کو استعمال میں نہ لاکر اپنی کمزوری کا اظہار کیا ہے۔ لہذا لیگ

ان کے اس طرزِ عمل کی مخالفت کرتی ہے۔[1] ہندوستان کے دستوری اور سیاسی مسائل نہایت ہی نازک اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ جو امور قومی نکتہ نظر سے مفید تصور کئے جاتے ہیں اقلیتیں ان کو اپنے مفاد اور تحفظ کے منافی سمجھتی ہیں۔ کانگریس کو فرقہ وارانہ فیصلے اور گورنروں کے خصوصی اختیارات سے سخت اختلاف تھا لیکن اقلیتیں اپنے وجود کے لئے ان کو ناگزیر قرار دیتی تھیں غرض کہ ہندوستان کے دستوری مسائل دنیا کے نہایت ہی پیچیدہ مسائل ہیں۔

باوجود اس کے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے مجوزہ دستور حکومت ہند سے اختلاف کیا لیکن دونوں نے انتخابات کی مہم میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کو یہ خوف تھا کہ اگر وہ انتخابات میں حصہ نہ لے گی تو کانگریس کو اور زیادہ اقتدار حاصل ہو جائے گا اور لیگ کی رہی سہی قوت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف کانگریس کو یہ خدشہ تھا کہ اگر وہ انتخابات کی مہم سے علحدہ رہے گی تو لیگ کی قوت بڑھ جائے گی اور کانگریس اپنا اثر کھو دے گی فیض پور کانگریس (۱۹۳۶ء) میں یہ تصفیہ ہوا کہ انتخابات لڑے جائیں تاکہ کانگریسی اراکین مجالس مقننہ میں جا کر دستور کو ناممکن العمل ثابت کر دیں۔ ۱۹۳۷ء کے صوبجاتی انتخابات میں کانگریس کو (۶) صوبوں (صوبہ متحدہ۔ بہار۔ اڑیسہ۔ صوبہ متوسط۔ مدراس اور بمبئی) میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ چند ماہ بعد صوبہ سرحد میں بھی کانگریس نے اکثریت حاصل کر لی۔ مسلم لیگ نے انتخابی مہم سر انجام دینے کے لئے ۱۹۳۶ء میں پارلیمانی

---

[1] تاریخ مسلم لیگ۔ از اختر حسن صفحہ ۲۶۵

بورڈ قائم کئے تاکہ انتخابات کا انتظام کیا جاسکے انتخابات کے بعد صوبہ بنگال آسام۔ سندھ اور پنجاب میں غیر کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئیں۔

جب (۷) صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہو گئی تو سوال یہ تھا کہ آیا وزارتیں قبول کی جائیں یا نہیں۔ کانگریس میں ایک طبقہ ایسا موجود تھا جس کو عہدے قبول کرکے حکومت سے تعاون کرنے پر اعتراض تھا دوسرا طبقہ دستور سے جو اختیارات عطا کئے جارہے تھے ان کے ذریعہ باشندگان ملک کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔ بالآخر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے پیش کیا کہ اگر گورنر اپنے اختیارات خصوصی کے استعمال سے باز آنے کا وعدہ کرلیں تو جن صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی وہاں جانیں روپیش وزارتیں قائم کرلی جائیں لیکن حکومت ہند اس قسم کا وعدہ کرنے کسی طرح تیار نہیں تھی چنانچہ کانگریس اور حکومت میں کشیدگی بڑھتی گئی اس اثنا میں حکومت نے تعطل کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ اعلان کیا کہ گورنر عموماً اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال نہیں کریں گے۔ اس کے بعد کانگریس نے جن صوبوں میں اس کو اکثریت حاصل ہوئی تھی وزارتیں قبول کریں اور بقیہ صوبوں میں غیر کانگریسی وزارتیں قائم ہوگئیں۔ کانگریس نے دستور کو اطمینان بخش قرار دے کر نہیں قبول کیا بلکہ باشندگان ملک کو فائدہ پہنچانے کی خاطر عہدے قبول کئے گئے۔

دوران انتخابات اور ان کے اختتام پر مسلم لیگ اور کانگریس میں کشیدگی بڑھنے لگی اگرچہ کہ اس زمانے میں ان دونوں جماعتوں کا سیاسی نصب العین ایک تھا اور اتحاد کے زیادہ امکانات ہوسکتے تھے لیکن افسوس کہ اتحاد نہ ہوسکا۔ ۱۹۳۷ء کو لکھنو والے اجلاس میں مسلم لیگ نے

اپنا نصب العین بجائے "قلمروی درجے"۱؎ کے مکمل آزادی قرار دیا۔ کانگریس کا
نصب العین بھی ہندوستان کی مکمل آزادی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد یا کانگریس
لیگ اتحاد کے لئے اس سے زیادہ موزوں اور مناسب موقع نہیں ہو سکتا
تھا۔ لیکن ہندوستانی تدبر مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام۲؎ رہا۔ جب فیض پور
کانگریس میں عوام اور بالخصوص مسلم "عوام سے ربط و ضبط" بڑھانے کا تہیہ
کیا گیا تو مسلم لیگ چونک گئی۔ اس زمانے میں مجلس احرار اور جمعیتہ العلماء لیگ
کے مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے کانگریس کی تائید کر رہے تھے اکثر
مسلمان لیگ سے اس لئے اختلاف رکھتے تھے کہ لیگ کا اس وقت
مکمل آزادی نصب العین نہیں تھا۔ چنانچہ ان صورت حالات سے واضح
ہو گا کہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء کے اجلاس میں اس لئے بھی آزادی کی تحریک
منظور کی کہ اس کو مسلمانوں کے اس طبقے سے مفاہمت کرنا تھا جو کانگریس
میں اس وجہ سے شریک ہو رہا تھا کہ وہ آزادی کی علمبرداری مکمل آزادی
کی قرارداد کے ذریعہ لیگ قوم پرست مسلمانوں کو اپنے دائرے میں کھینچنا
چاہتی تھی۔ رابطہ عوام کی تحریک سے کافی مسلمانوں نے کانگریس میں
شرکت کی اور مسلم عوام پر اس کے اثرات بڑھنے لگے۔ کانگریس کو روز افزوں
قوت حاصل ہونے لگی۔ ایسے حالات میں مجبور ہو کر لیگ نے شہروں اور
دیہاتوں میں کانگریس کے خلاف پروپگنڈہ شروع کیا اور خود مسلم عوام سے
ربط و ضبط بڑھانے کی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ جب سر سکندر حیات خان

۱؎

۲؎

اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو گئی تو سر سکندر نے یونینیسٹ پارٹی کے مسلم اراکین کو مسلم لیگ میں شریک ہونے کی ہدایت کی اور جب صوبہ بنگال میں مسٹر فضل الحق نے لیگ کی تائید کی تو اس کو غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی لکھنؤ کے اجلاس کے بعد جس میں کہ لیگ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کی تحریک منظور کی تھی اس کی قوت میں اضافہ ہونے لگا۔ لیگ اور کانگریس دونوں حصول اقتدار کی دوڑ دھوپ میں سرگرم عمل تھے۔ اب بڑا مسئلہ ان دونوں جماعتوں کے سامنے یہ تھا کہ حکومت کی جانب سے جو اختیارات دئے جا رہے ہیں ان میں سے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کیا جائے ایسی وجہ سے ان دونوں جماعتوں نے عوام کی تائید حاصل کرنے کے لئے رابطۂ عوام کی تحریک کا حیلہ تلاش کیا۔ کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ ہے۔ لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ صرف وہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور کانگریس محض ہندو ادارہ ہے۔ کانگریس کو اس امر سے اختلاف تھا کہ لیگ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ کانگریس کا استدلال تھا کہ نہ صرف کافی مسلمان اس کے رکن ہیں نیز مسلمانوں کی اور جماعتیں مثلاً احرار اور جمعیۃ العلماء اس کی تائید کرتی ہیں۔ بلکہ صوبہ سرحد جہاں کہ مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس کو اثر حاصل ہے۔ چنانچہ اقتدار اور ہوس کے چٹان سے دونوں جماعتیں ٹکرا گئیں۔ اب دونوں میں شدید اختلافات رونما ہو گئے اور کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ایک دوسرے کے خلاف پروپگنڈہ شروع ہوا کانگریس نے جن صوبوں میں لیگ کی وزارتیں قائم تھیں ان کو بدنام کرنا شروع کیا اور لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے خلاف شدومد سے پروپگنڈہ شروع کیا۔ جن صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی تھی لیگ نے وہاں مخلوط

وزارتوں کے قیام کا مطالبہ پیش کیا لیکن کانگریس نے انکار کر دیا۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ صرف ان مسلمانوں کو کانگریسی وزارتوں میں جگہ دی جائے گی جو کانگریس کے شرائط قبول کر کے کانگریس کے "عہد نامے" پر دستخط کرنے کو تیار ہوں۔ کانگریس نے یہ استدلال پیش کیا کہ مخلوط وزارتیں جن کے پروگرام اور مقصد میں اختلاف ہوتا ہے کمزور اور ذمہ دارانہ حکومت کے مغائر ہوتی ہیں لیکن جب کانگریس نے غیر کانگریسی صوبوں میں مخلوط وزارتوں کے قیام میں حصہ لیا تو کانگریس پر الزامات لگائے گئے۔ دراصل اس زمانے میں کانگریس نے عوام پر غیر معمولی اثر پیدا کر لیا تھا اس کو اپنی قوت اور اقتدار پر اعتماد تھا۔ کانگریس کو یقین تھا کہ وہ بغیر مسلم لیگ کی معاونت کے وزارتیں چلا سکتی ہے چنانچہ کانگریس کو لیگ کے تعاون عمل کی ضرورت نہ تھی۔[۵]

مسلم لیگ کو کانگریس کی پالیسی سے جو کہ اس نے صوبوں میں اختیار کر رکھی تھی سخت اختلاف تھا جب کانگریس کی جانب سے مسلم عوام سے ربط و ضبط پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی تو یہ مسلم لیگ کے اقتدار کے خلاف ضرب تھی اور اس کا دعویٰ کہ لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے کمزور ہونے لگا۔ دوسرے لیگ نے سمجھا کہ یہ تحریک مسلم لیگ کی قوت کو بے اثر کرنے اور مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی خاطر شروع کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ کانگریس کے اجلاس صدروں کی مجالس مقننہ۔ نیز بلدیات نیابتی ادارات اور

---

[۵] کوپ لینڈ مسئلہ ہندوستان جلد دوم صفحہ ۱۸۰

سیاسی اور سماجی اجتماعوں کی کارروائی کی ابتداء بندے ماترم سے شروع ہوتی ہے جس میں مسلمانوں کے خلاف جذبات پیش کئے گئے ہیں، واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم سے مسلمانوں نے اختلاف کیا۔ خود لفظ ودیا مندر جس کا مطلب "علم کا مندر" ہے مسلمانوں کے لئے قابل اعتراض تھا۔ ان اسکیموں کا مقصد ہندوستان میں قومی تعلیم کے ذریعہ سے بچوں اور نوجوانوں میں رواداری اور قومی جذبات پیدا کرنا تھا۔ جو درسی کتابیں مرتب کی گئیں، ماہرین تعلیم نے ان کو بہت پسند کیا لیکن مسلمانوں کو شکایت تھی کہ ایک تو ان کتابوں میں ہندی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے گئے ہیں دوسرے ان میں ہندو روایات اور ہندو اسپرٹ کو جگہ دی گئی ہے۔ ان کتابوں میں تقریباً ہر مذہب کے رہنماؤں کے واقعات درج تھے تاکہ بچوں میں ابتدا سے رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کا جذبہ پیدا ہو۔ لیکن مسلمانوں نے اعتراض کیا کہ ان پر ہندو تمدن غالب کروانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ واردھا اسکیم کی مسلمانوں نے اس لئے مخالفت کی کہ اس میں مذہبی تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ ان کے بچوں کو مذہبی عقائد سے دور ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مسلمان اپنے بچوں کے لئے گاندھی ٹوپی کا استعمال اور کانگریسی جھنڈے کی عزت اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو یہ خوف تھا کہ جس طرح بدھ مت ہندو مذہب میں ضم ہو کر فنا ہو گیا اسی طرح مسلمان ہندو مت میں ضم ہو جائیں گے یا کم از کم ہندو تہذیب ان پر غالب آجائے گی۔ مسلمان اپنے آپ کو دوسرے مذاہب اور دوسرے تہذیب و تمدن میں ضم ہو جانے سے بہت گھبراتے ہیں آج کل ہندوستانی مسلمانوں

میں یہ جذبہ کارفرما ہے کہ کسی طرح ہندوی اثرات سے اپنے آپ کو علحدہ رکھا جائے۔ مسلمانان ہند اس وقت اپنی انفرادیت پر زور دیتے ہیں۔ اپنے مذہب اور اپنی رسوم وروایات کو قابل احترام سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے گھرانوں میں شادی نہیں کرتے اور نہ ہندو اس پر راضی ہوسکتے ہیں۔ ہندو بھی اپنی تہذیب اور تمدن وروایات کو ارفع واعلیٰ سمجھتے ہیں۔ غرض کہ ہندو اور مسلمان کسی ایسی چیز کے لئے تیار نہیں ہوتے جس میں ایک دوسرے کو ضم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہر دو فرقے ایک دوسرے سے علحدگی پسند کرتے ہیں۔ مسلمان اپنے آپ ہندوستانی قومیت میں جذب کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ان کا زبردست قومی اور روحانی نقصان ہوگا۔ چودھری رحمت علی نے کہا کہ "انڈین ازم ہمارے قومی وجود کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے"[1] "واردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم مسلمانوں کے خلاف نہ ہوں تو بھی مسلمان ان کی اس سے مخالفت کرتے تھے کہ ان سے وہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں جذب ہو جاتے جس کے خلاف ان کے لیڈر ان کو متنبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ مسلمان ان تمام کوششوں کی جس سے مسلمانوں کو قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے مخالفت کرتے رہے ہیں۔ خود اردو ہندی اختلافات کا مسئلہ اس امر کو بخوبی واضح کر دیتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایثار اور ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کا جذبہ اور خواہش نہیں۔ ہر فرقہ زبان کے مسئلہ میں ایک انچ ہٹنے کو تیار

---

[1] خطبہ چودھری رحمت علی ۸ مارچ ۱۹۴۰ء بمقام کراچی صفحہ ۴

نہیں - زبان ہر قوم کو عزیز ہوتی ہے۔ اس سے قوم کی تاریخ ادب روایات برقرار رہتے ہیں۔

جب ہندی پرچار کی تحریک شروع ہوئی تو مسلمانوں نے سمجھا کہ اردو کے خلاف مہم شروع کی جا رہی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے لئے مسلم لیگ نے کانگریس کو مورد الزام ٹھہرایا۔ جہاں کہیں مسلمان مارے جاتے اور ہندوؤں سے کشیدگی پیدا ہوتی الزام کانگریس کے سر تھوپا جاتا۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے خلاف شکایات کو پیرپور رپورٹ اور شریف رپورٹ کی صورت میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں کانگریس دیسی ریاستوں میں داخلت کر رہی تھی ابتداء ہی سے کانگریس نے دیسی ریاستوں کو آزادی کی مہم میں رخنہ قرار دیا تھا۔ حیدر آباد کی اسلامی ریاست میں آریہ سماج تحریک تشدد اختیار کرنے لگی تو مسلمان شبہ کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس کو نہ صرف کانگریس کی تائید حاصل ہے بلکہ خود یہ تحریک کانگریس کے ایماء سے عمل میں آئی ہے۔ سنی اور شیعہ میں جو تفرقہ پیدا ہوا اس کو بھی کانگریس کی تقسیم کرنے کی پالیسی پر محمول کیا گیا۔ جب گورنروں نے وعدہ کیا کہ حتی الامکان اختیارات خصوصی کا استعمال نہیں کیا جائے گا تو مسلم لیگ نے کہا کہ حکومت برطانیہ اور کانگریس میں معاہدہ ہو گیا ہے۔ بلا شبہ ایک دوسرے کی مخالفت میں لیگ اور کانگریس کی جانب سے اکثر اوقات غلط بیانی بھی ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے حقائق کا پتہ چلانے اور کسی خاص نتیجہ پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے اس درمیان میں مسٹر جناح صدر مسلم لیگ اور کانگریسی لیڈروں۔ مسٹر گاندھی۔ پنڈت نہرو۔ پنڈت اور صدر کانگریس سبھاس چندر بوس میں

مراسلت اور گفت و شنید ہوئی لیکن وہ ناکام رہی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ صرف وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور کانگریس ایک ہندو ادارہ ہے دوسری طرف کانگریس اس دعوے سے قطعی اختلاف رکھتی تھی کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت ہے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت کا ایک صوبہ (صوبہ سرحد) کانگریس کے ہاتھ میں تھا اور کافی مسلمان کانگریس میں شریک تھے۔ کانگریس نے یہ بھی کہا کہ لیگ کے علاوہ کئی اور مسلمانوں کی جماعتیں ہیں جن کو کانگریس کی تائید حاصل ہے۔ کانگریس کا یہ بھی استدلال تھا کہ نہ صرف کئی مسلمان کانگریس کے رکن ہیں بلکہ مسلمان وزیر بھی ہیں لیکن لیگ کا یہ اعتراض تھا کہ جن مسلمانوں نے کانگریسی وزارتیں قبول کی ہیں ان کو مسلمانوں کی تائید حاصل نہیں اور وہ محض نام و نمود کے لئے وزیر بنائے گئے ہیں۔ بہرکیف کانگریس اور لیگ کی مفاہمت سے قبل ہر وقت یہ مسئلہ درپیش رہا کہ مسلم لیگ آیا مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے یا نہیں اور کانگریس قومی جماعت ہے یا نہیں کانگریس ہندوستان کی آزادی کو مقدم سمجھتی رہی اور فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کو ضمنی حیثیت دیتی رہی۔ اس کا کہنا تھا کہ فرقہ واری مسئلہ حکومت کا پیدا کردہ ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد بہ آسانی حل ہو سکتا ہے لیکن لیگ فرقہ واری مسئلہ کو اہم سمجھتی رہی جس کو آزادی سے پہلے حل کر لینا چاہیے

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر جناح نے اپنے ایک بیان میں کہا"

اتحاد کی ہی بنیاد پر ہندوستان آگے بڑھنے کی امید کر سکتا ہے اور اس درجے کو حاصل کر سکتا ہے جس کا وہ اپنی تاریخ میں مستحق ہے[1] اس وقت تک

---

[1] بحوالہ سیاست ملیہ صفحہ ۲۲۸

مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کی امید رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس کے
ذریعہ ہندوستان ماضی کی طرح اپنی تاریخ کو درخشاں بنا سکتا ہے لیکن
آج مسٹر جناح یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہے اور نہ وہ اس کے
خواہاں نظر آتے ہیں۔ بہرکیف ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء مسلم لیگ اور کانگریس
میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ کانگریس نے لیگ کی وزارتوں کو بدنام کیا اور
یہی طریقہ کار لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے خلاف استعمال کیا۔ کانگریس
کو (۷) صوبوں میں اکثریت حاصل ہونے سے لیگ بڑی تشویش میں مبتلا
ہوگئی۔ اگر کانگریس قومی ادارہ کی حیثیت سے اقتدار حاصل کرے تو مسلم
لیگ کے اقتدار کو خطرہ تھا۔ جب کانگریسی وزارتیں استعفیٰ دے کر
عہدوں سے سبکدوش ہوگئیں تو مسٹر جناح کے کہنے پر ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء
کو ہندوستان میں "یوم نجات" منایا گیا جس میں کانگریسی وزارتوں سے
شکایت اور بیزارگی کا اظہار کیا گیا۔ یہ الزام عائد کیا گیا کہ کانگریس ہندو
راج کی خواہاں ہے۔ ڈاکٹر اسپیڈ کہنے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کانگریس
کے ڈھائی سالہ عہد وزارت نے مسلمانوں کو کانگریس کا سخت ترین دشمن
بنا دیا وہ مسلمان جنہوں نے گول میز کانفرنس میں آزادی کا مطالبہ کیا
تھا آج اس کے مخالف ہوگئے ہیں[1] دوسری جنگ عظیم کے شروع ہو جانے
کے بعد وائسرائے ہند نے مسٹر جناح اور مسٹر گاندھی سے گفت و شنید کی۔
مسٹر جناح کا اصرار تھا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے
اور مسلم وزراء اور مجالس مقننہ کے مسلم اراکین کا اعتماد حاصل ہو۔ کانگریس نے

---

[1] اسپیڈ تقسیم ہند صفحہ ۲۵

اس دعویٰ اور مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

---

(۲)

نظریۂ پاکستان۔ سنہ ۱۹۴۰ء تک مسلمان بہ حیثیت اقلیت اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کا مطالبہ کرتے رہے اور حکومت نیز ہندوؤں کی جانب سے بڑی حد تک اس کی تکمیل ہوتی رہی۔ چنانچہ مرکزی مجلس مقننہ میں (۳۳⅓) فی صد کے مطالبے کو بھی سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند میں جگہ دی گئی فیڈرل اسمبلی کی (۲۵۰) نشستوں میں مسلمانوں کے لئے (۸۲) نشستیں (تقریباً ۳۳ فی صد) محفوظ کر دی گئیں کونسل آف اسٹیٹ میں مسلمانوں کے لئے برطانوی ہند کی (۱۵۰) نشستوں میں سے (۴۹) محفوظ کر دی گئیں یعنے تقریباً (۳۳) فی صد جملہ صوبہ واری مجالس مقننہ کی کل (۱۵۸۵) نشستوں میں سے مسلمانوں کے لئے (۴۸۲) نشستیں تقریباً ۳۱ فی صد) محفوظ کر دی گئیں حالانکہ مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ء کے بموجب مسلمانوں کی آبادی تقریباً (۲۲) فی صد تھی اور ملازمتوں کے معاملہ میں جہاں راست تقررات ہوں گے (بابت سیول سرویس اور سبارڈنیٹ سرویس) مسلمانوں کے لئے (۲۵) فی صد خدمتیں محفوظ کر دی گئیں اور اگر مقابلے میں مسلمان زیادہ خدمتیں حاصل کریں تو اس کی بھی اجازت ہوگی سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مطالبات ایک تو یا سنگ اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب عطا کر کے دوسرے ان کے لئے ملازمتوں میں فیصد کا تعین کر کے بڑی حد تک تکمیل کر دی گئی ان مطالبات کی تکمیل میں ہندوؤں کے حقوق پر دست اندازی ضرور

ہوئی۔ جو تحفظات مسلمانوں کو عطا کئے گئے اس کے بعد مسلمانوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ رہنا چاہیئے تھا لیکن مسلمانوں کو یہ شکایت رہی کہ آئینی تحفظات ہندو اکثریت کے ظلم و استبداد سے بچانے میں ناکام رہے[۹] ۔ ۱۹۴۰ء تک تو مسلمانوں نے بہ حیثیت اقلیت اپنے حقوق کا مطالبہ کیا لیکن اسی سال مسلم لیگ نے باقاعدہ طور پر اعلان کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان اقلیت نہیں ہیں بلکہ ایک علحدہ قوم ہیں اور ان کو حق خود ارادیت حاصل ہے۔ برطانوی راج کے قائم رہنے تک مسلمان تحفظات کے طالب رہیں گے لیکن جب حکومت برطانیہ نے اقتدار تفویض کرنے کا تہیہ کر لیا تو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ بلحاظ تعداد ہندوؤں ہی کو اقتدار کا حق پہنچتا ہے۔ برطانوی راج کے ختم ہونے پر مسلمان۔ ہندو راج کا شکار ہو جائیں گے۔ مسلمان کچھ ابتدا ہی سے ہندو اکثریت سے خائف رہتے ہیں اسی وجہ سے انھوں نے عمومی ادارات کی مخالفت کی۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے قریب مسلمانوں میں یہ رجحان تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبے بنائے جائیں اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کم از کم مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کو اقتدار حاصل رہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر ہندو صوبوں میں مسلم اقلیت کو ستایا جائے تو مسلم صوبوں میں ہندو اقلیت سے بدلے لیا جاسکے[۱۰]۔ گول میز کانفرنس میں مسلمان ہندوستان کے لئے ایک وفاقی حکومت کے رضامند تھے البتہ ان کو وفاق کی نوعیت پر اعتراض تھا۔ وہ "باقی اختیارات"[۱۱]

---

[۹] اسپیڈ کریفتیم ہند صفحہ ۲۵

[۱۰] " " " ۹۴

[۱۱] " " " "

صوبوں کے صوبوں سے تفویض کرنا چاہئے تھے تاکہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے کم از کم وہاں ان کا اقتدار محفوظ رہے اور مرکز کی مداخلت جہاں کہ ہندوؤں کی اکثریت ہوگی اس سے نجات ملے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے اپنا نصب العین مکمل آزادی قرار دیا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں لیگ نے یہ اعلان کر دیا کہ مسلمان وفاق میں نہیں شریک ہو سکتے۔ وہ شمال مشرق و شمال مغرب میں اپنی علیحدہ آزاد ریاستیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔

مسلم صوبوں کو علیحدہ ریاستیں بنانے کا تخیل پہلی مرتبہ علامہ ڈاکٹر اقبال نے لیگ کے اجلاس (۱۹۳۰ء) منعقدہ الٰہ آباد میں پیش کیا موصوف نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ "..... ہندوستان میں فرنگی جمہوریت کا نفاذ درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا اسلامی ہند کی تشکیل کا مطالبہ کاملاً صحیح ہے۔ میری تمنا ہے کہ پنجاب شمالی مغربی سرحدی صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کرنی چاہئے۔ حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر ہندی مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہئے۔"[۱۱] اس سے قبل مسلم ریاستوں کے وفاق کا ایک مبہم تصور سر تھیوڈر ماریسن پرنسپل علی گڑھ کالج کے ذہن میں ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "ہندوستان میں شہنشاہی حکومت" (بزبان انگریزی) میں ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا کہ "اگر ہندوستان کے ۷۰ ملین مسلمان ایک صوبے یا ملک کے ایک حصے میں جمع کر دئے جائیں مثال کے طور پر شمالی ہند میں اور پشاور سے لے کر

---

۱۱ بحوالہ تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۲۹۲

آگرہ تک کے علاقوں میں صرف مسلمان آباد رہیں تو ایک قومی اسپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہو جائے گی جس سے حالیہ مسئلہ کا جزوی طور پر حل ہو سکتا ہے[۱۱] اس کے علاوہ خان صاحب سردار محمد گل خان صاحب نے ۱۹۲۳ء میں شمال مغربی سرحد کی تحقیقاتی کمیشن کے سامنے یہ کہا کہ راس کماری سے آگرہ تک حصہ ہندوؤں کو دے دیا جائے اور آگرے سے پشاور تک مسلمانوں کے تفویض کر دیا جائے[۱۲] لیکن اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ خود علامہ اقبال کے خطبہ پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ ان کے خطبہ سے اس بات کا پتہ نہیں کہ آیا وہ مجوزہ مسلم ریاستوں کو مقتدر مملکتیں بنانا چاہتے تھے تو اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ مرکزی حکومت سے کس قسم کے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے "پاکستان قومی تحریک" کی بنیاد رکھی اور پاکستان اسکیم کا پروپگنڈہ شروع کیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ نے پاکستان کے مسئلہ پر غور نہیں کیا۔ خود مسٹر جناح کو ابتداء میں پاکستان کی تحریک سے اختلاف تھا۔ اس زمانے میں مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے علمبرداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو مسلم نوجوانوں نے ایک (۴) صفحے کا اشتہار بعنوان "اب یا کبھی نہیں" بزبان انگریزی محمد اسلم، رحمت علی، شیخ محمد صادق اور عنایت اللہ خان کی دستخطوں سے کیمبرج میں تقسیم کیا تھا۔ اس میں انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مسلم ریاستوں کا ایک علحدہ وفاق

---

[۱۱] ہندوستان میں شہنشاہی حکومت صفحہ ۲

[۱۲] رپورٹ تحقیقاتی کمیٹی صوبہ سرحد ۱۹۲۳ء صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۳

مسلمان ایسے وفاق میں شریک نہیں ہو سکتے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہو۔
جب ۱۹۳۳ء میں پاکستان کا مسئلہ پارلیمانی مجلس منتخبہ کے سامنے
پیش ہوا تو مسلمانوں کے نمائندوں نے اسے تصوری اور ناممکن العمل قرار دیا[۱۵]
لیکن سات سال بعد مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ پیش
کر دیا لیگ کے اجلاس میں حسب ذیل قرارداد منظور ہوئی"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس اجلاس کی رائے ہے کہ قانون اساسی کے متعلق کوئی تجویز مسلمانان
ہند کے لئے قابل قبول نہ ہوگی اور نہ اس ملک میں قابل عمل ہوگی جب تک
اس کی بنیاد اس اصول پر نہ ہو یعنے یہ کہ ملک کے ایسے حصے جو جغرافیائی
طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوں بطور علاقوں یا اقالیم کے قائم
کئے جائیں اور ان اقالیم کو ضروری ترمیمات اراضی کے بعد اس طرح
ترتیب دیا جائے کہ ان علاقوں یا اقالیم میں جہاں مسلمان بلحاظ تعداد
مردم شماری اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمال مغرب کے قطعات
ان کو یکجا کر کے آزاد حکومتیں بنائی جائیں اور اس میں سے ہر ایک
حکومت اپنی جگہ پر خود مختار ہو۔ ان حکومتوں میں ہر ایک حکومت کے آئین
اساسی میں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کافی موثر اور واجب العمل دفعات
رکھی جائیں اس طرح کہ ان کی اقلیتوں کی مذہبی۔ تمدنی۔ اقتصادی سیاسی
حقوق اور وہ حقوق جن پر سلطنت کی انتظامی کارروائی سے اثر پڑتا ہو
بعد المشورہ محفوظ رکھے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصص میں
جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں سے اور دوسری اقلیتوں سے

---

[۱۵] کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد دوم صفحہ ۲۱

مشورہ کرنے کے بعد ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی تمدنی اقتصادی سیاسی حقوق کے لئے دفعات رکھے جائیں[۱۶]

مارچ ۱۹۴۰ء کی لیگ کی قرار داد سے ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً سندھ۔ پنجاب۔ صوبہ سرحد بلوچستان اور بنگال وہاں آزاد مسلم ریاستوں کا قیام عمل میں لایا جائے خود ان مسلم ریاستوں میں کس قسم کی حکومت ہوگی اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا البتہ اس کی صراحت کی گئی کہ پاکستان اور باقی ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک معاہدہ ہوگا۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی اساس اس امر پر رکھی گئی کہ ہندوستانی مسلمان ایک علٰحدہ قوم ہیں مسٹر جناح نے خطبہ صدارت مسلم لیگ (۱۹۴۰ء) میں کہا کہ "مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ کسی تعریف کے تحت بھی مسلمان قوم کے معیار پر پورے اترتے ہیں[۱۷] اس خطبہ میں انھوں نے کہا کہ "ہندو مسلمان دو مختلف مذہبی فلسفے سماجی رسوم اور ادب کے حامل ہیں۔ نہ وہ آپس میں شادی بیاہ کرتے اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا تعلق مختلف تہذیبوں کا سا ہے جن کی بنیادیں محض متضاد خیالات اور تخیلات پر ہیں۔ زندگی کے متعلق ان کے زاویہ نگاہ میں فرق ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان مختلف تاریخ کے ماخذ سے جذبات حاصل کرتے ہیں ان کی مختلف داستان ہے اور مختلف ہیرو ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

۱۶ ہندوستان کا کانسٹیٹیوشن کیا ہونا چاہئے صفحات ۲۹ تا ۳۰

۱۷ مسٹر جناح کی چند حالیہ تقاریر و تحریرات صفحہ ۱۲۹

اکثر ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن رہا ہے۔ اسی طرح ان کی فتوحات اور شکستیں ایک دوسرے کے خلاف پڑتی ہیں[۱۸۹]" بجائے اقلیت کے مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء کو ایک علیحدہ قوم ہونے کا اعلان کر دیا اور جب قوم ہونے کا دعویٰ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ حق خود ارادیت کا مطالبہ شروع ہوا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو وفاق مسلم طلباء پنجاب کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہم ایک قوم ہیں اور ایک قوم کو علیحدہ علاقہ کی ضرورت ہوتی ہے .... وہ زمین پر رہتی ہے اور وہ زمین پر حکومت کرتی ہے اور اس کو علاقہ جاتی مملکت کی ضرورت ہوتی ہے[۱۹۰]"

پاکستان کی روح ایک مرکزی مخالفت میں مضمر ہے۔ پاکستان کی تجویز میں ۲ مرکز پیش کئے گئے ہیں ایک ہندوستان دوسرا پاکستان مسلمان یہ جانتے ہیں کہ اگر ہندوستان کے لئے ایک مرکز کا قیام عمل آئے گا تو باوجود صوبہ سندھ پنجاب صوبہ سرحد بنگال اور بلوچستان میں ان کو اکثریت حاصل ہونے کے مرکز میں ہندو اکثریت کے تابع رہیں گے اس صورت حال سے بچنے کے لئے مسلمانوں نے ایک مرکز کی مخالفت کی مسٹر جناح نے کہا "پاکستان کی اساس پر مبنی ہے کہ ہم مسلم صوبوں کو خود مختار ہونے سے اور فردیہ اور وفاقی مرکز میں ہندوؤں کا راج قائم ہونے سے بچائیں[۱۹۱]" مسٹر جناح کو خدشہ ہے کہ وفاقی حکومت میں صوبوں کو چاہیے

---

[۱۸۹] مسٹر جناح کی چند بلند تقاریر و تحریرات صفحہ ۲۰۲

[۱۹۰] " " " ۲۱۳

[۱۹۱] تقریر مسٹر جناح بمقام دہلی ۱۰ نومبر ۱۹۴۴ء بحوالہ اخبار ڈان ۲۰ نومبر ۱۹۴۴ء

کتنے ہی اختیارات حاصل ہوں لیکن بعد میں چل کر وفاقی حکومت زیادہ اختیارات حاصل کر لیتی ہے اور اس طرح ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے گا۔[۱۱] ان کا خیال ہے کہ متحدہ اور مرکزی ہندوستان میں مسلمان اپنی حالت بہتر نہیں بنا سکتے۔ چاہے کچھ ہی ہو وہ ہر وقت اقلیت میں رہیں گے۔[۲۲] ۱۹۴۱ء کے اجلاس بمقام مدراس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا " .... مسلمان کبھی بھی ایک کل ہند دستور اور ایک مرکزی حکومت قبول نہیں کر سکتے۔"[۲۳] اسی بنا پر آج مسٹر جناح ہندوستان کے لئے دو دستور ساز جماعتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کے پیش نظر بڑی چیز یہ ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑنے کے بعد اصول جمہوریت کے تحت حکومت پر ہندو جماعت حاوی ہو جائیگی اور دس کروڑ مسلمان محض ایک اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ تحفظات کے ذریعہ مسلمانوں کے مفادات کا آئینی تحفظ ہو سکتا ہے لیکن وہ اس پر رضامند نہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جب ایران کے تقریباً (۱½) کروڑ مسلمان اور بعض ممالک میں اس سے کم مسلمان اپنی آزاد مملکت رکھتے ہیں تو (۱۰) کروڑ مسلمان اقتدار سے کیوں محروم رہیں۔ پاکستان کے ذریعہ وہ کم از کم ان علاقوں میں جہاں کہ ان کی اکثریت ہے اپنی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ "پاکستان قومی تحریک" کے بانی چودھری رحمت علی نے کہنا شروع

---

[۱۱] اخبار ٹائمز آف انڈیا ۲۰ مارچ/اپریل ۱۹۴۰ء

[۲۲] مسٹر جناح کی حالیہ تقاریر و تحریرات صفحہ ۹۰

[۲۳] " " " " " ۲۳۹

کہا کہ یا تو مسلمان ایشیا میں با عزت اقتدار اعلیٰ (ساورنٹی) حاصل کر کے زندگی بسر کر سکتے ہیں یا ہندوستان میں غلامی کی زندگی [۲۷۱] انھوں نے کہا کہ اگر مسلمان ہندوستان کی قومیت میں ضم ہو جائیں تو یہ ناقابل تلافی مہلک غلطی ہوگی۔ بحیثیت قوم ہمارا حشر بلا استقبل ہوگا اور ہمارے احیاء کی امید موہوم بھی باقی نہیں رہے گی۔ [۲۷۲] انھوں نے یہ بھی کہا کہ "اگر ہم ایک مرتبہ ہندوستان میں رہنا تسلیم کرلیں تو ہر وقت کے لئے انڈین ازم کی ماتحتی میں سڑ جائیں گے۔ [۲۷۳] متحدہ ہندوستان میں مسلمان اپنی قسمت منسلک کرنے سے مسلمانوں کو کہا "انڈین ازم ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کرے گی جس کے ہاتھ میں سیول انتظامات اور فوج ہوگی . . . . جب اس کو اپنی قوت پر اعتماد ہو جائے گا جمہوریت کے نام پر برطانوی سنگینوں کے ذریعہ اپنے شکار کو بالکلیہ قید کر کے اس قوت کا استعمال ہم کو دبانے میں اور جبر کرنے میں استعمال کرے گی۔" [۲۷۴] رحمت علی صاحب نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اگر وہ ہندوستان میں مرکزی حکومت تسلیم کرلیں تو ہر وقت کے لئے تباہ و تاراج ہو جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے اپنی بندھن کاٹ کر اپنے مستقبل کو ایشیاء سے وابستہ کرلینا چاہئے۔ [۲۷۵] انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ " . . . . . . ہم مسلمان ہیں نہ کہ ہندو۔ پاکستانی ہیں نہ کہ

---

[۲۷۱] خطبہ چودھری رحمت علی ۱۹۴۶ء صفحہ ۲

[۲۷۲] " " " " ۲

[۲۷۳] " " " " ۹

[۲۷۴] " " " " ۵

[۲۷۵] " " " " ۱۵

ہندوستانی۔ ایشیائی ہے نہ کہ ہندوستانی[۲۹]......" اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے ذہن میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ایسی مملکت کی تعمیر پیش نظر ہے جس کے اسلامی ممالک سے تعلقات رہیں گے اور جو براعظم ایشیا میں اپنا خاص مقام پیدا کرے گی۔ یہ مقاصد لازمی نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں حاصل ہو جائیں اور چونکہ مرکز ہی میں ہندو اکثریت ہوگی لہٰذا مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے نیز ممالک اسلامیہ سے اچھی طرح تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے۔ اسی وجہ سے چودھری صاحب نے کہا کہ "انڈین ازم ہمارے قومی وجود کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے[۳۰]" اس سے ان کے پیش نظر یہ امر ہے کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کی بناء پر حکومت پر حاوی رہیں گے اور اگر مسلمان محکوم نہ بھی ہوں تو مقتدر نہیں ہو سکتے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی رہی سہی انفرادیت ہندوستانی قومیت کے نذر ہو جائے گی۔ چودھری موصوف نے پاکستان میں پنجاب۔ بلوچستان۔ افغانستان۔ کشمیر۔ سندھ اور پنجاب کے ساتھ حیدرآباد کو بھی شامل کر لیا تھا۔ شمال مغربی ہندوستان کے لئے انھوں نے پاکستان کا نام دیا۔ شمال مشرقی ہندوستان کے لئے بانگ اسلام اور حیدرآباد دکن کے لئے عثمانستان کا نام تجویز کیا گیا۔

کانگریس کو اس امر سے سخت اختلاف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک علیحدہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی بناء پر تقسیم ہند کا مطالبہ کیا جا رہا ہے

۲۹۔ خطبہ چودھری رحمت علی ۱۹۳۳ء صفحہ ۲

۳۰۔ " " " "

کل ہند کانگریسی ورکنگ کمیٹی نے مئی ۱۹۴۲ء کو بمقام الہ آباد ایک قرارداد منظور کر رکھی ہے جو جگت نارائن والی قرارداد کے نام سے مشہور ہے اس قرارداد میں تقسیم ہند کی تجویز کو ہندوستانی عوام کے مفاد کے خلاف اور نقصان دہ قرار دیا گیا ہے۔ کانگریس اس امر پر زور دیتی ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں۔ تقسیم ہند کی نہ ضرورت ہے اور نہ یہ اسکیم کامیاب ہو سکتی ہے۔ کانگریس کے خیال میں یہ نہایت ہی خطرناک اسکیم ہے۔ کانگریس نے ۱۹۴۵ء کے پونا والے اجلاس میں یہ طے کیا کہ صوبوں کو ہندوستانی یونین سے علٰحدہ رہنے کی حتی الامکان اجازت نہیں دی جائیگی گاندھی جناح گفت و شنید میں جو مراسلت ہوئی اس میں مسٹر گاندھی نے اپنے ۱۵ ستمبر والے مکتوب[1] میں لکھا تھا کہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ مذہب بدل جانے سے کوئی گروہ علٰحدہ قوم بن جاتا۔ مسٹر گاندھی نے لکھا کہ اگر اسلام آنے سے قبل ہندوستان میں ایک قوم تھی تو باوجود عقیدے کی تبدیلی کے اب بھی ایک ہی قوم ہے۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے اپنے اسی مکتوب میں ایک اعتراض مسٹر جناح پر یہ کیا کہ اگر سارا ہندوستان اسلام قبول کرلے تو کیا دونوں قومیں ایک ہو جائیں گی؟ اس کے جواب میں مسٹر جناح نے ۱۷ ستمبر کو لکھا کہ ہماری تعداد (۱۰) کروڑ ہے ہمارا علٰحدہ تمدن زبان۔ ادب۔ آرٹ۔ طرز تعمیر۔ نام۔ اصول۔ قوانین۔ اخلاقی قوانین رسم و رواج۔ جنتری۔ تاریخ۔ روایات۔ رجحانات۔ خواہشات بحیثیت زندگی میں ہمارا زاویہ نگاہ بالکل علٰحدہ ہے[2] مسٹر گاندھی کا خیال ہے کہ

---

[1] ٹائمس آف انڈیا ۲۹ ستمبر ۱۹۴۴ء

[2] " " "

مسلمانوں کو علیحدہ قوم تسلیم کرنے سے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے جب ایک مرتبہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو کئی اور ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے مطالبات رد کئے نہیں جا سکتے جس کا نتیجہ ہندوستان کی تباہی ہوگی[۳۳]

مسٹر جناح کو کانگریس کی اگست ۱۹۴۲ء والی قرارداد پر جس میں انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا گیا سخت اختلاف ہے۔ انھوں نے یہ بتائی کہ اگست کی قرارداد کے ذریعہ ایک تو انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا دوسرے طرف فوری وفاقی مرکزی حکومت کے قیام کی تجویز منظور کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب ہندو راج ہوگا۔ دستور ساز جماعت میں (۷۵) فی صد ہندو ہوں گے اس لحاظ سے یہ قرارداد لیگ کی لاہور والی قرارداد (مارچ ۱۹۴۰ء) کے خلاف ہے[۳۴]

مسٹر گاندھی نے گفت و شنید کے درمیان تقسیم ہند کا اصول بادل ناخواستہ حسب ذیل شرائط پر قبول کیا سرحدوں کا تعین ایک ایسے کمیشن کے سپرد ہوگا جس کو کانگریس و لیگ دونوں نے تسلیم کیا ہو علاقہ متعلقہ کے باشندوں کی رائے بالغ رائے دہی کے اصول پر معلوم کی جائے گی اگر ووٹ تقسیم کی تائید میں حاصل ہو جائیں تو جوں ہی انگریزی حکومت ہٹ جائے دو آزاد مملکتیں قائم کر دی جائیں گی۔ تقسیم کی نسبت ایک معاہدہ ہوگا جس میں خارجی معاملات دفاع داخلی ذرائع حمل و نقل۔ تجارت وغیرہ

---

[۳۳] گاندھی جناح مراسلت ایضاً خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء

[۳۴] ،، مکتوبہ مسٹر جناح بنام مسٹر گاندھی مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء

بابت دونوں مملکتوں کے درمیان امور طے ہوں گے۔ جو ان دونوں میں مشترک ہوں گے۔ اس معاہدے میں اقلیتوں کے تحفظ کا معاہدہ بھی شامل ہوگا[۳۵]۔ لیکن مسٹر جناح کو اس امر سے اختلاف تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں تقسیم کے فیصلے کے لئے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سے ووٹ حاصل کئے جائیں[۳۶]۔ مسٹر جناح یہ نہیں چاہتے کہ پاکستان کی نسبت مسلم اکثریت کے صوبوں میں جو رائے لی جائے گی اس میں غیر مسلموں کی بھی رائے شامل حال رہے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۵ء کو دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ جب پاکستان کے لئے غیر مسلم باشندوں کی رائے لی جائے گی تو "ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان کسی قسم کی یونین میں شرکت سے اختلاف کریں تو کیا مسلم اقلیت کو اپنا فیصلہ منوانے کا حق حاصل ہوگا ......

یہ بالکل واضح ہے کہ ہندو صوبوں میں مسلمان ہندو راج کے دوسرے جوئے کے تحت ہوں گے ایک تو صوبے میں دوسرے مرکز میں[۳۷]۔ مسٹر جناح نے کہا کہ اگر ایسا ہوگا تو ہندوستان اور پاکستان اقلیت کے فیصلے پر چھوڑ دیا جائے گا[۳۸]۔

اب ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان مسئلہ اقلیت کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیتا ہے؟ شمال مغربی پاکستانی علاقے میں ہندوؤں اور

---

[۳۵] ٹائمز آف انڈیا مکتوب مسٹر گاندھی بنام مسٹر جناح مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء

[۳۶] ‟ ‟ ‟ مسٹر جناح بنام مسٹر گاندھی ‟ ‟ ‟ ‟

[۳۷] اخبار ڈان ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۸

[۳۸] ‟ ‟ ‟ ۱

سکھوں کی اقلیت رہے گی اور شمال مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی اقلیت رہے گی اس کے علاوہ باقی ہندوستان یعنی ہندو ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں رہیں گے۔ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ اگر پاکستان مسئلہ اقلیت کا حل نہ کرے تو پھر یہ اسکیم بیکار ہے۔ سکھ پاکستان کے سخت مخالف ہیں انہوں نے سکھ کانفرنس ستمبر ۱۹۴۵ء میں ایک قرارداد منظور کی ہے کہ "پنتھک تمام واضح اور غیر مبہم طریقہ پر اعلان کر دینا چاہتا ہے کہ سکھ ملک کے تمام عناصر کی دلی تائید کرتے ہیں اور ان سے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ جو ملک کی ایمانداری سے خدمت کرنا چاہتے ہیں اور جو مادر وطن کی آزادی اتحاد وحدت اور بہبودی چاہتے ہیں اور ہم ان سے تعاون عمل کرنے کے لئے تیار ہیں جو ہم کو ملک کی خدمت میں مساویانہ اور دوستانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں نہ کہ ہم کو ذیلی قومی گروپ قرار دیتے ہیں۔ [۹۳]"

سکھ لیڈر "تاراسنگھ" نے کانفرنس میں کہا کہ "پاکستان کے قیام کو ہر قیمت پر روکنا چاہئے۔ [۹۴]" سکھ متحدہ ہندوستان کے قائل ہیں اور پاکستان کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ اگر پاکستان قائم بھی ہو جائے تو یہ وہ اپنا تعلق کسی قریبی ہندو صوبے سے کر لیں گے۔ مسلمانوں کی حکومت میں وہ رہنا پسند نہیں کریں گے جس وقت پارلیمانی وفد ۱۴۔ جنوری ۱۹۴۶ء کو امرتسر گیا تو سکھوں کی ایک تعداد نے کالے شملے پہنے ہوئے اس وفد کا استقبال "پاکستان مردہ باد پنجاب ہمارا مادر وطن ہے اور ہماری مقدس زمین ہے" کے نعرے سے کیا

---

[۹۳] اخبار ہندو یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء

[۹۴] ،، ۱۶ر جنوری ۱۹۴۶ء

اور اکثر تختوں پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "ہم کو ہماری قسمت پر چھوڑ دیجئے اور آخر وقت تک سکھ پاکستان قائم ہونے سے مزاحمت کرتے رہیں گے ...... پنجاب سکھوں کا ہے"[۱۱]

اگرچہ مسٹر جناح نے سکھوں کے خدشات کو رفع کرتے ہوئے کہا کہ سکھوں کو پاکستان میں ایک باعزت مقام حاصل ہوگا لیکن اس کا کوئی خاص اثر مرتب نہ ہوا۔ مسٹر جناح نے یہ بھی یقین دلایا کہ متحدہ ہندوستان میں مرکزی حکومت کے تحت ان کی آواز غیر موثر ہوگی اس کے برخلاف پاکستان میں ان کی حالت بہتر ہوگی۔[۱۲] پاکستانی علاقوں میں سکھ اقلیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے وہ کسی طرح پاکستان میں رہنے پر تیار نہیں ہونگے بلکہ انھوں نے تو پاکستان کے خلاف محاذ تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ سکھوں نے کرپس پیشکش سے اس لئے اختلاف کیا کہ اس میں صوبوں کو یونین سے علحدہ ہونے کا حق دیا جا رہا تھا جس سے امکان تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے۔ اگر سکھ بھی مسلمانوں کی طرح حق خود ارادیت کا مطالبہ کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو کونسا حصہ دیا جائے گا۔ مشرقی پنجاب کے اضلاع میں سکھوں اور ہندوؤں کی اکثریت ہے امرتسر جو سکھوں کا مقدس مقام ہے اس کا کیا حشر ہوگا؟ اسی طرح صوبہ بنگال کے مغربی اضلاع میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ حق خود ارادیت کا مطالبہ کر کے کسی قریب کے صوبے سے اپنا الحاق پسند کریں گے۔ اگرچہ صوبہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن اس کے

---

[۱۱] اخبار ہندو ۱۹ر جنوری ۱۹۴۱ء

[۱۲] مسٹر جناح کی چند حالیہ تقاریر و تحریرات صفحہ ۱۵۹

مرکز کلکتہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ شہر کلکتہ سے ہندوؤں کا کاروبار وابستہ ہے۔ یہ ایک سوال ہے کہ کلکتہ پاکستان میں شامل رہے گا یا نہیں۔ اگر کلکتہ پاکستان میں شامل نہ ہو تو مشرقی پاکستانی حلقہ کمزور ہو جائے گا اور اگر اس کو پاکستان میں شامل کر لیا جائے تو ہندوؤں کے کاروبار کو صدمہ پہنچتا ہے۔ صوبہ پنجاب کے بعض اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو بعض میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ البتہ صوبہ سرحد اور سندھ میں ہندو ایک تو تعداد کے اعتبار سے کم ہیں دوسرے وہ منتشر اور پھیلے ہوئے ہیں۔ سندھ کے اکثر شہروں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور دیہات میں مسلمانوں کی۔ صوبہ سرحد میں شہر اور دیہات دونوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ صوبہ سرحد اور سندھ میں چونکہ ہندو آبادی پھیلی ہوئی ہے اس کو علیحدہ کر کے ایک جداگانہ علاقہ دینا مشکل ہے اس کے برخلاف پنجاب اور بنگال میں ایسا ممکن ہے اس لئے کہ مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے پاکستان کے قیام پر تقریباً (۲) کروڑ مسلمان۔ ہندو ہندوستان کے تحت رہیں گے اور تقریباً (۵) کروڑ پاکستانی علاقہ میں۔

مسٹر جناح کہتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے بعد اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی نسبت ہندوستان اور پاکستان میں معاہدہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ بہت مستحکم ہوگا اس لئے کہ پاکستان علاقے میں ہندو اقلیت ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت رہے گی لہذا نہ مسلمان پاکستان میں ہندوؤں کو ستا سکتے ہیں اور نہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو پریشان کر سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کے مسئلہ کا حل "نظریہ توازن" میں

رکھا گیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظریہ توازن کے ذریعہ سے اقلیتوں کے مسائل کا حل ہو سکتا ہے یا نہیں اگر یہ غلط پروپگنڈہ کیا جانے لگے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے یا پاکستان میں ہندوؤں کو ستایا جا رہا ہے تو یہ جنگ کے لئے محض ایک حیلہ ثابت ہوگا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جو مراعات اور تحفظات پاکستان میں ہندوؤں کو حاصل ہوں گے وہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کو حاصل رہیں گے۔ لیکن پروفیسر کوپ لینڈ کا خیال ہے کہ اس طرح سے اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ تبادلہ آبادی عمل میں نہ آئے۔ ان کے خیال میں یوروپ کا تجربہ بتاتا ہے کہ ایک مملکت ہی کے اندر جب اقلیتوں کا مسئلہ مشکل ہو جاتا ہے تو جب یہ مسئلہ دو مملکتوں کے درمیان ہوتا ہے تو اور مشکل پیش آتی ہے[۱۳۵]۔ ڈاکٹر امیڈکر کا بھی یہی خیال ہے کہ جب تک آبادی کا تبادلہ نہ ہو مسئلہ اقلیت حل نہیں ہو سکتا[۱۳۶]۔ ان کے خیال میں اقلیتوں کا مسئلہ اس وقت حل ہو سکتا ہے جبکہ پاکستان میں صرف مسلمان رہیں اور اس طرح اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ باقی نہیں رہتا اور پھر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے بھی نجات مل جاتی ہے[۱۳۷]۔ اگر موجودہ مسلم اکثریت کے صوبوں پر پاکستان کھڑا کیا جائے اور انتقال آبادی نہ ہو تو پاکستان اور ہندوستان کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہونے کی وجہ سے اقلیتیں ان کے رحم و کرم پر ہونگی۔

---

[۱۳۵] آر کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۹۵

[۱۳۶] امیڈکر تقسیم ہند " ۱۰۴

[۱۳۷] " " صفحات ۹۹ تا ۱۰۰

"پاکستان کی کیوں مخالفت کی جاتی ہے؟"

پاکستان کی مخالفت میں پہلا زبردست اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے
کہ تقسیم ہند سے ہندوستان کی وحدت ٹوٹ جائے گی دوسرے دفاع کمزور
ہوجائے گا۔ تیسرے یہ کہ تقسیم کے باوجود اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ برابر
قائم رہے گا بلکہ اور زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو خدشہ ہے
کہ پاکستان عطا کرنے کے بعد دیگر فرقوں کے مطالبات کی تکمیل بھی کرنی
ہوگی اور اس طرح ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا چنانچہ لاہور کی قرارداد
پاکستان مارچ ۱۹۴۰ء کے ایک ماہ کے اندر ۱۹ را پریل ۱۹۴۰ء کو مسٹر پی
یاراہی۔ وی راما سوامی لیڈر جسٹس پارٹی نے سیلم میں تقریر کرتے ہوئے
کہا کہ "ڈراوڈ قوم نے آریوں سے علیحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ
کرلیا ہے اور انھوں نے حتمی ارادہ یہ بھی کرلیا ہے کہ وہ آریوں کے اثر و
قابو سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائیں گے چاہے اس کے لئے خون کی ندیوں
میں ہو کر گزرنا پڑے۔ وہ اپنے اس مقصد کی طرف ضرور قدم اٹھائیں گے
اسی طرح مرہٹے بھی اپنی ایک علیحدہ مملکت بنانے کے خواہاں ہیں۔ ستمبر
۱۹۴۵ء کو راؤ بہادر سردے۔ سابق وزیر کولہاپور نے وزیر ہند کی خدمت میں
ایک یادداشت روانہ کی جس میں انھوں نے لکھا کہ بمبئی صوبہ متوسط و برار
کے (۳) کروڑ مرہٹے اپنی علیحدہ مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہیں متفقہ

سے "اخبار دی سن ڈے ایڈورڈ" ۱۸ را پریل ۱۹۴۰ء بحوالہ ہندوستان کا نسلی شیوشن کیا ہوتا ہے صفحہ ۱۶۹

خاص نیابت دی جائے[۱] اب تک دراوڑی قوم اور مرہٹوں نے علیحدہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا سلسلہ کہاں تک جاری رہے گا اور ظاہر ہے کہ تقسیم در تقسیم سے ہندوستان نہایت کمزور مملکت ہو جائے گی۔ قوم پرست حضرات کا کہنا ہے کہ ہندوستان ایک جغرافی و معاشی وحدت ہے جس سے کل ہند مستفید ہوتا رہے۔ ہندوستان کے اکثر علاقے خود کفیل نہیں۔ ظاہر ہے کہ مختلف حصوں میں تقسیم سے معاشی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کو زبردست صدمہ پہنچیگا۔ ہندوستان میں نظام بنکاری۔ ٹیپ۔ سکہ۔ ریلوے اور دیگر چیزوں کے ساتھ اس وقت تقریباً ایک ہی قسم کے قوانین پر عمل ہو رہا ہے۔ تقسیم کے بعد جب ہر مملکت اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے اپنی انفرادیت پر زور دے گی تو مشکلات پیدا ہوں گی۔ ہندوستان کے معاشی سیاسی سماجی اور انتظامی امور میں جو ایک ہم آہنگی قائم ہے وہ برقرار نہ رہے گی۔ اگر تقسیم شدہ علاقوں کے تعلقات اچھے نہ رہے تو رقابتوں اور جھگڑوں کی وجہ سے ہندوستان سامراجی دول کا شکار بن جائے گا۔ کانگریس کو اس امر سے سخت اختلاف ہے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کے خیال میں کل ہندوستان کے رہنے والے ایک قوم ہیں۔ گاندھی جی کا بڑا استدلال یہ ہے کہ جب مسلمان آنے سے قبل ہندوستان میں ایک قوم تھی تو باوجود تبدیلی عقیدہ کے اب بھی ایک قوم ہے۔ گاندھی جی کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں گنے چنے مسلمان آئے اور بقیہ سب نے ہندومت سے تبدیلی عقیدہ

---

[۱] بحوالہ اخبار میزان یکم جنوری ۱۹۴۲ء

بناء پر اسلام قبول کیا چنانچہ بیشتر مسلمان اور ہندوؤں کی ایک ہی نسل ہے گاندھی جی کا کہنا کہ محض تبدیلیٔ عقیدہ سے قومیت نہیں بدل جاتی سوئٹزرلینڈ کناڈا، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک کی مثال پیش کی جاتی ہے جہاں لسانی مذہبی اور نسلی اختلافات کے باوجود ایک قومیت موجود ہے۔ چین میں مسلمان بدھ مت اور دیگر فرقے ہیں اور ان سب کو ایک چینی قوم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ روس میں مسلمانوں کے علاوہ کئی فرقے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ روس میں مسلمانوں نے علٰحدہ قوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اعتراض کیا جاتا ہے کہ مذہب کی بناء پر قوم نہیں بنتی۔ ایک بڑا اعتراض جو تقسیم ہند پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس سے ہندوستان کا دفاع کمزور ہوگا۔ ہندوستان کی مدافعت کا انحصار (ہ) شمال مغربی اضلاع پر ہے جب ایک مرتبہ سرحد عبور کرلی جائے تو یہ کلکتہ تک دشمن کو کوئی قدرتی رکاوٹ نہیں ملتی۔ مسلمانوں کو پنجاب کی فتح میں بڑی مشکلات پیش آئیں اور جب انھوں نے پنجاب فتح کرلیا تو بقیہ ہندوستان کی فتح آسان ہوگئی۔ [شلہ] یہ خطرہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے روس جیسی دنیا کی درجہ اول کی قوت بہت قریب ہے۔ یہ خوف ظاہر کیا جاتا ہے کہ روس ہندوستان پر حملہ کردے گا۔ سرحد پر نہ صرف مسلمانوں کے حملہ کا خوف ہے بلکہ "روسی خطرے" کا پروپگنڈہ شروع ہوگا۔ [کلہ] کوپ لینڈ کا خیال ہے کہ ماضی کی طرح مستقبل میں پنجاب پر حملہ ہندوستان پر قبضہ کا پیش خیمہ ہوگا۔ [شلہ]

شلہ پروفیسر گلشن راج۔ سیول اینڈ ملٹری گزٹ ۱۱ راگست ۱۹۴۲ء

کلہ آر کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۹۲۔

شلہ " " " " "

موصوف نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پاکستان کا زبردست خطرہ دفاع میں ہے۔[۱] بغیر ہندو ہندوستان کی امداد کے سرحد کا تحفظ بہت مشکل ہے۔[۲] تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی سرحد کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ آریاؤوں کی آمد اور سکندر اعظم کے حملے کے بعد سے لے کر انگریزوں کی آمد تک ہندوستان سرحدی حملوں کا پے درپے شکار رہا ہے۔ برطانوی عہد میں روسی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے افغانستان سے جو جنگیں ہوئیں ان سے کثیر جانی ومالی نقصانات لاحق ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جب ایران یا نازی پروپگنڈہ شروع ہوا تو ہندوستان کو خطرہ لاحق ہوا جس کی وجہ سے اتحادیوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ دوسری جنگ عظیم نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کی مدافعت کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ ایک تو شمال مشرق میں جہاں چین اور برما سے حملہ ہو سکتا ہے اور دوسرے شمال مغربی سرحد بھی خطرہ میں رہتی ہے۔[۳] اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسلامی ممالک ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوں گے اور اگر بین الاقوامی جنگ چھڑ جائے تو ہندوستان اور پاکستان غیر جانبدار رہیں گے لیکن یہ کوئی ضمانت نہیں کہ غیر جانبدار علاقوں پر حملہ نہیں ہوگا اور وہ جنگ میں شریک ہونے پر مجبور نہیں ہوں گے۔ ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی دو اہم سرحدیں شمال مشرق اور شمال مغرب دونوں مسلمانوں کے قبضہ میں ہوں گی اور مسلمان جب چاہیں

---

[۱] آر کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۹۵

[۲] " " " " " "

[۳] " " " " " " ۹۷

ان کے دروازے دشمن کو ہندوستان پر حملے کے لئے کھول سکتے ہیں شمال مغربی سرحد پر ایک تو روس اور دوسرے اسلامی ممالک کے حملے کا خوف ہے تو شمال مشرق میں آیندہ جاپانی حملے کا خوف ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی دفاع ایک تو کمزور ہوگی دوسرے یہ کہ اس پر مسلمانوں کا اختیار ہوگا۔ دفاع کمزور ہونے سے دشمن ہندوستان اور پاکستان دونوں کو بہت جلد فتح کر سکتا ہے لیکن ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال ہے کہ تقسیم ہند سے دفاع کمزور نہیں ہوگی بلکہ متحدہ ہندوستان ہی دفاع کے اعتبار سے کمزور ہوگا چنانچہ ان کا خیال ہے کہ اگر اسلامی ممالک ہندوستان پر حملہ کردیں تو مسلمان کبھی بھی ان کے خلاف نہیں کھڑے ہوں گے بلکہ حملہ کی صورت میں بیرونی حملہ آوروں سے مل جائیں گے اور اس طرح متحدہ ہندوستان دفاع کے اعتبار سے کمزور ہوگا۔[۲۸] بجائے اس کے موصوف کے خیال میں ہندو ہندوستان، راجپوت، مرہٹہ، اور سکھ جیسی بہادر قوموں کو تربیت دے کر قوی ہو سکتا ہے۔[۲۹] ڈاکٹر امبیڈکر کو خوف ہے کہ متحدہ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری شامل حال نہیں رہے گی اور اس سے ہندوستان کی مملکت کمزور ہو جائے گی۔ چنانچہ ان متضاد بیانات کے بعد اس امر کا پتہ چلانا کہ آیا تقسیم ہند دفاع کے اعتبار سے مستحکم ہوگی یا نہیں بہت مشکل ہے اگر متحدہ ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری شامل حال رہتی تو یقینی ہندوستان کا دفاع مستحکم ہوگا لیکن بصورت دیگر باوجود متحدہ ہندوستان

---

[۲۸] امبیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۶۶

[۲۹] ،، ،، ،، ،،

دفاع کمزور ہو گا۔

ٹرا اعتراض جو تقسیم ہند پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ جس کے لئے یہ دوڑ دھوپ جاری ہے حل نہیں ہوتا۔ اگرچہ کہ حامیان پاکستان کہتے ہیں کہ نظریہ توازن کے تحت مسئلہ کا حل ہو جاتا ہے جو حقوق پاکستان میں ہندو اقلیت کو حاصل ہوں گے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو حاصل رہیں گے اور اقلیتوں کی نسبت دونوں مملکتوں میں معاہدات ہوں گے لیکن اس خطرے کا امکان ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کو ہندوستان پر حملہ کرنا ہو تو یہ حیلہ استعمال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم اقلیتوں کو ستایا جا رہا ہے جس طرح کہ ہٹلر کے ہاتھ میں سوڈیٹن جرمن آلہ کار بنے رہے اور اسی طرح اگر ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنا ہو تو ہندو اقلیتوں کے حیلے سے اقدام کیا جا سکتا ہے۔ اگر ذرا سی غلط فہمی بھی ہو جائے کہ اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا ہے تو جنگ و جدال کا میدان گرم ہو جائے گا اور پاکستان اور ہندوستان کی اقلیتیں پروپگنڈے کا آلہ کار بنائی جائیں گی۔ خود یوروپ کی تاریخ شاہد ہے کہ اقلیتوں کی بابت متعدد مملکتوں میں معاہدات ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ یہ اقلیتیں جنگ کے لئے بطور حیلہ کے استعمال کی گئیں۔

ہندوؤں کو گھبراہٹ یہ ہے کہ پاکستان اسلامی ممالک کے وفاق سے اپنے آپ کو منسلک کر کے طاقتور ہو جائے گا اور ہندوستان دائمی خطرے میں گھر جائے گا۔ ہندوؤں کو جو خطرہ ہے اس کا اندازہ ایک لالہ جی کے اس خط سے ہو سکتا ہے جو کہ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا (جس کا تذکرہ باب ہشتم میں کیا گیا ہے) اور دوسرے ہندو

مہا سبھا کی قرارداد یکم اپریل ۱۹۴۲ء سے ہو سکتا ہے کرپس تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے مہا سبھا نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ ہندوستان ایک سیاسی وحدت ہے جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اگر مسلمانوں کو علیحدہ پاکستان وفاق قائم کرنے کی اجازت دی گئی تو یہ لوگ افغانستان اور دیگر مسلم قوموں سے اتحاد پیدا کر کے ہندوستان کو خطرات میں گھیر دیں گے[۱۵۶]

سپرو کمیٹی نے تقسیم ہند کی اس وجہ سے مخالفت کی[۱۵۷] ہندو اور مسلم آبادی آپس میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ تقسیم کرنا مشکل ہے۔ البتہ پنجاب اور بنگال میں بڑی حد تک آبادی کے گروہ علیحدہ ملتے ہیں پنجاب کے ۲۹ اضلاع میں (۱۱) اضلاع میں غیر مسلمانوں کی اکثریت ہے تو مسلمان (۱۷) اضلاع میں اکثریت میں ہیں۔ مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں غیر مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسٹر جناح کی اسکیم کے تحت پاکستان میں (۴۴) ملین غیر مسلم (جس میں (۴) ملین سکھ شامل ہوں گے) اور ۵۹ ملین مسلمان ہوں گے اور ہندوستان میں ۲۰ ملین مسلمان اور (۱۵۱ ½) ملین ہندو (بشمول پست اقوام) ہوں گے۔ چنانچہ پاکستان قائم ہونے کے بعد بھی ہندو اور مسلم آبادی بالکل علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہندو مسلمان ایک ساتھ پر امن زندگی نہیں بسر کر سکتے۔ بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان بنگالی اور پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان پنجابی ہے۔ آبادی کا (۸۰) فی صد طبقہ جاہل ہے جو زبان کی بنیادوں پر علیحدہ قوم

---

۱۵۶ انڈین اینول رجسٹر جلد اول ۱۹۴۲ء صفحات ۲۹۹ تا ۳۰۱

۱۵۷ سپرو کمیٹی کی آئینی سفارشات صفحات ۱۲۰ تا ۱۲۲

نہیں کہا جا سکتا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسل میں زیادہ فرق نہیں جاٹ فرقے میں ہندو مسلمان اور سکھ تینوں شامل ہیں۔ راجپوتوں میں ہندو اور مسلمان راجپوت ہیں۔ پنجابی مسلمان پنجابی ہندو سے بہت ملتے جلتے ہیں بہ نسبت ان کے ہم مذہب بنگالی بھائیوں کے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کثیر طبقہ جاہل ہے ان کو تمدن سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان کا مسئلہ معاشی ہے۔ اس لحاظ سے زبان اور نسل کے اعتبار سے بھی ہندو اور مسلمان علیحدہ قومیں نہیں۔ (۴۵) ملین غیر مسلم پاکستان میں رہیں گے اور ہندو جو آبادی کا (۷۵) فی صد ہیں پاکستان میں ان کی قومیت ٹوٹ جائے گی اور وہ اقلیت میں رہ جائیں گے۔ مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کی غیر مسلم اکثریت ہندوستان کی سرحد سے قریب ہوگی۔ چنانچہ جھگڑے فساد وغیرہ سے مسئلہ پیچیدہ ہوجائیگا جب متحدہ ہندوستان میں وہ ایک ساتھ نہ رہ سکے تو تقسیم شدہ ہندوستان میں دشمنی اور کشیدگی بڑھ جائے گی۔ ریاست حیدرآباد میں صرف (۱۲ر۸) فی صد مسلمان ہیں اور حکمران مسلمان ہے۔ کشمیر میں غیر مسلم (۲۳ر۶) ہیں جہاں حکمراں غیر مسلم ہے۔ اگر حق خود ارادیت کے اس مفہوم پر عمل کیا جائے تو ہندوستان کی بڑی ریاستوں کو خطرہ لاحق ہوگا۔ پنجاب ہندوؤں کا قدیم ملک ہے اور سکھ تو وہاں کے آخری حکمراں رہے ہیں اور پنجاب ان کا مقدس مقام بھی ہے۔ وڈرو ولسن کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے کہا تھا کہ اگر حق خود ارادیت پر عمل کیا جاتا تو متحدہ امریکہ اور قلمرو کناڈا وجود میں نہ آتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حق خود ارادیت جنگ کے لئے ایک حیلہ اور ہتیار ثابت ہوا۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کو حق علیحدگی دے دیا تو پاکستان کیوں نہیں قبول کیا جاتا۔ اس کا

جواب کمیٹی نے یہ دیا کہ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو جنوبی افریقہ کی یونین ٹوٹ جاتی۔ کناڈا۔ برٹش کناڈا اور فرانسیسی کناڈا میں تقسیم ہو جاتا پنجاب میں سکھ ریاستیں مثلاً پٹیالہ۔ جندہ۔ نابھہ۔ فریدکوٹ۔ کپور تھلہ وغیرہ ہیں۔ جہاں کی آبادی غیر مسلموں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔ جب پنجاب میں مسلمانوں کا حق خود ارادیت تسلیم کیا جاتا ہے تو جن صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں یہ حق کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا۔

تقسیم ہند کی سپرو کمیٹی نے اس وجہ سے بھی مخالفت کی کہ ایک تو اس کے خیال میں باوجود تقسیم کے فرقہ داری اور اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دوسرے معاشی اور مالیاتی اعتبار سے پاکستان کمزور ہوگا اگر ہندوستان کی معاشی ترقی اور معیار زندگی بلند کرنا ہو تو دونوں مملکتوں کے تعلقات اچھے ہونے چاہیں۔ پاکستان دفاع کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا پاکستان اور ہندوستان میں جو معاہدہ ہوگا وہ امن کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اگر پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے تو اس معاہدے پر عمل کون کروائے گا۔ ایسی صورت میں جبکہ ان دو مملکتوں میں جنگ چھڑ جائے کشمیر کی مسلمان آبادی اور حیدرآباد کی ہندو آبادی کا کیا طرز عمل ہوگا جن کے حکمران اپنی رعایا کی اکثریت سے جداگانہ مذہبی عقائد رکھتے ہیں۔ کیا ہندوستان ریاستوں کو اپنی فوج میں غیروں کو بھرتی کرنے کی اجازت ہوگی؟ اگر ایسا ہوگا تو پھر سے اٹھارویں صدی کی تاریخ ہندوستان میں دہرائی جائے گی ایسی صورت میں آزاد ہندوستان اور پاکستان برقرار نہیں رہ سکتے۔ اور بغیر بیرونی فوج کی امداد کے بغیر اپنی مدافعت آپ نہیں کر سکتے۔

پاکستان کا اطلاق ہندوستان کی ریاستوں پر نہیں ہو سکتا جن کا رقبہ

کل ہندوستان کے رقبے کا (۱/۴) ہے اور جن کی آبادی (۹) کروڑ ہے۔ اگر حق خود ارادیت کے حق کا استعمال کیا جائے تو ہندوستان کی بعض بڑی ریاستوں کو زبردست خطرہ لاحق ہوگا۔ جب پاکستان اور ہندوستان میں اقلیتوں کو تحفظات دئے جا سکتے ہیں تو متحدہ ہندوستان میں کیوں نہ دئے جائیں۔ پاکستان سے ہندوستان کی اقلیت کا مسئلہ دنیا کے امن عالم کے لئے باعث خطرہ ثابت ہوگا۔ تقسیم ہند نہ تاریخ اور نہ سیاست کا تقاضہ ہے۔ یہ ملک کے تحفظ اور معاشی ترقی کے منافی ہے۔ پاکستان سے مسئلہ اقلیت اور پیچیدہ ہوجائے گا

"پاکستان کی تائید کیوں کی جاتی ہے؟"

مسلمان اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم تصور کرتے ہیں اور اگر ان کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جائے تو حق خود ارادیت کے مطابق قوم کو اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ سیاسی مفکرین اس خیال کے حامی ہیں کہ ایک فرقے کو بغاوت کرنے کا اور ایک قوم کو شیرازہ بکھیر کر علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ ایک فرقہ کو اپنے حقوق کے تحفظ کا حق اور ایک قوم کو جدا ہوکر اپنی علیحدہ حکومت قائم کرنے کا حق ہے مسلم لیگ کو کانگریس کی ڈھائی سالہ عہدِ وزارت سے سخت شکایت ہے کانگریسی وزارتیں دست بردار ہونے کے بعد مسلمانوں نے "یوم نجات" منایا سر سلطان احمد کا خیال ہے کہ کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کو اس قدر مجبور کردیا کہ وہ پاکستان کی طرف راغب ہوگئے[۵۵] ڈاکٹر اسیڈ کر کا بھی یہی خیال ہے

---

[۵۵] سلطنت متحدہ اور ہندوستان میں ایک معاہدہ صفحہ ۵۔

ڈھائی سالہ عہد وزارت میں کانگریس نے مسلمانوں کو اپنا سخت دشمن بنا لیا[۵۹]
چنانچہ موصوف نے لکھا ہے کہ مسلمان جو گول میز کانفرنس میں سوراج کا مطالبہ
کر رہے تھے آج اس کے مخالف ہو گئے ہیں[۶۰] مسٹر جناح نے ۱۹۴۰ء کے
لیگ کے خطبہ صدارت میں کہا کہ کانگریس کے صوبوں کے بعد ہم کو کئی سبق
حاصل ہوئے۔ اب ہم کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے[۶۱]۔ مسٹر جناح کو یہ خوف ہے کہ
انگریز ہندوستان سے چلے جانے کے بعد جو دستور ساز اسمبلی بنائی جائے گی
اس میں ہندوؤں کی مطلق اکثریت ہوگی اور جو دستور بنایا جائے گا وہ ہندوؤں
کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم (۹) کروڑ مسلمانوں کی قسمت
کا فیصلہ کسی جج کے ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ اس کا فیصلہ خود ہم کو کرنا ہوگا[۶۲]
حامیان پاکستان کا خیال ہے کہ چونکہ ہندو مسلم اتحاد کی ساری کوششیں ناکام
ہو چکی ہیں لہٰذا اس کا واحد علاج تقسیم ہند ہو سکتا ہے۔

تقسیم ہند کی مخالفت میں جتنے مستحکم دلائل پیش کئے جاتے ہیں بکم و
بیش اس کی تائید میں بھی اتنے ہی مستحکم دلائل ملتے ہیں۔ پہلی دلیل یہ پیش
کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ حق خود ارادیت پر مبنی ہے۔ روس نے بھی
اجزاء کو یونین سے علٰحدہ ہونے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ حامیان
پاکستان کا کہنا ہے کہ تقسیم ہند اس طرح سے کوئی غیر اصولی مطالبہ نہیں

---

[۵۹] امیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۵

[۶۰] ” ” ” ۲۵

[۶۱] مسٹر جناح کی چند حالیہ تقاریر و تحریرات صفحہ ۱۲۱

[۶۲] ” ” ” ” ۱۲۲

۲۲ ؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو مراد آباد میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے کہا کہ پاکستان کا اصول کوئی نیا اصول نہیں بلکہ گزشتہ ۲۵ سال سے روس میں اس پر عمل ہو رہا ہے جہاں ہر خود مختار جمہوریت مرکز سے علیحدہ ہونے کا حق رکھتی ہے[۳۲] ڈاکٹر امیڈکر کا خیال ہے کہ متحدہ ہندوستان ایک کمزور اور پُرخطر حکومت ہوگی اس لئے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کی وفاداری بجائے ہندوستان کی حکومت سے ہونے کے اسلامی ممالک سے رہے گی اگر ۹ کروڑ مسلمانوں کی وفاداری حکومت کے ساتھ نہ رہے تو پھر ایسی مملکت یقینی کمزور ہوگی اور اگر متحدہ ہندوستان میں مسلمان قانون شکنی شروع کریں تو بہت مشکل پیش آئے گی۔ اگر مسلمان ہندوستان کو دارالحرب قرار دیں تو ایسی صورت میں وہ نہ صرف جہاد کر سکتے ہیں بلکہ اسلامی ممالک سے امداد طلب کر سکتے ہیں[۳۳] اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے تو ہندوستان کی ساری قوت ختم ہو جائے گی۔[۳۴] اگر مجبوراً سیاسی اتحاد پیدا کیا گیا تو اس کی خرابی یہ ہوگی کہ وہ ایک دشمن اور ایسی باشتوں کا وفاق ہوگا جو ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوں اور جو جھگڑے پر تیسری قوت کو بہ حیثیت ثالث طلب کریں گے۔[۳۵] اگر کوئی مفاہمت ہو بھی جائے تو اس کو قرار رکھنے کے لئے ایک تیسری مسلح قوت کی ضرورت

---

[۳۲] بحوالہ اخبار پیام ۲۲ ؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء

[۳۳] امیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۸۹

[۳۴] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۳۳۵

[۳۵] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

ہو گی۔[۵۶]

اس استدلال کو ثابت کرنے کے لئے کہ متحدہ ہندوستان کمزور مملکت ہو گی تاریخی مثالیں بھی پیش کی جاتی ہیں خصوصاً سلطنت اسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کے زوال کی۔ انیسویں صدی کے نصف اوائل تک سلطنت اسٹریا ایک نہایت وسیع مملکت تھی جس میں کئی قومیں تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ قومیت اور نسومیت کی تحریک نے اس کا شیرازہ بکھر دیا۔ مسٹر نخ نے قومیت کی تحریک کو یورپ میں دبا کر رکھا تھا اس کے باوجود یہ تحریکیں وقتاً فوقتاً انقلابی شکل اختیار کرتی رہیں اور آخر کار سلطنت اسٹریا کو زوال کی منزل پر پہنچا دیا یہی حشر سلطنت عثمانیہ کا مقبوضات کا ہوا۔ ریاست ہائے بلقان میں قومی تحریک کی قوتوں نے سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر دیا۔ حالانکہ سلطنت عثمانیہ نے ان کو کافی مقامی حکومت خود اختیاری عطا کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر امیڈکر نے لکھا ہے کہ سلطنت عثمانیہ نے غیر مسلموں اور غیر ترکی فرقوں کو جو اندرونی آزادی عطا کر رکھی تھی اس کا خواب بھی مغرب کے سیاسی فلسفے میں نہیں دیکھا گیا[۵۷] ترکوں نے اقلیتوں کو بہت کچھ آزادی دے رکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ کہ عربوں اور ترکوں کا ایک مذہب تھا اور عربوں کو کافی سیاسی اور تمدنی آزادی حاصل تھی لیکن عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ قومیت کا احساس اپنے اندر ایک بے پناہ قوت رکھتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے مقبوضات میں مختلف النسل اقوام

---

[۵۶] امیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۲۶

[۵۷] " " " ۲۰۸

مختلف المذاہب لوگ آباد تھے۔ اسی طرح جیکوسلاوکیہ کی ریاست کا
حشر ہوا پہلی جنگ عظیم کے بعد چیک اور سلاواک کو ملا کر ایک ریاست
کو ملا کر ایک ریاست بنائی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ یہ ایک قوم ہیں لیکن چند
سال کے اندر ہی سلاواک نے علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ کر دیا اور علیحدہ
ریاست بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ ہٹلر کی مدد سے انھوں نے
اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا تھا۔ سلطنت ترکی و چیکوسلاوکیہ کے زوال کے
گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نہ مقامی حکومت خود اختیاری اور
نہ مذہب قومیت کے جذبے کو روک سکتا ہے[۶۹] اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے
کہ قومیت کے زور پر مسلمان ہندوستان کی مملکت کا شیرازہ بکھر سکتے ہیں[۷۰]
ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ ہندوستانی مملکت کو خطرے
میں ڈالا جائے ہندو پاکستان قبول کریں تو مناسب ہوگا[۷۱] ہندوستان
بھی کئی اقوام کی وجہ سے سلطنت ترکی کی طرح ایشیا کا مرد بیمار بن جائے گا[۷۲]
اگر مسلمانوں کو ایک دستور قبول کرنے پر مجبور کیا جائے تو کیا ضمانت ہے کہ
دستور ختم نہ ہو جائے گا[۷۳] اگر ہندو مسلم اختلافات کو برداشت کر لیا جائے
تو مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا[۷۴] قومیت کی تحریک نے آج نہ صرف

۶۹ھ امبیڈکر تقسیم ہند صفحہ ۲۰۹
۷۰ھ " " " "
۷۱ھ " " " ۲۱۰
۷۲ھ " " " ۲۱۲
۷۳ھ " " " ۲۸۳
۷۴ھ " " " ۳۳۱

مسلمانوں کو متاثر کر دیا جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی ممالک جن کی آبادی ان سے (ہندوستانی مسلمانوں سے) کم ہونے پر حکمراں ہیں بلکہ مرہٹے اور پست اقوام میں بھی علیحدگی کا جذبہ کارفرما ہے۔ پست اقوام اور مرہٹے بھی اپنے آپ کو علیحدہ قوم تصور کرنے لگے ہیں اور اپنے لئے علاقہ طلب کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سیاسی قوت ہر جماعت۔ ہر فرقہ اور ہر قوم کو بڑی عزیز ہوتی ہے مراعات اور تحفظات سے ان کو بہت کم اطمینان حاصل ہوتا ہے یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ کبھی ہندو اکثریت کو اقتدار تفویض کر کے اپنا جانشین نہیں بنا سکتی اور اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔ اس سے سامراجیت کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ ایک نئے طرز کی سامراجیت پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔[۵۹] اسی وجہ سے آج مختلف فرقے جب تک کہ ان کے مستقبل کا تحفظ نہ ہو جائے ہندوستان کی آزادی کی مہم میں حصہ لینے کو تیار نہیں۔ قوم پرست جو سامراج کے خلاف آزادی کی جد و جہد کر رہے ہیں اقلیتوں کی آزادی اور ان کے حقوق دیانے کے لئے برطانوی سامراج پرستوں کی امداد حاصل نہیں کر سکتے۔[۶۰] پست اقوام کو ہندوؤں پر اعتماد نہیں تھا وہ ہندوؤں کو اپنے موروثی دشمن سمجھتے ہیں پست اقوام کو یہ خوف دامنگیر ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد وہ ہندوؤں کے ظلم و ستم کے شکار ہو جائیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو راج ان کے حقوق کا تحفظ نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو فرقے کل تک اقلیتوں میں شمار ہوتے تھے

---

[۵۹] امیڈکر تقسیم ہند صفحہ V

[۶۰] ،، ،، ،، VII

آج علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی قوت اور اقتدار ہی کے ذریعہ حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے۔

تاریخ میں مسئلہ اقلیت اور اکثریت کے حل کے دو طریقے ملتے ہیں ایک یہ کہ اقلیت کو اکثریت کے مذہب و تمدن میں ضم کر دیا جائے دوسرا طریقہ یہ کہ ان کو علیحدہ علاقہ دے دیا جائے۔ اقلیتیں اور خصوصاً مسلمان ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کرکے تیار نہیں ہیں اس کی ایک واضح مثال ہندوستانی زبان کا مسئلہ ہے۔ ہندو ہندی اور مسلمان اردو کو برقرار رکھنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ یہاں ایثار کا جذبہ نہیں ایسے حالات میں یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی قومیت میں فنا کر دیں گے۔ ہندوستانی قومیت کوئی متحدہ اور ہم جنس لوگوں کی خواہش نہیں جو آزادی کے لئے ایثار کرنا چاہتے ہوں[۲۲]۔

راجہ جی کا فارمولا۔ مسٹر راج گوپال چاری نے ستمبر ۱۹۴۲ء کو اپنا فارمولا[۲۳] تیار کیا۔ اس فارمولے میں شمال مشرقی و مغربی ہندوستان کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کو بھی حق خود ارادیت عطا کیا گیا۔ فارمولا یہ ہے۔

۱۔ کانگریس کے مطالبہ آزادی کو مسلم لیگ تسلیم کرے گی اور عبوری دور کے لئے ایک عارضی حکومت کے قیام میں لیگ کانگریس کا ہاتھ بٹائے گی۔

---

[۲۲] راج گوپال چاری۔ راہ نجات صفحہ ۲۰

[۲۳] بحوالہ سپرو کمیٹی کی آئینی سفارشات ص ۱۲۸

۲۔ جنگ کے بعد ایک کمیشن بٹھایا جائے گا جو شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان کی سرحدوں کا تعین کرے گا۔ اگر ان علاقوں کے بالغ رائے دہندوں کی اکثریت علیحدگی کی تائید کرے تو تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا جائے گا۔ لیکن سرحدی اضلاع کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ان دونوں مملکتوں میں سے کسی ایک سے اپنا الحاق کر لیں۔

۳۔ استشارہ(۱) سے قبل ہر جماعت کو اپنا زاویہ نگاہ پیش کرنے کا حق ہوگا۔

۴۔ تقسیم کی صورت میں دفاع تجارت۔ حمل و نقل اور دیگر مشترک امور کی نسبت معاہدہ ہوگا۔

۵۔ انتقال آبادی بالکل رضامندی پر چھوڑ دی جائے گی۔

۶۔ یہ شرائط اس وقت قابل عمل ہوں گے جبکہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو مکمل ذمہ داری تفویض کر دے۔

مسٹر جناح نے راجہ جی کے فارمولے سے اس وجہ سے اختلاف کیا کہ صوبہ پنجاب و بنگال کے وہ اضلاع جس میں غیر مسلم آباد ہیں پاکستان کے باہر ہو جاتے سکھوں کو یہ اعتراض تھا کہ اس فارمولے کے تحت سکھ پاکستان اور کچھ ہندوستان کے تحت آ جاتے۔ راجہ جی کے فارمولے کے تحت کلکتہ پاکستان سے باہر ہو جاتا تھا۔ بردوان بوربھن۔ بنکورہ۔ مدناپور۔ ہگلی۔ ہوڑہ چوبیس پرگنے اور کلکتہ جس میں (۷۲) فی صد آبادی ہندوؤں کی ہے پاکستان کے

---

(۱) ؟

باہر ہو جاتے ہیں۔ اس فارمولے کے تحت آسام میں صرف سلہٹ پاکستان میں آسکتا ہے اس لئے کہ بقیہ صوبوں میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے راجہ جی کے فارمولے کی مسٹر جناح کے علاوہ خود پنجاب کے ہندو اور سکھ اور بنگال کے ہندوؤں نے مخالفت کی۔

ڈاکٹر امیڈکر نے راجہ جی کے فارمولے پر یہ تنقید[۱۰۰] کی کہ یہ مسئلہ حل نہ تھا بلکہ ایک پھندا تھا۔ جن مشترکہ امور کی نسبت معاہدے کا راجہ جی نے تذکرہ کیا اس پر ڈاکٹر امیڈکر نے یہ اعتراض کیا کہ مشترکہ امور کا تحفظ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کی (۲) صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مرکزی حکومت ایک ہو جس کو مجوزہ امور کی بابت عاملانہ اور قانون سازی کے اختیارات ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان آزاد مملکتیں نہیں ہوں گی۔ دوسری صورت یہ کہ پاکستان اور ہندوستان آزاد مملکتیں ہوں گی اور ان دونوں میں مشترکہ امور کی نسبت معاہدہ ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ معاہدہ پر پابندی ہوگی۔ بہ حیثیت آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان اس معاہدے کو ختم کر سکتا ہے۔ اسی فارمولے کو اساس بنا کر مسٹر گاندھی نے مسٹر جناح سے گفت و شنید کی تھی۔ لیکن مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ راجہ جی نے لاہور رزولیوشن مارچ ۱۹۴۰ء کی شکل و صورت مسخ کر دی ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر جناح اس امر پر رضامند نہیں تھے کہ تقسیم کی نسبت مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلموں کی رائے بھی حاصل کی جائے۔

---

(۱۰۰) امیڈکر تقسیم ہند صفحات ۲۰۹ تا ۲۱۱

(۳)

کرپس کی پیشکش[۱۳۵] - مارچ ۱۹۴۲ء کو سر اسٹافرڈ کرپس ہندوستان تشریف لائے اور ملک معظم کی حکومت کی جانب سے اپنی پیشکش کا اعلان کیا۔ پیشکش یہ تھی جنگ کے فوری اختتام پر ایک منتخب شدہ جماعت کو ہندوستان کا دستور مدون کرنے کا کام سپرد کیا جائے گا۔ دستور ساز اسمبلی میں دیسی ریاستوں کی نمائندگی ہوگی۔ ہندوستان میں ایک یونین قائم کی جائے گی جس میں صوبوں اور ریاستوں کو شریک کیا جائے گا۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کی طرح صوبوں پر وفاق میں شریک ہونے کا لزوم نہیں عاید کیا گیا۔ صوبوں اور ریاستوں کو ہندوستانی یونین میں شریک ہونے اور نہ ہونے کا اختیار ہوگا۔ اگر کوئی صوبہ یونین میں کے قیام کے بعد شریک ہونا چاہئے تو اس کو اس کی اجازت حاصل رہے گی۔ جو صوبے ہندوستان یونین میں شریک ہونا پسند نہ کریں ان کے لئے ملک معظم کی حکومت جدید دستور بنائے گی اور ان کو ہندوستانی یونین کی طرح مساوی درجہ حاصل ہوگا۔ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو معاہدہ ہوگا وہ دستور ساز اسمبلی اور حکومت برطانیہ کے مابین ہوگا۔ معاہدہ ان تمام امور پر مشتمل ہوگا جو حکومت برطانیہ سے ہندوستانیوں کے ہاتھ مکمل ذمہ داری تفویض کرنے کے متعلق ہوگا۔ اس میں مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے تحفظ کی نسبت بھی معاہدہ ہوگا۔ ہندوستان کو اختیار ہوگا کہ برطانوی دولت عامہ کے کسی ممبر سے تعلقات پیدا کرے۔

---

[۱۳۵] انڈین اینول رجسٹر جلد اول ۱۹۴۲ء صفحات ۲۲۰ تا ۲۲۱

دیسی ریاستوں کے ساتھ جو معاہدات ہوئے ہیں ان پر نظر ثانی ہو گی
دستور ساز اسمبلی کی تشکیل حسب ذیل طریقہ پر ہو گی۔ تاوقتیکہ ہندوستان کے
اہم فرقوں کے لیڈر اختتام جنگ سے قبل کوئی متبادل شکل پیش نہ کردیں
اختتام جنگ کے فوری بعد صوبہ واری انتخابات ہوں گے۔ جملہ صوبوں
کے ایوان ہائے زیریں دستور ساز اسمبلی کا انتخاب نیابت تناسب کے
طریقے پر کریں گے۔ دستور ساز اسمبلی اپنے انتخاب کرنے والوں کی
(۱/۱۰) تعداد پر مشتمل ہو گی۔ نمائندوں کے انتخاب میں جو آبادی کا تناسب
صوبوں میں ہو گا اسی تناسب سے نمائندے روانہ کرنے کا حق حاصل
ہو گا۔ جو اختیارات برطانوی ہند کے نمائندوں کو حاصل ہوں گے وہی
ریاستوں کے نمائندوں کو حاصل رہیں گے۔ جب تک جدید دستور کی
تدوین عمل میں نہ آجائے اور جنگ اختتام کو نہ پہنچ جائے ہندوستان
کی نگرانی اور دفاع کی ذمہ داری حکومت برطانیہ کے ہاتھ ہو گی۔ کرپس نے
پریس کانفرنس میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کو
اختیار ہو گا کہ وہ دولت مشترکہ کا رکن رہے یا نہ رہے۔ ہندوستان کو
دنیا کی دیگر اقوام سے معاہدہ کرنے کی اجازت حاصل رہے گی جوں ہی
دستور ساز جماعت دستور مدون کر لے گی حکومت برطانیہ اس ملک کو
چھوڑ دے گی۔ لیکن کرپس کمیشن کو ہندوستان میں ناکامی ہوئی۔ گفت و
شنید جو ٹوٹی وہ محض ہنگامی حکومت کی بابت تھی۔ ہندوستان کو اتنی
آزادی دی جا رہی تھی کہ وہ چاہتے تو حکومت برطانیہ و دولت عامہ
سے اپنے تعلقات منقطع کر سکتا تھا۔ راج گوپال چاری کا خیال ہے کہ
کانگریس نے گفت و شنید کے دوران میں تدبر کا مظاہرہ نہیں کیا۔[۱۵]

ان کا خیال ہے کہ کرپس پیشکش قابل قبول تھی اور اس کو ٹھکرانا ایک زبردست غلطی تھی[1] گفت و شنید جنگ کے دوران میں ہنگامی حکومت کے مسئلہ پر ٹوٹی نہ کہ مستقبل کی تجاویز پر۔ کانگریس چاہتی تھی کہ دوران جنگ ہی میں حکومت کو مکمل اختیارات حاصل ہو جائیں لیکن کرپس نے کہا کہ جنگ کے انتظامات جو حکومت ہند کر رہی ہے ایسی زبردست دستوری تبدیلی سے گڑبڑ ہو جائے گی۔ اور دوسرے اس سے اکثریت کی آمریت قائم ہو جائے گی جس کو اقلیتیں تسلیم نہیں کریں گی۔ وائسرائے ہند نے ۸ ؍ اگست ۱۹۴۰ء کو ملک معظم کی حکومت کی جانب سے جو اعلان کیا تھا اس میں اقلیتوں کے تحفظات کا پورا اطمینان دلایا گیا تھا۔ وائسرائے نے کہا تھا کہ ہندوستان کے دستور میں اقلیتوں کا کافی لحاظ رکھا جائے گا اور ان کے مطالبات وزن رکھیں گے۔ حکومت برطانیہ کسی ایسی حکومت کو اختیارات تفویض کرنا نہیں چاہتی جس سے ہندوستان کے کثیر اور طاقتور عناصر کو اختلاف ہو اور نہ حکومت برطانیہ ان عناصر کو مجبور کرکے حکومت کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اعلان کیا گیا کہ اگر ہندوستانی خود آپس میں مفاہمت کرلیں تو بہتر ہے[2] وائسرائے نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان کو دولت عامہ میں مساوی درجہ دیا جائے گا[3]۔ اس کے چند دن بعد ہی وزیر ہند نے اس پالیسی کی اس طرح وضاحت کی کہ جب اقلیتوں کا دستور مدون کیا گیا تو اس امر کو ملحوظ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۳) [1] راج گوپال چاری۔ وارہنمات صفحہ ۸

[2] " " " "

[3] کوپ لینڈ ہندوستانی سیاسیات جلد دوم صفحہ ۲۴۴

رکھا گیا کہ اگر ملک کی آبادی کا بڑا حصہ دستور پسند نہ کرے تو یہ دستور ان کی رضامندی کے خلاف نافذ نہیں کیا جائے گا جب تو آبادیات کا دستور بنایا گیا تو یہ بات معلوم کر لی گئی تھی کہ دستور کے متعلق لوگ متفق الرائے ہیں یا نہیں [۸۵]

مختلف جماعتوں نے مختلف وجوہ کی بنا پر کرپس تجاویز سے اختلاف کیا کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی قرارداد [۸۶] مارچ ۱۹۴۲ء میں تجاویز سے اختلاف کے وجوہ یہ بیان کئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا وعدہ مستقبل پر رکھا گیا۔ دستور ساز جماعت میں جو ریاستوں کے نمائندے آئیں گے وہ ریاستوں کے عوام کی جانب سے نہیں بلکہ ان کو دیسی فرماں روا نامزد کریں گے۔ ریاستیں آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں۔ صوبوں کو ہندوستان کی یونین سے علحدہ ہونے کا جو حق دیا گیا ہے اس سے ہندوستان کی وحدت پر زد پڑتی ہے۔ کرپس تجاویز میں فرقہ وارانہ مطالبات کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے جس سے سیاسی رجعت پسند لوگ پبلک کو ملک کے فائدے کے خلاف لے جا سکتے ہیں۔ ہندو مہا سبھا نے اپنی قرارداد [۸۷] یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو تجاویز سے اختلاف کرتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان ایک سیاسی وحدت ہے جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ صوبوں کو ہندوستانی وفاق سے علحدہ رہنے کی اجازت سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگا

---

[۸۵] بحوالہ "ہندوستان کا آئندہ کانسٹی ٹیوشن کیا ہونا چاہئے" صفحہ ۲۱۹

[۸۶] انڈین اینول رجسٹر جلد اول ۱۹۴۲ء صفحات ۲۲۴ تا ۲۲۵

[۸۷] ״ ״ ״ ״ ״ ۲۴۹ تا ۲۵۱

علیحدہ پاکستان وفاق کے قیام سے یہ لوگ افغانستان اور دیگر مسلم قوموں سے اتحاد پیدا کرکے ہندوستان کے لئے خطرہ بن جائیں گے۔ ہندوستان ایک "فردیہ ملک ہے"[۲۸] پست اقوام کے نمائندے راؤ بہادر ایم۔ سی راجہ نے ایک پریس کانفرنس میں ۲۲ مارچ/اپریل کو کہا "ان تجاویز کو۔۔۔ اگر ہم قبول کر لیتے تو بلاشبہ ظالموں کے جوئے کے تحت آجاتے اور ہماری قسمت میں ہر وقت کے لئے خون اور آنسو ہوتے"[۲۹] ڈاکٹر امبیڈکر نے کئی مرتبہ اس امر کا اظہار کیا ہے کہ انگریز اس وقت تک ہندوستان نہ چھوڑیں جب تک کہ پست اقوام منظم نہ ہو جائیں ورنہ پست اقوام اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہو جائے گی۔

مسلم لیگ نے یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو اپنی ایک قرارداد[۳۰] کے ذریعہ کرپس تجاویز سے یہ اختلافی وجوہ بیان کئے ہیں۔ صوبوں کو جو علیحدہ رہنے کی اجازت دی گئی ہے وہ بعید از قیاس ہے مسودہ اعلان دستور میں ایک یونین پر زور دیا گیا ہے حالانکہ مسلم لیگ نے تقسیم ہند کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کسی ایسی دستور ساز جماعت میں شریک نہیں ہو سکتی جس کا مقصد ایک یونین کا قیام ہو۔ اس سے ملک میں اختلافات پیدا ہوں گے۔ چنانچہ آج مسٹر جناح ہندوستان کا دستور مدون کرنے کے لئے دو دستور ساز جماعتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ قرارداد میں لیگ نے یہ اعتراض پیش کیا کہ دستور ساز

---

[۲۸] انڈین اینول رجسٹر جلد اول ۱۹۴۲ء صفحات ۲۴۹، ۲۵۱

[۲۹] " " " " ۲۵۶

[۳۰] " " " " ۲۵۱، ۲۵۲

اسمبلی کے انتخاب کے لئے ایوان زیریں کے اراکین نیابت متناسبہ کے ذریعہ انتخاب کا حق عطا کیا گیا تھا جس سے ان کے حقیقی نمائندے منتخب ہوتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی میں مسلمان صرف ۲۵ فی صد رہیں گے یونین میں شرکت کے لئے صوبے کی مجلس مقننہ کے ۶۰ فی صد سے کم اکثریت تائید کرے تو اقلیت کو آبادی کی بالغ رائے دہی طلب کرنے کا حق ہوگا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ مسلم اکثریت کے صوبے مثلاً بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور صوبہ سرحد بھی یونین سے علیحدہ نہیں ہوسکیں گے اس لئے کہ ان صوبوں کی مجالس مقننہ میں اقلیتوں کو کافی پاسنگ حاصل ہے مسلم صوبوں میں لیگ نے کہا کہ مسلمانوں کو اپنا فیصلہ آپ کرنے کا اختیار ہونا چاہئے ورنہ یہ چیز ان کے حق خود ارادیت کے منافی ہوگی۔

کرپس تجاویز پر بڑا اعتراض یہ کیا کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کو تقسیم کرکے ہر وقت کے لئے غلام اور کمزور بنا رکھنے کی زبردست سازش کی گئی ہے۔ کانگریس کا اعتراض تھا کہ صوبوں کو علیحدہ رہنے کی اجازت دینے سے پاکستان کی تائید ہوتی ہے لیگ کو یہ شکایت تھی کہ دستور میں اتنی آئینی تحدیدات عائد کی گئی ہیں کہ صوبوں کا یونین سے علیحدہ ہونا مشکل ہے کانگریس کو ڈر تھا کہ صوبے یونین سے علیحدہ ہو جائیں گے اور لیگ یہ سمجھتی تھی کہ آئینی مشکلات صوبوں کو یونین سے علیحدہ ہونے میں سخت رکاوٹ پیدا کریں گی۔ بہرکیف کمیشن ناکام واپس ہوا۔ گفت و شنید مستقبل کے مسئلہ پر نہیں ٹوٹی اور ظاہر ہے کہ ہندوستان کو خود حکومت برطانیہ سے اگر چاہیں تو رشتہ توڑنے کی اجازت دی جا رہی تھی جس سے

بڑھ کر کوئی اور پیشکش ممکن نہ تھی۔ لیکن اقلیتیں یہ نہیں چاہتیں کہ انگریز اس وقت ہندوستان چھوڑ دیں وہ چاہتے ہیں کہ جب تک وہ منظم نہ ہو جائیں اس وقت تک ہندوستان کو حکومت برطانیہ ہی کے تحت رہنا ہوگا ورنہ ہندو راج قائم ہو جائے گا۔

ویول پیشکش اور شملہ کانفرنس

۲۵ جون ۱۹۴۵ء تا ۱۵ جولائی ۱۹۴۵ء

۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول وائسرائے ہند نے ہندوستان میں ہنگامی حکومت کے قیام کے لئے اپنے اسکیم کا اعلان فرمایا[1] کچھ تو مشرق بعید کی جنگ کا تقاضہ کچھ انگلستان میں ہونے والے انتخابات اور کچھ ہندوستان کی سیاسی فضا نے حکومت برطانیہ کو اس طرف متوجہ کیا۔ ہندوستان کی عاملہ کو زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنانے کی خاطر حکومت برطانیہ نے یہ تصفیہ کیا کہ مرکزی و صوبجاتی مجالس کی سیاسی جماعتوں کے قائدین ایک نمائندہ مجلس عاملہ کی تشکیل کرنے کے لئے وائسرائے ہند سے ملیں۔ مجوزہ کونسل میں تمام فرقوں کی نمائندگی ہوگی جس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی حاصل رہے گی۔ یہ مجلس عاملہ ۱۹۳۵ء کے آئین ہی کے بموجب کام کرے گی لیکن فرق یہ ہوگا کہ یہ مکمل طور پر ہندوستانی ہوگی۔ صرف وائسرائے اور کمانڈر انچیف دو غیر ہندوستانی اراکین ہوں گے۔ محکمہ خارجہ بھی ہندوستانی رکن کے تفویض کیا جائے گا۔ ہندوستان میں دیگر

---

[1] ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جون ۱۹۴۵ء

نوآبادیات کی طرح حکومت برطانیہ کا کمشنر رہے گا۔ جو برطانوی تجارتی مفادات کا تحفظ کرے گا۔ محکمہ خارجہ اور مالیات کو پہلی مرتبہ اس طرح ہندوستانی اراکین کے تفویض کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔ البتہ وائسرائے کا حق تنسیخ کا حق برقرار رہے گا جو صرف شدید ضرورت کے وقت استعمال ہوگا۔
اس عارضی حکومت کے فرائض میں ایک تو جاپان کے خلاف مساعی جنگ کو جاری رکھنا تھا تو دوسرے حکومت ہند کا کام اس وقت تک جاری رکھنا جب تک کہ نئی مستقل آئینی حکومت قائم نہ ہو جائے اور اگر موقع ہو تو آئندہ دستور کی تشکیل پر غور و فکر کرنا۔

اس کے بعد بڑی امیدوں کے ساتھ ہندوستانی قائدین شملہ پہنچے تاکہ وائسرائے سے گفت و شنید کی جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا قیاس تھا کہ ویول کانگریس کی قومی حیثیت کو مان لیں گے اور مسٹر جناح نے یہ سمجھا کہ وائسرائے نے تو کانگریس کو اعلیٰ ذات کی ہندو جماعت تصور کیا ہے اب مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کروانا ہے۔ بجائے اس کے کہ کانگریس اور لیگ اپنی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتیں۔ وہ وائسرائے کو اپنا ہم خیال بنانے کی تگ و دو میں مصروف عمل ہوگئیں۔ مولانا آزاد نے اپنی حیثیت کو مستحکم کرنیکی خاطر قوم پرست مسلم جماعتوں کو بھی طلب کیا۔ کانگریس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مسلم لیگ اس اسکیم سے انکار کردے تو وہ خود اس کو منظور کر کے سیاسی مشن خود چلائے گی جب وائسرائے نے لیگ اور کانگریس کو اپنی اپنی فہرستیں روانہ کرنے کو کہا تو کانگریس نے اپنی فہرست روانہ کردی جس میں مسٹر جناح اور شیاما پرشاد مکرجی کا بھی نام تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے کہا کہ جو (۵) نمائندوں کی

فہرست مسلم لیگ کی جانب سے پیش کی جائے گی اس کے سب ناموں کو منظور کرنا ہوگا۔ کانگریس مسلم کوٹہ میں (۲) نشستیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پنجاب کے گورنر گلانس اور وائسرائے اس کوشش میں تھے کہ مسلم کوٹہ میں ایک یونینسٹ پارٹی کا رکن بھی ہو۔ مسٹر جناح کو اس سے اختلاف تھا۔ کانگریس کو اندیشہ تھا کہ اگر مسلم کوٹہ میں کانگریس کا کوئی مسلمان نہ ہو تو اس کی قومی حیثیت برقرار نہ رہے گی۔ جب وائسرائے نے مسلم اراکین کی فہرست میں یونینسٹ نمائندے کو شامل کیا تو مسٹر جناح نے اس کو رد کر دیا اور اس طرح یہ شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔ مسٹر جناح مسلم کوٹہ میں غیر لیگی اراکین کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یونینسٹ جماعت کو نہ تو کل ہند مسلمانوں کی تائید حاصل ہے اور نہ وہ کل ہند جماعت ہے۔

(۴)

متحدہ ہندوستان کی کیا صورت ہو سکتی ہے

اگر ہندو مسلمان اور دیگر فرقہ جات میں باہمی مفاہمت اور متحدہ زندگی بسر کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کا دستوری مسئلہ حل نہ ہو سکے۔ دنیا کی تقریباً ہر مملکت میں مختلف نسل اور مذہب کے لوگ آباد ہیں اور متحدہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب (۸ - ۹) صدی سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ زندگی بسر کی اور تہذیب و تمدن کا ایک انمول اور مشترک سرمایۂ حیات پیدا کر لیا جس کے اثرات عہد وسطیٰ کے ادب۔ مصوری۔ آرٹ۔ طرز تعمیر و دیگر فنون لطیفہ نیز سماجی رسوم اور زندگی کے کئی اور شعبوں پر گہرا نقوش چھوڑ گئے ہیں تو اب اگر باہمی اتحاد

اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو تقسیم ہند کی ضرورت نہ پیش آئے
ہندوستان برِ اعظم ایشیا کی سیاسی اور معاشی تعمیر میں زبردست حصہ
لے سکتا ہے اور اپنے وسائل کی بناء پر دنیا کی طاقتور مملکت بن سکتا ہے
اور دیگر پسماندہ ممالک کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ روس میں
آج کئی فرقوں کے علاوہ تقریباً (۶) کروڑ مسلمان ہیں لیکن باہمی مفاہمت
کی وجہ سے روس آج دنیا کی درجہ اول کی قوت بن گیا۔ سوئیستان میں
باوجود تین متضاد خیالات اور تاریخی روایات کی قومیں آباد ہیں مثلاً
اطالوی۔ فرانسیسی اور جرمن لیکن سوئیستان کی مملکت میں اس بناء پر آئینی
رکاوٹیں پیدا نہیں ہوئیں۔ اگر فرقہ واری اتحاد پیدا ہو جائے تو ہندوستان
کو برِ اعظم ایشیاء میں ایک بے پناہ قوت حاصل ہو گی۔ فرقہ وارانہ اتحاد
کے لئے اگر حقیقی خواہش موجود ہو اور نیک نیتی کے ساتھ کوشش کی
جائے تو کوئی امر اس راستے میں مانع نہیں ہو سکتا۔ فرقہ واریت کا
بہترین حل یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کے تعلیمی اور معاشی معیار کو
بلند سطح پر لایا جائے۔ پست طبقات کی تعلیم کی اشاعت سے اختلافات
اور بے سروپا غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ سب مختلف فرقوں کا تعلیمی
توازن ایک سطح پر آجائے گا تو رفتہ رفتہ معاشی توازن بھی پیدا ہو سکتا
ہے۔ اگر ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب و ملت ترقی کے مواقع حاصل ہوں تو
سماجی زندگی میں بڑی حد تک اختلاف اور کشیدگی دور ہو سکتی ہے
اور ہمارے معاشی تعلیمی اور سماجی نظام میں موزوں تبدیلیاں عمل میں
لائی جا سکتی ہیں۔ اختلافات زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقوں میں پائے جاتے
ہیں۔ ابھی دیہاتی زیادہ متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ لہٰذا مسئلہ تعلیم یافتہ

طبقے میں صلح و آشتی پیدا کرنے کا ہے۔ اب دو مختلف فرقوں کا تہذیب و تمدن کے تحفظ کا مطالبہ وہ اہمیت کھوتا جا رہا ہے۔ ذرائع آمد و رفت کی زبردست ترقی سے قوموں میں آپس میں ربط و ضبط بڑھتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ایک عالمی تمدن پیدا ہو رہا ہے۔ تمدن میں عالمگیر رجحانات پیدا ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصے میں مقامی تہذیب و تمدن کا مسئلہ اپنی اہمیت کھو دے گا اس لئے کہ ساری دنیا کا ایک مشترک تمدن پیدا ہوگا اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تبدیلیوں کے قوموں کے خصوصی کیرکٹر اور تمدن کے بعض اجزاء جو ہر قوم کے طرہ امتیاز ہوا کرتے ہیں اپنی جگہ ضرور برقرار رہیں گے۔ گزشتہ زمانے میں چونکہ ذرائع آمد و رفت اتنے ترقی یافتہ نہ تھے لہذا قوموں کا ایک دوسرے سے ربط و ضبط زیادہ نہیں تھا اور ایسی حالت میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف تہذیب و تمدن عالم وجود میں آئے۔ لیکن اب تمدن میں ہمہ گیری رجحانات پیدا ہو چکے ہیں اور نہ یہ کسی قوم کے رکائے رک سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان بعض مغرب زدہ اصحاب کی یورپ یا امریکہ کے باشندوں سے تمدنی یا کم از کم ظاہری اعتبار سے مشکل ہی سے تمیز ہو سکتی ہے۔ جب ایسی صورت پیدا ہو تو اقلیتوں کا یہ مطالبہ کہ ان کی تہذیب و تمدن کا تحفظ کیا جائے بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اقلیتوں کے لئے سیاسی اور سیول آزادی کا نہ صرف اعلان ضروری ہے بلکہ ان کو طمانیت دلائی جائے کہ اس پر عمل بھی ہوگا۔ ان کے حقوق اور مفادات کا آئینی تحفظ کیا جائے۔ آزادیٔ مذہب و عقیدہ۔ زبان و تمدن۔ آزادیٔ تعلیم۔ حق اجتماع اور دیگر شہری حقوق میں سب کو مساوی قرار دیا جائے۔ اس امر کا تحفظ کر دیا جائے کہ مقننہ میں کسی فرقے کے مذہبی

معاشی۔ یا سیاسی حیثیت کو متاثر کرنے والے قوانین نافذ نہ ہو۔ ان سارے تحفظات کو مرکزی اور صوبہ واری دساتیر میں نمایاں جگہ دی جائے۔

سب سے اہم مسلہ سیاسی اتحاد کا ہے جس کے بعد ہی کسی دستور کی تشکیل ممکن ہے۔ ہندوستان میں سماجی اور مذہبی اختلافات ایسے نہیں جو اتحاد کی راہ میں مانع ہوں۔ جب صدیوں سے ایک ساتھ زندگی بسر ہو چکی ہے تو کوئی معنی نہیں کہ آئندہ بسر نہ ہو سکے۔ قومی اختلافات ہر ملک میں موجود رہتے ہیں۔ اگر پائیدار بنیادوں پر سیاسی مفاہمت ہو جائے تو مذہبی و سماجی اختلافات کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ سیاسی و مذہبی اختلافات کی چیخ پکار تو محض سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے کی جاتی ہے آج ہندوستان کے ہر فرقے میں حصول اقتدار کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہر فرقے کو سیاسی قوت بہت عزیز ہے۔ نہ ہندو مسلمانوں کی حکومت برداشت کر سکتے ہیں اور نہ مسلمان ہندو راج کے جوئے کے تحت رہنا پسند کریں گے۔ ایک دوسرے سے غلط فہمی اور اختلافات سے زیادہ علٰحدہ زندگی بسر کرنے کا جذبہ کارفرما ہے اگر ہندو مسلم اختلافات نہ بھی ہوتے اور مسلمانوں میں علٰحدگی کا جذبہ اور اپنی علٰحدہ حکومت اور مملکت قائم کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی جیسا کہ اب موجود ہے تب بھی مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہوتا جتنا کہ اب ہے۔ علٰحدہ ہونے کے لئے درحقیقت اختلافات کا حیلہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ جو قوم اس قسم کا علٰحدگی کا جذبہ اپنے اندر رکھے گی اس کو اگر مجبور کر کے کسی مملکت کے قوانین کے تابع کر دیا جائے تو ایسے مجبور باشندوں سے اس مملکت کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ یہ مملکت کے اندر ایک انتشاری عنصر رہے گا اور مملکت سے کسی قیمت پر تعاون نہیں کرے گا۔ وہ موقع پاکر آزاد ہو جائے گا یا کم از کم دوسرے

ممالک کو حملے کی دعوت دے گا۔ ہندوستان کا دستوری مسئلہ اس وقت حل اور قابل قبول ہوسکتا ہے جبکہ اقتدار کسی ایک فرقے کا اجارہ نہ بن جائے اقتدار کا کوئی ایسا نکتہ تلاش کرنا جس میں ہر فرقے کا حصہ ہو اور کسی کو دوسرے پر غلبہ یا فوقیت نہ ہو بہت مشکل ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا حل ہی قابل قبول ہوسکتا ہے ہندوستان کا دستوری مسئلہ انسانی قوت فکر کی زبردست آزمائش ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر ہندوستان کے دستوری مرض کا کیا علاج تجویز کیا جائے۔ پروفیسر کوپ لینڈ کا خیال ہے کہ ہندوستان کا حل پاکستان میں ہے اور نہ وفاق میں بلکہ ان دونوں کے درمیان ہے[۹۲]۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد پروفیسر موصوف نے اپنی ایک علاقہ جاتی اسکیم پیش کی ہے جس میں انھوں نے مرکزیت کو کم کرنے اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے پر زور دیا ہے۔ کوپ لینڈ ہندوستان کو چار حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں[۹۳]

۱۔ دریائے سندھ کا حلقہ (انڈس ری جن)
۲۔ دریائے گنگا کا حلقہ (گینجس ری جن)
۳۔ بنگال کا حلقہ (ڈلٹا ری جن)
۴۔ دکن کا حلقہ (دکن)

دریائے سندھ اور بنگال کے حلقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور بقیہ دو حلقے گنگا اور دکن میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ اس طرح پورے

۹۲؎ آر کوپ لینڈ ہندوستان کا مستقبل جلد سوم صفحہ ۱۹۱

۹۳؎ ،، ،، ،، ،، صفحات ۱۲۳ تا ۱۲۴

ملک میں دو مسلمانوں کے حلقے ہوں گے اور دو ہندوؤں کے۔ پروفیسر
کوپ لینڈ نے اس طریقہ سے اقتدار کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے
دریائے سندھ اور بنگال کے حلقے پاکستان کے مطالبہ کی تکمیل کرتے
ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستان ایک علٰحدہ مرکز کا مطالبہ ہے
لیکن پروفیسر موصوف کی اسکیم میں کل ہندوستان کے لئے ایک ہی مرکز
تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اسکیم میں مسلمانوں کے تقریباً دیگر مطالبات
کی تکمیل ہوتی ہے۔ مرکز کو بہت کم اختیارات حاصل رہیں گے مرکز کے
تفویض امور خارجہ۔ دفاع۔ ٹیرف۔ کرنسی وغیرہ ہوگی۔ اس حلقہ جاتی اسکیم
میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر حلقہ معاشی اور مالیاتی اعتبار سے
خود کفیل رہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ۲-۲ حلقے ہوں گے۔ مسلمانوں کے
۲ حلقوں کا درجہ ہندوؤں کے حلقوں کے مساوی ہوگا۔ اسکیم کے مطالبہ سے
پتہ چلتا ہے کہ اقتدار کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک نہایت ہی دانشمندانہ
کوشش کی گئی ہے۔ البتہ کوپ لینڈ نے دیگر اقلیتوں کے مسائل اور خود
ہندو حلقوں میں مسلم اقلیت اور مسلم حلقوں میں ہندو اقلیت کے مسائل
پر روشنی نہیں ڈالی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ
ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا ہے۔ دیگر فرقوں سے مفاہمت میں کوئی دقت
نہیں۔ بڑا مسئلہ جو اقتدار کا تھا وہ مرکز میں توازن برقرار رکھتے ہوئے حل
کر دیا گیا ہے۔ لیکن کوپ لینڈ کی اسکیم پر ہندوؤں کی جانب سے شدید
اعتراضات عاید کئے گئے۔ سپرو کمیٹی نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اس اسکیم
میں مسلمانوں کے مطالبات کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تاریخ زبان
تمدن وغیرہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ راجپوتانے کو سندھ اور بلوچستان کے

ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ سکھ بھی مسلم علاقہ میں آجاتے ہیں۔ اگر مرکز میں تعطل ہو جائے تو اس کا کیا حل ہوگا؟[۹۵]

کوپ لینڈ کی اسکیم پیش ہونے سے قبل کئی اور اسکیمیں متحدہ ہندوستان کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ سر سکندر حیات خاں نے پنجاب کی مجلس مقننہ میں ۱۱ر مارچ ۱۹۴۱ء کو اپنی اسکیم پیش کی۔[۹۶] وہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سپرد کرنا چاہتے ہیں تاکہ مرکز کو کم سے کم اختیارات حاصل رہیں۔ انھوں نے ہندوستان کو (۷) صوبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔

۱۔ آسام۔ بنگال۔ کی ریاستیں اور سکھ
۲۔ بہار و اڑیسہ
۳۔ صوبہ متحدہ اور اس کی ریاستیں۔
۴۔ مدراس۔ مدراس کی ریاستیں۔ ٹراونکور اور کورگ
۵۔ بمبئی۔ حیدرآباد۔ میسور۔ مغربی ہندوستانی ریاستیں بمبئی و صوبہ متوسط کی ریاستیں۔
۶۔ صوبہ متوسط اور راجپوتانے کی ریاستیں وغیرہ
۷۔ پنجاب۔ سندھ۔ صوبہ سرحد۔ بلوچستان۔ کشمیر۔ بنکانیر اور جیسلمیر۔

ہر حلقے میں مجالس مقننہ ہوں گی۔ دفاع امور خارجہ۔ کروڑ گیری۔ وغیرہ مرکز کے تفویض رہیں۔ مرکز میں ایک وزیر اعظم اور اس کی کابینہ

---

[۹۵] سپرو کمیٹی کی آئینی سفارشات صفحات ۱۵۹ تا ۱۶۱

[۹۶] آر کوپ لینڈ ہندوستانی سیاسیات جلد دوم صفحات ۲۰۲ تا ۲۰۶

ہو گی۔ ضروری ہے کہ مرکز میں کم از کم (⅓) اراکین مسلمان ہوں۔ سر سکندر کا خیال تھا کہ اس طرح متحدہ ہندوستانی وفاقیہ جلد از جلد قلمروی درجہ حاصل کرے گا۔

سنہ ۱۹۳۸ء میں سر عبداللہ ہارون نے ہندوستان کو ۲ وفاقی نظاموں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا۔[۹۶] شمال مغرب اور کشمیر کو ملا کر انھوں نے مسلم وفاق کا خاکہ پیش کیا لیکن حیدر آباد اور بنگال کے مستقبل پر بحث نہیں کی۔

سنہ ۱۹۳۹ء کو نواب سر محمد شاہ نواز خاں نے "ہندوستان کی عہدیت" کے نام سے ایک اسکیم[۹۷] پیش کی۔ وہ ہندوستان کو (۵) صوبوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ (۱) دریائے سندھ کا علاقہ (۲) ہندو ہندوستان۔ (۳) راجستان جس میں وسط ہند کی ریاستیں ہوں گی (۴) دکن کی ریاستیں حیدر آباد اور میسور (۵) بنگال۔ اس اسکیم میں پاکستان کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ ہر حلقہ کا ایک دوسرے سے تعلق برقرار رکھا گیا ہے۔

سر سید سلطان احمد نے بھی اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔[۹۸] ان کا خیال ہے کہ یونین وفاقی اصولوں پر قائم ہونا چاہئے جو مقتدر اور با اختیار مملکتوں پر مبنی ہو۔ صوبوں کی تقسیم از سر نو عمل میں آئے۔ اجزاء کو داخلی امور کی حد تک مکمل اختیارات حاصل ہوں گے۔ مرکز کو دفاع۔ امور خارجہ۔ کرنسی۔ کروڑگیری۔ نشریات۔ ہوائی

---

۹۶ آر کوپ لینڈ ہندوستانی سیاسیات جلد دوم صفحات ۲۰۴ تا ۲۰۶

۹۷ " " " " " ۳۰۲

۹۸ سلطنت متحدہ اور ہندوستان میں ایک معاہدہ صفحات ۹۵ تا ۱۰۲

راستے۔ ریلوے۔ جہاز رانی شپ۔ ٹیلیگراف وغیرہ پر اختیار رہو گا اور اجزاء کو ماباقی اختیارات حاصل ہوں گے۔ فیڈرل اسمبلی کی ترکیب یہ ہوگی مسلمان (۴۰) فی صد ہندو (۴۰) فی صد پست اقوام (۱۰) فی صد اور دیگر اقلیتیں مثلاً ہندوستانی عیسائی۔ سکھ۔ پارسی۔ قبائل۔ اینگلو انڈینس وغیرہ (۱۰) فی صد۔ انھوں نے بالواسطہ انتخابات پر زور دیا۔ ہر حلقہ انتخاب سے (۵۰۰) ہندو اور (۵۰۰) مسلمان نمائندے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ منتخب ہوں۔ اس کے بعد یہ (۱۰۰۰) منتخب شدہ امیدوار مخلوط حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعہ ایک ہندو اور ایک مسلمان رکن کا انتخاب کریں گے۔ اس طرح ہندو اور مسلمان نمائندے ملکر ہندو اور مسلمان اراکین کا مشترکہ طور پر انتخاب کریں گے۔ جو تناسب مجلس مقننہ میں ہوگا وہ کابینہ میں بھی برقرار رہے گا۔ عاملہ مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ ایک وزیر اعظم ہندو ہو تو اس کے بعد وزیر اعظم مسلمان ہونا چاہئے جب وزیر اعظم ہندو ہوگا تو نائب وزیر اعظم مسلمان اور جب وزیر اعظم مسلمان تو نائب وزیر اعظم ہندو ہوگا۔ وزیر دفاع اگر مسلمان ہو تو کمانڈر انچیف غیر مسلم اور اگر وزیر دفاع ہندو ہو تو کمانڈر انچیف مسلمان ہو اگر کبھی فرقے کے وزراء مستعفی ہوں تو کابینہ ٹوٹ جائے گی۔ جو تناسب مقننہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے ملازمتوں اور دیگر حکومت خود اختیاری کے ادارات میں برقرار رہے گا۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کا باقاعدہ اعلان ہو جانا چاہئے۔ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے تحفظات کا جو وعدہ کیا جائے گا اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان پر عمل کیا جائے گا۔ اس کے لئے سر سید سلطان احمد نے لکھا کہ مابہ النزاع مسئلہ یونین کی عدالت یا بین الاقوامی عدالت میں

پیش ہو۔ اگر کوئی قانون کسی اقلیت کو متاثر کرتا ہو اور اقلیت متعلقہ کے (¾)
اراکین اس کی مخالفت کریں تو یہ منظور نہ کیا جائے۔ اگر مقننہ میں سکھوں کے
متعلق کوئی قرارداد پیش کرنی ہو تو وہ صورت مقننہ پنجاب میں پیش ہو سکتی ہے
اور پارسیوں کے لئے صرف صوبہ بمبئی میں پیش ہو سکے گی اگر اقلیتیں چاہیں
تو اجزاء میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب برقرار رکھ سکتی ہیں یا اس طریقہ پر
عمل کر سکتی ہیں جیسا کہ فیڈرل اسمبلی کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اجزاء کی
سرحدوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن کبھی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ
کیا جائے۔ مجلس مقننہ کے لئے جو تناسب اقلیتوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے
کابینہ نیز پبلک ملازمتوں میں اس پر عمل ہو۔

متحدہ ہندوستان کے لئے علامہ مشرقی نے بھی ایک اسکیم پیش
کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندو گورنر ہوں
اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان گورنر ہوں۔ ایک گورنر جنرل ہو۔
ایک مرتبہ جب گورنر جنرل ہندو ہوگا تو دوسری مرتبہ مسلمان گورنر جنرل
بنایا جائے۔ گورنر جنرل کا انتخاب ہندو اور مسلمان مل کر گورنروں میں سے
کریں گے۔ مسلمان گورنر جنرل ہٹنے کے بعد ہندو صوبوں میں سے گورنر جنرل
کے عہدے کے لئے نام پیش ہوں گے۔ اس کا انتخاب ہندو مسلمان مل کر
کریں گے۔ اور ہندو گورنر جنرل کے ہٹنے کے بعد مسلمان گورنروں میں سے
اس عہدے کے لئے نام پیش کئے جائیں گے۔

ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کی جانب سے۔ یم۔ این۔ رائے نے
آزاد ہندوستان کے لئے ایک مسودہ دستور پیش کیا ہے[۹۹] اس کے بموجب

۹۹۔ ہندوستان کے لئے ایک مسودہ دستور از۔ ایم۔ این۔ رائے صفحات ۸ تا ۱۲

اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ مملکت کی بنیاد منظم جمہوریت ہے ہندوستان
ایک وفاقی مملکت ہوگا۔ جس کو فیڈرل یونین آف انڈیا کہا جائے گا۔ صوبے
علیحدہ بھی رہ سکتے ہیں اور ان صوبوں کا ایک علیحدہ وفاق ہوگا۔ فیڈرل
یونین آف انڈیا ان صوبوں سے مشترکہ امور مثلاً کروڑ گیری کرنسی۔ ریلوے
وغیرہ کی نسبت ان صوبوں سے معاہدہ کرے گی جو یونین کے باہر رہیں گے
ہندوستان کی مملکت برطانوی دولت عامہ کی ایک رکن ہوگی۔ اگر وفاق
میں شریک شدہ صوبے چاہیں تو بعد میں وفاق سے علیحدہ بھی ہو سکتے
ہیں۔ وفاقی مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک فیڈرل اسمبلی دوسرے
کونسل آف اسٹیٹ فیڈرل اسمبلی میں ہر پانچ لاکھ آدمیوں میں سے ایک
نمائندہ جائے گا۔ فیڈرل اسمبلی کے اراکین کے انتخاب کے لئے وہ مرد اور
عورت ووٹ دے سکیں گے جن کی عمر (۱۸) سال ہو چکی ہوگی۔ فیڈرل
اسمبلی کی میعاد (۴) سال ہوگی۔ کونسل آف اسٹیٹ میں وفاق میں شریک
ہونے والے صوبوں کی حکومتیں اراکین روانہ کریں گی۔ کونسل آف اسٹیٹ
میں ہر صوبے کے مساوی نیابت ہوگی۔ اس کی میعاد (۵) سال ہوگی
جب ان دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا تو اس کو سپریم پیپلز کونسل
کہا جائے گا۔ صدر عاملہ گورنر جنرل ہوگا جس کی مدت ملازمت (۵) سال
ہوگی وفاقی مقننہ کا منظور شدہ قانون گورنر جنرل کے دستخط کے بعد نافذ
کیا جائے گا۔ وفاقی یونین کی قانون سازی کا اختیار فیڈرل اسمبلی میں ہوگا۔
فیڈرل اسمبلی کو جملہ امور پر قانون سازی کا اختیار ہوگا۔ جو قوانین وفاقی مقننہ
میں منظور ہو جائیں وہ وفاق میں شریک شدہ صوبوں کے لئے قابل قبول
ہوں گے اور ان پر عمل کرنے پر وفاق میں شریک شدہ صوبے مجبور ہوں گے۔

بعض امور ایسے ہوں گے جن کی بابت صوبہ واری مجالس مقننہ کی [illegible]
ضرورت نہ ہوگی۔ مثلاً دفاع۔ خارجی تعلقات۔ خارجی تجارت۔ [illegible]
کرنسی۔ ڈپہ۔ ٹیلگراف۔ ریلوے کا نظم ونسق۔ بندرگاہ اور بحری جہاز رانی۔
فضائی جہاز رانی۔ اگر وفاقی قانون اور صوبہ واری قانون میں تصادم ہو تو
تو اول الذکر کو فوقیت حاصل رہے گی۔ وفاقی یونین کا گورنر جنرل [illegible]
ہوگا۔ گورنر جنرل فیڈرل اسمبلی کے کسی رکن کو وزارت ترتیب دینے کو کہے گا
یہ رکن وزیر اعظم ہوگا۔ وزراء اس وقت تک عہدے پر برقرار رہیں گے
جب تک کہ ان کو سپریم پیپلز کونسل کا اعتماد حاصل رہے۔ وفاقی مقننہ کا
کوئی ایوان بھی وزرا پر عدم اعتماد کی تحریک منظور کرسکتا ہے لیکن حکومت
اس وقت دست بردار ہوگی جبکہ تحریک عدم اعتماد سپریم پیپلز کونسل
منظور نہ کردے۔ وزراء کی ذمہ داری مشترکہ ہوگی۔ صوبوں کو مکمل حکومت
خود اختیاری حاصل ہوگی۔ ہر صوبے کا ایک گورنر ہوگا جس کی میعاد عہدہ
(۵) سال ہوگی۔ صوبوں کی حکومت بڑی حد تک وفاقی حکومت سے ملتی
جلتی رہے گی۔ اگر فیڈرل یونین آف انڈیا میں ۲ یا ۲ سے زائد صوبوں میں
ایسی نزاع پیدا ہو جو سپریم فیڈرل کورٹ کے حیطۂ اختیار سے باہر ہو تو یہ
معاملہ سپریم پیپلز کونسل آف دی یونین میں پیش ہوگا جس کا فیصلہ قطعی
تصور ہوگا۔ اعلان حقوق اور اساسی اصول باب اول دفعہ ۱ میں بیان
کئے گئے ہیں [*]۔ فیڈرل یونین آف انڈیا کے لئے ایک سپریم فیڈرل کورٹ
ہوگا۔

---

[*] ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کے لئے ایک مسودۂ دستور صفحات ۱۱ تا ۱۳

سپرو کمیٹی کی سفارشات ۔ غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ نے جس کا اجلاس ۱۸ ۔ اور ۱۹ ؍ نومبر ۱۹۴۴ء کو دہلی میں منعقد ہوا اپنی ایک قرار داد[۱۲۱] کے ذریعہ سر تیج بہادر سپرو کو ایک کمیٹی کی تشکیل کا مجاز گردانا کہ جو فرقہ واری اور اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ ہندوستان کے دستور کے لئے اپنی تجاویز پیش کرے ۔ مسٹر گاندھی کے مشورے کے مطابق یہ امر طے پایا کہ اس کمیٹی میں کانگریس لیگ ۔ مہا سبھا یا کسی مسلمہ سیاسی جماعت کے رکن نہ ہوں ۔ چنانچہ صدر سر تیج بہادر سپرو نے ۳۰ ؍ ارکین[۱۲۲] کی کمیٹی تشکیل دی اور ان کی سفارشات ڈسمبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہو گئیں ۔ فرقہ وارانہ اور دستوری مسئلہ کو حل کرنے کی نسبت جو سفارشات پیش کی گئی ہیں وہ یہ ہیں[۱۲۳]

دستور ساز جماعت کی تشکیل یہ ہو گی ۔ جملہ ارکین دستور ساز (۱۶۰) ہوں گے ۔۔

خاص مفادات ، کامرس ، صنعت و حرفت ، زمیندار ، جامعات ، لیبر اور خواتین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	(۱۶)
ہندو (بہ استثنائے پست اقوام) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	(۵۱)
مسلمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	(۵۱)
پست اقوام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	(۲۰)

---

۱۲۱ ملاحظہ ہو آئینی تجاویز سپرو کمیٹی صفحہ ۱

۱۲۲ ،، ہو نام ممبران کمیٹی صفحات ۲ تا ۵

۱۲۳ ،، ،، III تا XVI

ہندوستانی عیسائی	(۷)
سکھ	(۸)
پست علاقہ اور قبائل	(۴)
اینگلو انڈینس	(۲)
یوروپینس	(۱)
دیگر	(۱)

کوئی فیصلہ اس وقت تک نہ ہو جب تک کہ (۳/۴) اراکین اس کی تائید نہ کریں۔ جہاں فیصلہ نہ ہو سکے ملک معظم کی حکومت فیصلہ عطا کر سکتی ہے جملہ (۱۶۰) نشستوں میں سے ۱۹ کو نکال دیا جائے جو مخصوص مفادات کی نیابت کرتی ہیں تو بقیہ ۱۴۴ نشستوں میں سے مسلمانوں کو (۵۱) نشستیں (یعنے "۳۸۰۸") فی صدی جائیں حالانکہ برطانوی ہند میں وہ آبادی کا (۲۷) فی صد ہیں۔ جو زائد نشستیں مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں ہندوؤں (بہ استثنائے پست اقوام) کے کوٹہ میں سے لی گئی ہیں دیگر اقلیتیں مثلاً سکھ۔ ہندوستانی عیسائی۔ اینگلو انڈینس۔ یوروپینس وغیرہ کی تعداد کل آبادی کی (۳½) فی صد ہے اور اس لحاظ سے ان کو صرف ۵ نشستیں ملنی چاہئے تھیں لیکن ان کو ۱۹ نشستیں دی گئی ہیں یہاں بھی (۱۴) نشستیں ہندوؤں (بہ استثنائے پست اقوام) سے لی گئی ہیں ہندوؤں کا مسلمانوں کے لئے ایک حلقہ ہائے انتخاب ہو۔ تاکہ قومی اتحاد ترقی کرے مسلمانوں کو اس وقت ہندوؤں کے مساوی نشستیں دی جائیں جبکہ وہ مخلوط انتخابات کے لئے تیار ہو جائیں۔

کمیٹی کی رائے میں ہندوستان کو دو یا دو سے زیادہ آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنا غیر حق بجانب ہے۔ اس سے نہ صرف سارے ملک کا امن

بلکہ ترقی خطرے میں پڑ جائے گی اور اس سے کسی فرقے کو فائدہ نہیں ہوگا ہندوستان کی سیاسی وحدت برقرار رکھنا ضروری ہے۔ دستور میں وقتاً فوقتاً ریاستوں سے شرکت کا انتظام ہونا چاہیئے۔ جو ریاستیں یا صوبے شریک وفاق ہو جائیں ان کو یونین سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہ ہو۔ دستور بنانے کے بعد صوبوں کی لسانی اور تمدنی اعتبار سے از سر نو تقسیم ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی یونین کا ایک صدر ہوگا۔ اس کو تقریباً وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو دنیا کی دوسری مملکوں کے دستوری صدر کو حاصل ہوتے ہیں۔ صدر کی معیاد عہدہ ۵ سال ہوگی اور بالعموم وہ ایک سے زاید مرتبہ منتخب نہ ہوگا۔ اس کے انتخاب کی ۳ متبادل صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ (۱) مجلس مقننہ کے دونوں ایوان مل کر اس کا انتخاب کریں (۲) صدر مملکت کا انتخاب ہندوستانی فرماں روا خود آپس میں سے کریں (۳) یونین کی کابینہ کے مشورے کے بعد ملک معظم اس کا تقرر کریں۔

یونین کی مقننہ صدر مملکت اور دو ایوان یعنی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ پر مشتمل ہوگی۔ اسمبلی کی تشکیل اس طرح ہوگی کہ دس لاکھ کی آبادی کے حساب سے ایک رکن منتخب ہوگا۔ کل تعداد کا دس فی صد مخصوص مفادات کے لئے مختص ہوگا۔ زمیندار۔ کامرس اور صنعت لیبر اور خواتین۔ بقیہ نشستیں ان فرقوں میں تقسیم کی جائیں (۱) ہندو باستثنائے پست اقوام (۲) مسلمان (۳) پست اقوام (۴) سکھ (۵) ہندوستانی عیسائی (۶) اینگلو انڈینس (۷) دیگر فرقے۔

کمیٹی نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ہندوؤں کو باستثنائے پست اقوام اور مسلمانوں کو اس وقت مساوی نشستیں دی جائیں جبکہ مسلمان بجائے

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے لئے رضامند
ہو جائیں حالانکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی میں نمایاں فرق ہے
اگر مسلمان اس تجویز کو قبول نہ کریں تو ہندوؤں کو یہ آزادی حاصل رہیگی
کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کو اپنے مساوی نشستیں لینے سے انکار کردیں بلکہ
"فرقہ وارانہ فیصلہ" پر نظر ثانی کا مطالبہ کریں۔ کمیٹی کی رائے میں قانون
حکومت ہند کی رو سے سکھوں اور پست اقوام کو جو نیابت عطا کی گئی
ہے وہ ناکافی ہے اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ نشستوں کی اس توسیع کو دستور
ساز اسمبلی کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔ مفادات کے نشستوں کے ماسوا
بقیہ نشستوں کے لئے بالغ رائے دہی کا اصول تسلیم کرنا چاہیئے مخصوص
مفادات کے لئے مخصوص حلقہ ہائے انتخاب ہوں گے۔ یونین اسمبلی
کے لئے راست انتخابات ہونے چاہئیں کونسل آف اسٹیٹ کے لئے
دستور ساز جماعت تصفیہ کرے گی۔

تقسیم اختیارات: مرکز کو کم سے کم اختیارات تفویض کئے جائیں۔
مرکزی حکومت کے تحت مشترکہ مفاد کے امور مثلاً امور خارجہ۔ دفاع
ریاستوں کے تعلقات۔ اجزاء کے تعلقات۔ اجزاء کے مابین حمل ونقل
کامرس۔ کروڑگیری۔ کرنسی۔ ٹپہ۔ ٹیلیگراف۔ اجزائی جھگڑے۔ ہندوستان کا
تحفظ۔ اور اس کے معاملات۔ سیاسی و معاشی وحدت کو برقرار رکھنا وغیرہ
جو اختیارات مرکزی اور مشترکہ فہرست میں نہوں وہ اجزاء کو حاصل رہیں گے
اجزاء ایک دوسرے کی اشیاء پر محصل عاید نہیں کریں گے۔ آزاد تجارت
پر عمل کیا جائے گا۔ اگر آزاد تجارت کی وجہ سے کوئی جز خاص طور پر متاثر
ہوتا ہو تو یونین کی آمدنی سے اس کی تلافی کردی جائے گی۔ مرکز کو کمزور

رکھا جائے اور باقی اختیارات صوبوں کو حاصل رہیں۔

یونین کی عاملہ: یونین کی عاملہ میں ان فرقوں کی نیابت ہوگی۔ ہندو بہ استثنائے پست اقوام۔ مسلمان۔ پست اقوام۔ سکھ۔ ہندوستانی عیسائی۔ اینگلو انڈین۔ ان فرقوں کو مقننہ میں جو نیابت عطا کی گئی کم و بیش کابینہ میں بھی اسی تناسب پر عمل کیا جائے گا۔ اگر کوئی فرقہ کابینہ میں شریک ہونے کو تیار نہ ہو تو اس فرقے کے تعاون کے بغیر بھی عاملہ چلائی جاسکتی ہے۔ اگر مقننہ میں اس کو اکثریت حاصل رہے۔ کابینہ مشترکہ طور پر مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ کابینہ کا ایک وزیر اعظم ہوگا۔ جس کی جماعت کو مقننہ میں اکثریت حاصل ہوگی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو دوسری جماعتوں کے اشتراک سے مقننہ میں اکثریت حاصل ہو۔ اس امر کا لحاظ رہے کہ وزیر اعظم کا عہدہ اور نائب وزیر اعظم ایک فرقہ کا اجارہ نہ بن جائے۔ کابینہ کے دیگر اراکین کا تقرر وزیر اعظم کے مشورہ سے ہوگا ان وزراء میں ایک نائب وزیر اعظم ہوگا۔ اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم ایک ہی فرقے کے نہ ہوں۔

ریاستوں کے معاملات کی انجام دہی کے لئے ایک خاص وزیر ہوگا۔ جس کے ۲ مشیر ہوں گے۔ یونین میں ایک سپریم کورٹ ہوگا اور ہر جز میں ایک ہائیکورٹ۔ دفاع کا ایک علحدہ وزیر ہوگا اور یہ مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہوگا۔ فوج کی نگرانی اور نظم و ضبط کمانڈر انچیف کے تفویض ہوگا۔

پبلک ملازمتوں میں نیابت۔ پبلک ملازمتوں کے لئے اس وقت مختلف فرقوں کے لئے جو قواعد مرتب کئے گئے ہیں وہ جدید دستور کی

تدوین تک برقرار رہیں گے۔ اس وقت سکھوں۔ ہندوستانی عیسائیوں
اینگلو انڈینس اور پارسیوں کو ½ ۸ فی صد کا حصہ جو مقرر کردیا گیا ہے اس کو
ہر فرقے کے لئے علیحدہ طور پر اس طرح مختص کردیا جائے۔ سکھ (½ ۳) فی صد
ہندوستانی عیسائی (۳) فی صد۔ اینگلو انڈینس اور پارسی (½ ۱) فی صد
بنیادی حقوق۔ افراد کی آزادی۔ پریس اور حق اجتماع کی آزادی
امتیازات مذہب۔ پیدایش رنگ ذات و عقیدہ ختم ہو جائیں سب کو
مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ عقائد اور مذہبی رسوم و رواج کی
آزادی۔ جملہ فرقوں کی زبان اور تمدن کا تحفظ ہو۔ پست اقوام کی سماجی
رکاوٹیں دور کی جائیں۔

دستور میں مرکز اور ہر صوبے میں آزاد اقلیتوں کا کمیشن مقرر ہو
جس میں ہر فرقے کی نیابت ہو۔ ہر فرقے کے اراکین مقننہ اس کا انتخاب
کریں گے۔ لیکن مقننہ کا کوئی رکن اس کمیشن کا رکن نہیں ہو سکتا۔ اس کی مدت
اتنی ہی ہوگی جتنی کہ مقننہ کی۔ اس کمیشن کے فرائض میں اقلیتوں کے حقوق
کی نگرانی ہوگی۔ دستوری ترمیم کے لئے ضروری ہوگا کہ دونوں ایوان
مقننہ کی (⅔) اکثریت اس کی تائید کرے اور اس کے بعد اس کو اس
وقت تک قبولیت حاصل نہ ہوگی جب تک اجزاء کے (⅔) مقننات
اس کو منظور نہ کردیں۔ اگر معمولی ترمیم ہو تو اس کو یونین کی مقننہ ہی انجام
دے سکتی ہے۔

(۵)

مسئلہ اقلیت کی اصلیت۔ ہندوستان میں مسئلہ اقلیت برطانوی
راج کی پیداوار ہے مسئلہ اقلیت سے مراد فرقہ وارانہ نیابت ہے۔

مجالس مقننہ اور ملازمتوں وغیرہ میں مختلف فرقہ جات کی مناسب اور موزوں نمائندگی جس سے ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ ہو جائے فرقہ وارانہ نیابت سے موسوم ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے علاوہ جتنے مذہبی فرقے ہیں اقلیت میں شمار ہوتے ہیں۔ اور حکومت بھی مذہب کی اساس پر اقلیتوں کا تعین کرتی ہے مغربی ممالک میں اقلیت سے مراد وہ سیاسی جماعتیں ہیں جن کو کسی اور سیاسی جماعت کے مقابلے میں تعدادی کمی حاصل رہتی ہے۔ جس سیاسی جماعت کو تعدادی اکثریت حاصل ہوتی ہے وہ حکومت قائم کرتی ہے اور بقیہ جماعتیں اگر مخلوط وزارتیں تشکیل نہ دی جائیں تو محض مخالف جماعتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ اور جب ان جماعتوں کو اکثریت حاصل ہوتی ہے تو یہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب میں اقلیت سے مراد قومی اقلیت ہوتی ہیں جن کا علیحدہ تمدن۔ زبان۔ نسل وغیرہ ہوتی ہے اور یہ اپنے تمدنی سرمایہ سے محبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کل ملک میں تحلیل کرنا پسند نہیں کرتیں اور جس ملک میں ایسی اقلیت ہوتی ہے وہاں کی حکمراں جماعت سے ان کی تہذیب و تمدن نسل اور زبان جداگانہ ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ کسی آزاد مملکت کے باشندے دوسری آزاد مملکت میں اقلیت میں ہوتے ہیں اور ان کی نسبت دونوں مملکتوں میں معاہدہ ہوتا ہے۔ قومی اقلیتوں کو اکثریت میں تبدیل ہونے کی امید نہیں رہتی چونکہ جمہوریت کے اصول کے تحت اکثریت میں ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھالتی ہے۔ لہذا قومی اقلیتیں دوامی طور پر حکومت کرنے سے محروم رہتی ہیں لیکن ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ اس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے۔

ہر مذہبی فرقہ ملازمتوں اور مراعات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے مقننہ میں موثر نیابت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ مطالبہ ہر فرقہ اپنے وجود اور تحفظ کے لئے کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اکثریت اس کے ساتھ انصاف نہیں کرے گی۔

ہندوستان میں مسئلہ اقلیت کی تاریخ میں ۳ نمایاں دور ملتے ہیں

(۱) انگریزوں کی حکومت کے قیام سے لے کر تقریباً انیسویں صدی کے اواخر تک اس دور میں ہندوستان کے مختلف طبقات و فرقہ جات کا معاشی و تعلیمی توازن بگڑ چکا تھا۔ ان فرقوں کو اپنی پستی کا بہت زیادہ احساس نہیں تھا۔ البتہ مسلمان اس چیز کو محسوس کر رہے تھے۔

(۲) اس دور کا آغاز سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات کے بعد سے شروع ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کے مطالبہ جداگانہ فرقہ واری نیابت کو دستور میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد دیگر اقلیتوں مثلاً پست اقوام۔ پارسی۔ اینگلو انڈینس وغیرہ میں اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ دور تقریباً سنہ ۱۹۴۷ء تک چلتا ہے اس میں اقلیتیں اپنے حقوق کو تسلیم کروانے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے حکومت نیز اکثریت سے بہم کشمکش کرتی ہیں۔ یہ دور نہایت اہم ہے حکومت برطانیہ نے بھی اقلیتوں میں احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندو قومی تحریک میں کافی حصہ لیتے رہے ہیں چنانچہ ان کے اثرات زائل کرنے کے لئے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو ہندوؤں کے خلاف کھڑا کیا گیا اس عہد میں فرقہ وارانہ کشمکش اس لئے شدید تھی کہ اس زمانے میں مختلف اقلیتوں کے پیشہ ور اور سرمایہ دار طبقے عالم وجود میں آ رہے تھے۔ ان کو ہندو منظم پیشہ ور اور سرمایہ دار

طبقات سے مسابقت کرنی پڑتی تھی۔ اپنے ان معاشی حقوق کے
کے تحفظ کی خاطر انھوں نے مذہب کا دامن پکڑا اور مذہب کے نام سے
مطالبات پیش کئے جانے لگے۔ اس لحاظ سے معلوم ہوگا کہ مسئلہ اقلیت
ہندوستان کے مختلف فرقہ جات کے اعلیٰ طبقات مثلاً پیشہ ور جماعتوں
تاجروں اور سرمایہ داروں کی باہمی کشمکش اور مسابقت کا نتیجہ ہے۔ نئے
ابھرتے ہوئے مفادات مذہب کا سہارا تلاش کرتے رہے۔ وہ سب سمجھتے
تھے کہ ایک تو ان کے مفادات کا تحفظ مراعات اور تحفظات کے ذریعہ
سے حکومت کرسکتی ہے۔ دوسرے وہ خود مجالس مقننہ اور نیابتی ادارات
شریک ہوکر اپنے حقوق کا تحفظ کرسکتے ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مفادات
اور فرقہ جات اپنے لئے زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کے لئے دوڑ
دھوپ کرتے رہے۔ فرقہ واری مسائل ہندوستان کی قومیت کی تاریخ میں
زبردست رکاوٹ بنے رہے ہیں اور جس قدر تحریک قومیت شدید ہوتی
گئی اسی شدت سے فرقہ واری مسائل منظر عام پر آنے لگے۔ اس میں کچھ
حکومت کا ہاتھ اور کچھ اکثریت و اقلیتوں کی غلط فہمیاں شامل رہی ہیں۔
کم از کم اکثریت پر یہ الزام ضرور عاید ہوتا ہے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے اعتماد
میں لینے میں سراسر ناکام رہی۔ سنہ ۱۹۰۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات
تک اقلیتوں کی کشمکش برطانوی سامراج سے نہیں بلکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں
کے خلاف رہی۔ اقلیتوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ہندو سرمایہ دار
اور پیشہ ور طبقات سے کشمکش رہی۔ اسی کشمکش نے فرقہ واری رنگ اختیار
کیا اور مذہب کے پس پردہ معاشی مفادات کے تحفظ کی مہم شروع ہوئی۔
(۳) مسئلہ اقلیت کی تاریخ کا تیسرا اہم اور فیصلہ کن دور سنہ ۱۹۳۷ء سے

شروع ہوتا ہے جبکہ تقریباً پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ اعلان ہوا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک علٰحدہ قوم ہیں اس کے بعد ہی پست اقوام اور مرہٹوں نے بھی اپنی علٰحدہ قومیت کا اعلان کر دیا۔ علٰحدہ قومیت کے اعلان میں یہ امر مضمر ہے کہ ایک قوم کو علٰحدگی کا یعنی حق خود ارادیت کا حق حاصل ہے۔ اقلیتوں کو یہ خدشہ کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے گا اور اس نظام حکومت میں ہندوؤں کو تعدادی برتری کی وجہ سے اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ اقلیتوں کو خوف ہے کہ متحدہ ہندوستان میں وہ ہندو سرمایہ داروں کے استحصال کا نشانہ بن جائیں گے۔ اقلیتیں ہندوؤں کو خوف و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کو خوف ہے کہ آزاد ہندوستان میں ان کے مفادات اور حقوق کا کوئی رکھوالا نہیں ہوگا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے پست اقوام نیز مسلمانوں نے کانگریس کی اگسٹ سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں شرکت نہیں کی۔ اقلیتیں آزادی سے پہلے اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ کر لینا چاہتی ہیں کانگریس کا کہنا ہے کہ یہ آپس کا معاملہ ہے جو بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانیوں کو پہلے برطانوی جوئے سے نجات حاصل کرنی چاہئیے لیکن اقلیتوں کا کہنا ہے کہ پہلے تحفظات کے متعلق تصفیہ اور بعد میں آزادی۔ اگر اقلیتوں کو اپنے مستقبل کے متعلق خوف نہیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض اقلیتوں میں علٰحدگی اور اپنی جداگانہ مملکت قائم کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اس تقسیم سے مابقی ہندوستان پر کیا اثر پڑے گا۔ اگر آج ہندوستان کی ساری اقلیتوں کو ہندوستان کے علٰحدہ علٰحدہ ٹکڑے کاٹ کر دیئے جائیں تو ان کو

وہ بخوشی قبول کریں گی۔ سیاسی قوت اور اقتدار ہر جماعت ہر فرقہ اور ہر قوم کو عزیز ہوتا ہے۔ تاریخ عالم حصول اقتدار کی پیہم کشمکش کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ایک قوم اپنے وجود کے لئے دوسری قوم پر فوقیت لیجانا چاہتی ہے ایک فرقہ دوسرے فرقے پر اور ایک جماعت دوسری جماعت پر اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ کشمکش حیات کا مسئلہ ہے جس میں ہر قوم اپنا آزادانہ وجود برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ انسانیت آزادی کی خواہاں ہے۔ معاشی محرکات اور وجود و بقاء کا سوال حصول اقتدار پر مجبور کرتا ہے یہاں چل کر تصادم پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج ہندوستان کی اقلیتیں اسی مسئلہ سے دوچار ہیں۔

برطانوی ہند کے صوبوں میں مختلف فرقوں کی آبادی

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے

"اعداد بہ حساب ہزار"

صوبہ	ہندو بغیر پست اقوام	پست اقوام	مسلمان	عیسائی	سکھ	کل آبادی
پنجاب	۹۳۰۲	۱۲۴۹	۱۶۲۱۷	۵۰۵	۳۷۵۷	۲۸۴۱۹
صوبہ سرحد	۱۸۰	۰	۲۷۸۹	۱۱	۵۸	۳۰۳۸
سندھ	۱۰۳۸	۱۹۲	۳۲۰۸	۲۰	۳۱	۴۵۳۵
صوبہ متحدہ	۳۴۰۹۵	۱۱۷۱۷	۸۴۱۶	۱۶۰	۲۳۲	۵۵۰۲۱
بہار	۲۲۱۷۴	۴۳۴۰	۴۷۱۶	۳۵	۱۳	۳۶۳۴۰
اڑیسہ	۵۵۹۵	۱۲۳۸	۱۴۶	۲۸	۰.۲	۸۷۲۹
بنگال	۱۷۶۸۰	۷۳۷۹	۳۳۰۰۵	۱۶۶	۱۶	۶۰۳۰۷
آسام	۳۵۳۷	۶۷۶	۳۴۴۲	۴۱	۳	۱۰۲۰۵
صوبہ متوسط	۹۸۸۱	۳۰۵۱	۷۸۴	۵۹	۱۵	۱۶۸۱۴
بمبئی	۱۴۷۰۰	۱۸۵۵	۱۹۲۰	۳۷۵	۸	۲۰۸۵۰
مدراس	۳۴۷۳۱	۸۰۶۸	۳۸۹۶	۲۰۴۷	۰.۴	۴۹۳۴۲
جملہ برطانوی ہند	۱۵۰۸۹۰	۳۹۹۲۱	۷۹۳۹۹	۳۴۸۲	۴۱۶۵	۲۹۵۸۰۹

جمعیت وفاقی (برطانوی ہند) کے نمائندے

نام صوبہ	عام نشستیں		سکھ	مسلمان	اینگلو انڈین	یوروپین	ہندوستانی عیسائی	تجارت و صنعت	زمیندار	نمائندگان مزدور	نشستیں برائے مستورات	میزان
	غیر مخصوص	مخصوص برائے اچھوت اقوام										
مدراس	۱۹	۴	۰	۸	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۲	۳۷
بمبئی	۱۴	۲	۰	۶	۱	۱	۱	۳	۱	۲	۲	۳۰
بنگال	۱۰	۳	۰	۱۷	۱	۱	۱	۲	۱	۲	۱	۳۷
صوبہ جات متحدہ	۱۹	۳	۰	۱۲	۱	۱	۱	۰	۱	۱	۱	۳۷
پنجاب	۶	۱	۶	۱۴	۰	۱	۱	۰	۱	۰	۱	۳۰
بہار	۱۶	۲	۰	۹	۰	۱	۱	۰	۱	۱	۱	۳۱
سی پی و برار	۹	۲	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۱	۱	۱	۱۵
آسام	۴	۱	۰	۳	۰	۱	۱	۰	۰	۱	۰	۱۰
صوبہ سرحدی	۱	۰	۰	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۵
اڑیسہ	۴	۱	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۵
سندھ	۱	۰	۰	۳	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۵
برطانوی بلوچستان	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱
دہلی	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲
اجمیر مارواڑہ	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱
کرگ	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱
غیر صوبہ جاتی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۳	۰	۱	۰	۴
مجموعہ	۱۰۵	۱۹	۶	۸۲	۴	۸	۸	۱۱	۷	۱۰	۹	۲۵۰

مجلس مملکت برطانوی ہند کے نمائندے

صوبہ یا فرقہ	عام نشستیں	پست اقوام	سکھ	مسلمان	نسوانی نشستیں	کل جملہ
مدراس	۱۴	۱	۰	۴	۱	۲۰
بمبئی	۱۰	۱	۰	۴	۱	۱۶
بنگال	۸	۱	۰	۱۰	۱	۲۰
صوبہ جات متحدہ	۱۱	۱	۰	۷	۱	۲۰
پنجاب	۳	۰	۴	۸	۱	۱۶
بہار	۱۰	۱	۰	۴	۱	۱۶
سی پی اور برار	۶	۱	۰	۱	۰	۸
آسام	۳	۰	۰	۲	۰	۵
صوبہ سرحدی	۱	۰	۰	۴	۰	۵
اڑیسہ	۴	۰	۰	۱	۰	۵
سندھ	۲	۰	۰	۳	۰	۵
برطانوی بلوچستان	۰	۰	۰	۱	۰	۱
دہلی	۱	۰	۰	۰	۰	۱
اجمیر مارواڑ	۱	۰	۰	۰	۰	۱
کرگ	۱	۰	۰	۰	۰	۱
اینگلو انڈین	۰	۰	۰	۰	۰	۱
یورپین	۰	۰	۰	۰	۰	۷
دیسی عیسائی	۰	۰	۰	۰	۰	۲
	۷۵	۶	۴	۴۹	۶	۱۵۰

صوبجاتی جمعیت ہائے مقننہ

نمبر شمار	نام صوبہ	عام نشستیں		پسماندہ علاقہ جات و اقوام	سکھ	مسلمان	اینگلو انڈین	یورپین	دیسی عیسائی	تجارت، صنعت، معدنیات و زراعت	زمیندار	یونیورسٹی	مزدور	نسوانی نشستیں					میزان
		جملہ عام نشستیں	پسماندہ اقوام											عام نشستیں	سکھ	مسلمان	اینگلو انڈین	دیسی عیسائی	
۱	مدراس	۱۴۶	۳۰	۱	۰	۲۸	۲	۳	۸	۶	۶	۱	۶	۶	۰	۱	۰	۱	۲۱۵
۲	بمبئی	۱۱۴	۱۵	۱	۰	۲۹	۲	۳	۳	۷	۲	۱	۷	۵	۰	۱	۰	۰	۱۷۵
۳	بنگال	۷۸	۳۰	-	۰	۱۱۷	۳	۱۱	۲	۱۹	۵	۲	۸	۲	۰	۲	۱	۰	۲۵۰
۴	صوبجات متحدہ	۱۴۰	۲۰	-	۰	۶۴	۱	۲	۲	۳	۶	۱	۳	۴	۰	۲	۰	۰	۲۲۸
۵	پنجاب	۴۲	۸	۰	۳۱	۸۴	۱	۱	۲	۱	۵	۱	۳	۱	۰	۲	۰	۰	۱۷۵
۶	بہار	۸۶	۱۵	۷	۰	۳۹	۱	۲	۱	۴	۴	۱	۳	۰	۳	۱	۰	۰	۱۵۲
۷	سی پی و برار	۸۴	۲۰	۱	۰	۱۴	۱	۱	۰	۲	۳	۱	۳	۳	۰	۰	۰	۰	۱۱۲
۸	آسام	۴۷	۷	۹	۰	۳۴	۰	۱	۱	۱۱	۰	۰	۳	۱	۰	۰	۰	۰	۱۰۸
۹	صوبہ سرحدی	۹	۰	۰	۳	۳۶	۰	۰	۰	۰	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۵۰
۱۰	اڈیسہ	۴۴	۶	۵	۰	۴	۰	-	۱	۱	۲	۰	۱	۲	۰	۰	۰	۰	۶۰
۱۱	سندھ	۱۸	۰	۰	۰	۳۳	۰	۲	۰	۲	۲	۰	۱	۱	۰	۱	۰	۰	۶۰

صوبجاتی مجالس مقننہ

نام صوبہ	جملہ اراکین	عام نشستیں	مسلمان	یورپین	دیسی عیسائی	[illegible]	[illegible]
مدراس	کم سے کم ۵۴ زیادہ سے زیادہ ۵۶	۳۵	۷	۱	۳	۰	کم سے کم ۸ زیادہ سے زیادہ ۱۰
بمبئی	کم سے کم ۲۹ زیادہ سے زیادہ ۳۰	۲۰	۵	۱	۰	۰	کم سے کم ۳ زیادہ سے زیادہ ۴
بنگال	کم سے کم ۶۳ زیادہ سے زیادہ ۶۵	۱۰	۱۷	۲	۰	۲۷	کم سے کم ۶ زیادہ سے زیادہ ۸
صوبجات متحدہ	کم سے کم ۵۸ زیادہ سے زیادہ ۶۰	۳۴	۱۷	۱	۰	۰	کم سے کم ۶ زیادہ سے زیادہ ۸
بہار	کم سے کم ۲۹ زیادہ سے زیادہ ۳۰	۹	۴	۱	۰	۱۲	کم سے کم ۳ زیادہ سے زیادہ ۴
آسام	کم سے کم ۲۱ زیادہ سے زیادہ ۲۲	۱۰	۶	۲	۰	۰	کم سے کم ۳ زیادہ سے زیادہ ۴

۱ - مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سر سید احمد خاں
مرتبہ جناب مولانا مولوی محمد امام الدین صاحب گجراتی ایڈیشن سنہ ۱۹۰۰ء

۲ - "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از سید طفیل احمد منگلوری بار سوم سنہ ۱۹۴۲ء

۳ - سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

۴ - ہندوستان کا آئندہ کانسٹی ٹیوشن کیا ہونا چاہئے معہ دیباچہ
از مسٹر محمد علی جناح پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ

۵ - تاریخ مسلم لیگ مرتبہ مرزا اختر حسن۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایم
ایل۔ اے ایڈوکیٹ ہائیکورٹ مکتبہ لیگ بمبئی نمبر (۳)

۶ - مجموعہ لکچرز و اسپیچز حصہ اول نواب محسن الملک مہدی علی خاں مرتبہ
ملک فضل الدین شایع شدہ لاہور۔

۷ - رپورٹ کمیٹی ال پارٹیز کانفرنس سنہ ۱۹۲۸ء (ترجمہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

۸ - خطبات گارساں دتاسی۔ (ترجمہ) شایع کردہ انجمن ترقی اردو
اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۵ء

۹ - تاریخ دستور حکومت ہند از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب
شائع کردہ (انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سلسلہ نمبر (۱۰۹)